ہماری ویب ڈیجیٹل بک

اعجاز احمد لودھی

IJAZ AHMAD LODHI

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

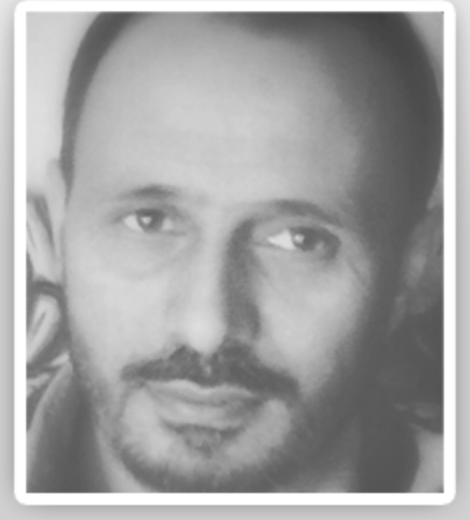

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Ijaz Ahmad Lodhi"
at Hamariweb.com

پاکستان خطرے کی زد میں کیسے ہے؟

پاکستان اور بھارت بظاہر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہمسایہ ممالک، لیکن ایک دوسرے سے بباطن میں لاکھوں میل دور ہیں۔ وجوہات کیا ہیں ، ہر ذی شعور پاکستانی، تجزیہ نگار اور ہر پڑھا لکھا فرد جانتا ہے۔ جس کے دل میں پاکستان سے دلی محبت رچی بسی ہوئی وہ یہ بات جانتا ہے کہ یہود نصاریٰ و ہنود مسلمانوں کے دوست کبھی بھی نہیں ہو سکتے۔ اس بات کا یقین اس لیے ہے کہ یہ اللہ پاک کا حکم ہے بلکہ فیصلہ ہے۔ یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ تاریخ کے ہر ورق میں مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے الفاظ اور جملے ملتے ہیں اور ان جملوں کے تانے بانے کن دماغوں سے ملتے ہیں وہ بھی تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں۔

تمہید اگرچہ اکثریت کو بری لگتی ہے لیکن کیا کیا جائے جب بھی پاکستان میں دہشت گردی ہوتی ہے تو نوے فیصد ایسے واقعات کے سلسلے انڈیا سے جا ملتے ہیں۔ طارق اسماعیل ساگر میرے پسندیدہ لکھاریوں میں سے ایک ہیں۔ انکے ناولوں میں جو کہ شاید حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں، جب کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے تو مختلف واقعات بیان کرتے ہوئے پاکستانی حکومت ایسے بھیانک واقعات میں انڈیا کی شمولیت کے ثبوت باقاعدہ طور پر انڈیا کے مائی باپ امریکہ کو دیتی ہے۔

اقوامِ متحدہ کو پہنچاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ ساگر صاحب بھی اچھی طرح جانتے ہیں ۔ لہٰذا انہیں خاموشی سے ناول کا تتمہ بالخیر کرنا پڑتا ہے۔

ناولوں اور کتابوں کی باتیں تو کاغذوں تک ہی اچھی لگتی ہیں، چاہے مبنی بر حقیقت ہوں۔ بلکہ ایسے ہونے والے واقعہ کے بعد تھوڑی بہت تو تحقیق و تفتیش ہوتی ہے اور اس میں جب یہ ثبوت مل جاتا ہے کہ بیرونی ہاتھ ملوث ہے تو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر صرف یہ بیان جاری کر دیا جاتا ہے کہ اس واقعہ میں بیرونی ہاتھ کے شواہد ملے ہیں۔ تفصیل مزید تحقیقات کے بعد بتائی جائے گی۔ لیکن میری یاد کے کسی نہاں خانے میں بھی یہ بات موجود نہیں ہے کہ بعد میں کبھی تحقیقات ہوئی ہوں یا ہو کر عیاں ہوئی ہوں۔ جو وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انکا دنیاوی آقا جو ان کی جیبیں بھرنے کے لیے امداد دیتا ہے وہ بند کر دے گا۔ جس سے یہ غریب ہو جائیں گے۔ ان کے پاس کھانے کے لیے ایک مخصوص قسم کا برگر اور پینے کے لیے ایک مخصوص قسم کا پانی نہ رہے گا۔ اور جو پاک آرمی تحقیقات کرتی ہے تو اس کو بھی سرخ فیتہ کی نظر کر دیا جاتا ہے۔

خیر یہ تو ایک ثانوی بات آ گئی۔ بات ہو رہی تھی دہشت گردی کی۔ 16 دسمبر 2014 کو پشاور میں ہونے والی دہشت گردی جس میں ظلم و بربریت کی انتہا کی

گئی ۔ چنگیز خان و ہلاکو خان کی روحیں بھی کانپ اٹھی ہوں گی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پاک فوج نے اس دہشت گردی کے پیچھے کارفرما سازش کا منبع تک ڈھونڈ لیا۔ جس کے نتیجے میں پاک فوج کے سربراہ جنرل راحیل شریف اپنے ساتھ آئی ایس آئی کے سربراہ کو ساتھ لے کر افغانستان کے صدر جناب اشرف غنی سے ملنے کابل پہنچ گئے۔ انکے سامنے ثبوت رکھ کر ریڈیو ملال فضل اللہ کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ یہ ثبوت بھی دیا کہ سکول کے بچوں پر فائرنگ کے دوران خارجی ملا دہشت گرد جس شخص سے مسلسل رابطے میں تھے وہ افغانستان میں بھارتی قونصلیٹ کا ایک اونچی حیثیت کا ملازم تھا۔ جس پر اشرف غنی صاحب نے حتیٰ المقدور مدد کا وعدہ کیا۔ بلکہ شاید اگلی ہی رات افغانستان کے جہازوں نے فضل اللہ کے متوقع ٹھکانوں پر فضائیے حملے بھی کیے، جس کے نتیجے میں پاکستان میں ایک خوشگوار افواہ بھی گردش کرتی رہی کہ ملا ریڈیو مار دیا گیا ہے اور اس کو مارنے میں پاکستان کی فضائیہ کا ہاتھ ہے (یاد رہے، میں نے افواہ کا لفظ استعمال کیا ہے)، جو کہ بعد میں جھوٹی ثابت ہوئی۔

ہم نے تو پھر ثبوت پیش کیے اور ان ثبوتوں کو صدر افغانستان نے مانا بھی۔ لیکن اگر اسی طرح کا (ممبئی واقعہ کے علاوہ) کوئی واقعہ انڈیا میں پیش آیا ہوتا تو تو مجھے تو کیا شاید ہر محب وطن پاکستانی یہ کہہ سکتا ہے کہ دہشت گردوں کی لاشیں تو بہت بعد میں گرتیں، انکے حکمرانوں کو صرف یہ اطلاع ملتے

ہی کہ ممبئی، دہلی یا کسی اور شہر کے فلاں سکول میں دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ہے، انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاکستان کا نام لے دینا تھا۔ نہ صرف پاکستان کا نام لینا تھا بلکہ کسی نہ کسی مذہبی تنظیم سے ان دہشت گردوں کے رابطے بھی جوڑ دینے تھے۔ وہ واویلا مچانا تھا کہ دنیا ساری ایک بار تو ان کی بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کر لیتی۔ کیوں کہ میڈیا پر انڈیا والے بھی اس طرح چھائے ہوئے ہیں جیسے شہد کو شہد کی مکھیوں نے ڈھانپا ہوتا ہے۔ کہیں پڑھا تھا کہ اگر آپ کو روشنی کی وجہ سے جو نظر آتا ہے اور آواز کی وجہ سے جو سنائی دیتا ہے، وہ لازمی نہیں کہ حقیقت ہی ہو، بلکہ حقیقت کے پردے میں کچھ اور ہی کہانی ہوتی ہے، جو صرف کفر کرنے والا ہی جانتا ہے۔ یہاں کفر سے مراد حقیقت کو چھپانے کے معنوں میں لیا گیا ہے۔

یقیناً اشرف غنی صاحب نے فوری ایکشن لیا۔ لیکن مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اتنے واضح ثبوتوں کے باوجود ہم عالمی عدالت انصاف میں کیوں نہ گئے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو ہم نے یہ ثبوت کیوں نہیں پیش کیے۔ انڈیا کے مائی باپ اور پاکستانی اونچی اور مغربی سوسائیٹی جس میں بہت سے افراد شامل ہیں، کے آقاؤں کو یہ ثبوت کیوں نہیں دکھائے کہ یہ ہیں تمھارے لاڈلے انڈیا کے کرتوت۔ ساتھ میں یہ بھی کہنا بنتا تھا کہ اب اگر انڈیا ایسے واقعہ میں دوبارہ ملوث پایا گیا تو پھر پاکستان میں دہشت گردی کرنے کے حوالے سے جو انگلی اٹھ کر

نقشہ بنائے گی وہ انگلی جڑ سے کاٹ دی جائے گی بلکہ ممکن ہوا تو وہ ہاتھ ہی کاٹ دیا جائے گا جس کے ساتھ یہ ذلالت بھری انگلی لگی ہو گی۔

انڈین قونصلیٹ کے اس فرد کے ساتھ (نام میں بھول رہا ہوں لیکن الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں کئی بار اسکا نام لیا گیا ہے، بلکہ فوٹو تک دکھایا گیا ہے) افغانستان میں کیا ہوا۔ کچھ بھی نہیں۔ شاید ناپسندیدہ فرد قرار دے کر نکال دیا گیا ہو گا جو کہ شاید ممکن نہیں کیونکہ ہندوستان نے افغانستان کے سیاستدانوں کی اکثریت کے دماغوں پر اپنے پنجے اس طرح گاڑھے ہوئے ہیں کہ انڈیا کی مرضی کے بغیر وہ شاید سانس بھی نہیں لے سکتے۔ دوسرا کام جو کہ ممکنہ صورت بن سکتی ہے کہ راہ کے اس انڈین ایجنٹ، قونصلیٹ کے پردے میں نہاں، کو کہا گیا ہو گا کہ وہ خود ہی آرام سے انڈیا چلا جائے کہ وہ افغانی) یہاں کوئی لڑائی نہیں چاہتے (اور اسکی جگہ دوسرے راکے ایجنٹ کو بھجوا (دیں۔

ہم کیوں ڈرتے ہیں اپنے ہاتھ آئے ہوئے ثبوتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے سے ، ہمیں کس بات کا خوف ہے؟ کیا اس بات کا کہ امریکہ ہماری امداد بند کر دے گا یا دنیا سے ہمارا بائیکاٹ کرا دے گا، یا ہم پر مختلف حیلے بہانوں سے حملہ کر دے گا۔ میرا سوال اس معاملے میں یہ ہے کہ ہمارا مالک، آقا امریکہ ہے یا

ایک خدا۔ اللہ کے حکم کے مطابق جو صرف اس سے ڈرا اس پر نہ کوئی خوف ہو گا نہ وہ کبھی غمگین ہو گا۔ اور جو اللہ کا ہو کر رہ گیا، اس کو پھر دنیا سے کیا ڈر۔ ایک مرتبہ امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو منہ توڑ جواب دیں۔ انکی دی گئی امداد کو ان کے منہ پر ماریں، جو قرضہ ان سے لیا ہوا ہے وہ نہ دیں کہ اس قرضے کے بدلے مہا درجہ زیادہ ان کے مفاد میں جان و مال کی قربانیاں دے چکے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ دنیاوی آقا کہلانے کی بجائے ہمارے سامنے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر نہ کھڑے ہوں۔

جہاں تک بات پاکستان کے بائیکاٹ کی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ پاک نے پاکستان کو ڈھیروں وسائل سے نوازا ہے۔ شرط صرف ان کو عمدہ اور بہترین طریقے سے مثبت انداز میں استعمال کرنے کی ہے۔ ہمارے موجودہ زرِ مبادلہ کے ذخائر دس ارب ڈالر سے کچھ ہی زیادہ ہیں لیکن اگر ہم ریکوڈک کے سونے ذخائر جو کہ اربوں کھربوں روپے کی مالیت کے ہیں، پاکستان کے محب وطن افراد سے ان پر کام کروایا جائے، انکی زمین کی تہوں سے نکال کر زمین کے اوپر استعمال کیے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے زر مبادلہ کے ذخائر کئی گنا نہ بڑھ سکیں۔ آج ہم نے تونسہ بیراج اور بھاشا ڈیم پراجیکٹس صرف اس وجہ سے روک دیے ہیں کہ ان کو بنانے کے لیے اور مکمل طور پر فعال بنانے کے لیے کافی سے زیادہ فنڈ چاہیے، تو جب ذخائر بڑھ جائیں گے تو اس طرح کی مثبت سکیموں کے

لیے فنڈز خود بخود آ جائیں گے۔ تھر کے کوئلہ سے پاکستان میں ایک تحقیق کے مطابق سو سال تک پچاس ہزار میگا واٹ لگاتار بجلی پیدا کی جا سکتی ہے، اور ظاہر ہے جو گیس خارج ہوتی ہے وہ بھی کسی نہ کسی کام تو آ ہی سکتی ہے۔ شمسی توانائی، ہوائی توانائی، پانی کی توانائی سے اللہ پاک نے پاکستان کو وافر مقدار سے نوازا ہے۔ ہم انھیں کیوں استعمال نہیں کرتے۔ کیا میٹرو بس پراجیکٹس اور موٹر وے بنا کر عوام کی بھوک کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ ان کے تن کو ڈھانپا جا سکتا ہے، انہیں شدید سردی کی شدید بارش سے بچایا جا سکتا ہے؟ انکے سر پر چھت مہیا کی جا سکتی ہے؟ ہر گز نہیں۔

سوچنے والوں کو دعوت ہے کہ وہ سوچیں پاکستان خطرے کی زد میں کیسے ہے؟ اندرونی خطرات سے کیسے بچا جا سکتا ہے اور بیرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ پاکستان کو تباہ کرنے کا کوئی موقع نہ تو ہمارے دیرینہ دشمن ہاتھ سے جانے دیتے ہیں اور نہ ہی ہمارے آستین میں چھپے سانپ اپنا زہر پھینکنے سے باز آتے ہیں۔ انکا سدِ باب کیسے ممکن ہے یہ اربابِ اختیار بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور ان سے نمٹنے کی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔ پاکستان پر اللہ کا خاص فضل و کرم ہے، اس لیے مجھے یقین ہے کہ ان ناسوروں سے پاکستان کی جان ان شاء اللہ جلد ہی چھوٹ جائے گی۔

دنیا کے لیے خطرہ؟

یہ خبر چند دن پہلے نظروں سے گزری تھی اور سوچ رہا تھا کہ اس پر کچھ لکھوں گا، لیکن زندگی کی مصروفیات نے اس خبر کو ذہن کے کسی گوشے میں دھکیل دیا۔ آج نیٹ گردی کرتے ہوئے ایٹمی پروگرام کا ذکر نظر سے گزرا تو خیالات کا ایک ہجوم بیکراں ایک ریلے کی صورت میں دماغ میں چل پڑا۔ جب بہت سے خیالات گڈمڈ ہو جائیں تو بہت مضبوط قوتِ ارادی کے مالک افراد ہی ان شوریدہ خیالات میں سے اپنے مطلب کا خیال پاس رکھ لیتے ہیں اور باقی تحت الشعور میں سلا دیتے ہیں۔ اگرچہ میں ان افراد میں شامل تو نہیں لیکن اس وقت یہ قوتِ ارادی مجھے زور زبردستی استعمال کرنی پڑی۔ تا کہ ایک عدد وہ خفیہ راز جس کے بارے میں ساری دنیا جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہتی ہے، عیاں کر دوں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ ہو سکتا ہے دوسروں کی طرح میری آواز بھی صدا بہ صحرا ثابت ہو، لیکن دل کا کیا کریں صاحب۔ اس پہ کس کا زور چلتا ہے۔ ویسے خبر میں جان ہوتی یا خبر بڑی ہوتی تو آج کی تاریخ تک میڈیا اس خبر کو ہر پانچ دس منٹ بعد اچھالے رکھتا اور دور دور کی کوڑیاں لاتا۔ لیکن ایک معمولی خبر کو کون پوچھتا ہے۔

چلیں، کوئی پوچھے نہ پوچھے، ہم ہی پوچھ لیتے ہیں کہ اے خبر تجھے میڈیا میں آنے سے کس نے روکا؟ ایک آدھ بار ہی شائع ہونے کی ہمت تھی تجھ میں کیا؟ کیوں اور کس نے تجھ پر قدغن لگائی؟ ارے ارے۔۔ خبردار جو اشرافیہ کو کچھ کہا۔ سمندر پار والے کم مسلم، زیادہ مسلم کا نام لیا۔ ارے کوئی مائی باپ کو بھی برا کہتا ہے۔ نہ نہ۔ یہ ظلم کبھی نہ کرنا۔ کیا ہوا جو تمھارا تعلق قبضہ گروپ سے۔ ہو تو تم خاص بلکہ خاص الخاص۔ کیونکہ برے گھر کے اندر گھس کر اس محاورے کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ واہ کیا کہنے۔ کیا للکارہ ہے۔ ویسے مجھے تمھارے دوغلے ہونے پر جو آخر میں بونگی ماری ہے، سخت اعتراض ہے۔ اعتراض تو شروع والی باتوں پر ہونا چاہیے تھا لیکن دل تو پاگل ہے، دل تو بچہ ہے۔ اور بچے ہمیشہ الٹی باتوں کی ہی ضد کرتے ہیں۔ اس لیے اتنی چھوٹ تو ہمیں بھی ملنی چاہیے کہ ہم نے بھی دل کی سنی ہے۔

اے خبر! تجھ سے درخواست ہے بلکہ دس بستہ عرض ہے کہ ذرا تصویر سے نکل کر سامنے آ۔ آ بھی جا۔ لیں جی! خبر نے میری سن لی اور سامنے آ گئی آخر۔ ارے یہ کیا۔ یہ تو واقعی معمولی سی خبر ہے۔ ہائے رے۔ اللہ کے بندے تیرا کیا ہو گا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ دل کی بجائے دماغ کی سنا کریں۔ اور ہم کہ ٹھہرے ان باتوں سے اجنبی۔ چلیں جی کوئی بات نہیں۔ اب جب نکل ہی آئی ہے بلی تھیلے سے باہر تو اس بلی کے خدوخال سے آپ کی بھی واقفیت کراتے ہیں۔

خبر کے مطابق اسرائیل کے وزیر اعظم نیتن یاہو نے اپنے امریکہ کے دورے کے دوران امریکی کانگریس کے دونوں ایوانوں سے خطاب کیا۔ فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہوگا یا نہیں، یہ تو سننے والے ہی بتا سکتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کے خطاب میں جان تھی، تو صرف اسرائیل کے لیے تھی۔ان کے خطاب میں جان تھی جو لینی تھی اور لینی بھی ایران کی جان تھی۔ یاہو نے کہا کہ ایران دنیا کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے اور خاص طور پر یہ خطرہ اس وقت مزید بڑھ سکتا ہے جب امریکہ اور ایران کا جوہری معاہدہ ہو جائے گا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں ایران کو گویا کھلی چھٹی مل جائے گی کہ وہ بین الاقوامی مارکیٹ سے جوہری ہتھیاروں کے سلسلے میں اپنی مرضی سے خریداری کر سکے۔ اسرائیل کے لیے ایران جو پہلے ہی خطرہ بنا ہوا ہے، قابو سے باہر ہو جائے گا۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

جب اسرائیل، امریکہ، بھارت اس قسم کی بات کرتے ہیں تو دو کام کرنے کو دل بہت کرتا ہے۔ ایک تو جی چاہتا ہے کہ اپنے سر کے بال نوچ ڈالوں اور یا پھر قہقہے لگا کر پوری محفل کو کشتِ زعفران بنا دوں۔ نیتن یاہو نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ امریکہ نے اسرائیل کے میزائیل دفاعی نظام آئرن ڈوم کی تیاری

میں جو تعاون کیا ہے، پھر جو امریکہ نے فوجی امداد دی ہے۔ نجی محافل میں میں اور سرعام اسرائیل کی حمایت کی ہے، اس پر وہ ذاتی طور پر اور حکومت کی طرف سے بھی بہت مشکور ہیں۔ اور ان کے اس کردار کو سراہتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں دایاں دکھا کر بایاں مارنا۔ یعنی جب امریکہ ایران کی امداد کر رہا ہے تو مجرم۔ اور اسرائیل کی حمایت کرے تو شاباش۔ واہ رے تیرے کیا کہنے۔

ایک سوال اٹھتا ہے کہ ایران کی جوہری طاقت بننے سے وہ دنیا کے لیے خطرہ کیسے بن سکتا ہے؟ ہاں اگر دنیا صرف امریکہ، اسرائیل کی حد تک ہے تو پھر تو کہہ سکتے ہیں۔ ویسے بھی ایران تو اپنے دفاع کے لیے یہ صلاحیت حاصل کر رہا ہے۔ اگر امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، چین اور سب سے بڑھ کر عالمی دہشت گرد اور امریکہ کی ناجائز اولاد اسرائیل یہ حق رکھتا ہے، جس کا کام ہی اپنے ہمسایہ ممالک میں دہشت گردی کرنا اور دور کے ممالک میں بلاواسطہ کرانا ہے، تو ایران سمیت بہت سے ممالک کا یہ لازمی حق ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لیے یہ صلاحیت حاصل کریں۔ کم از کم اس سے یہ تو ہو گا کہ کوئی اس ملک کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔ اسکی ایک مثال پاکستان ہے۔ ۱۹۹۸ء میں جب انڈیا نے ایٹمی دھماکے کیے تھے اور اس کے بعد اس نے اپنی فوج بھی پاکستانی سرحد پر کھڑی کر دی تھی، اور دھمکیوں پر دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں اور ایسں الگ رہا تھا کہ کہ انڈیا بزعم خود پاکستان کو بس پل بھر میں ہڑپ کر دے گا۔ لیکن

جب پاکستان نے جوابی ایٹمی دھماکے کیے تو انڈیا کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا کہ اب چونکہ وہ بلی کو نہیں دیکھ رہا تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ تو ایٹمی صلاحیت اپنے دفاع کے لیے ضروری ہے۔

امریکہ جو ہر اس ملک کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتا ہے جہاں جہاں اسکا سفارت خانہ ہے یا قونصلیٹ ہے۔ یہ سفارت خانے کم اور سازشوں کے اڈے زیادہ ہیں یا پھر جس جس ملک میں اس ملک کے باسی غدار ہیں اور امریکہ کا دم بھرتے ہیں، وہیں پر امریکہ کی ایک ٹانگ لازمی ہوتی ہے۔ افغانستان کے طالبان سے اسے کیا خطرہ تھا؟ صرف یہی نا کہ کہیں اسلام کی سچی اور کھری تعلیمات پھیلتے پھیلتے کہیں امریکہ تک نہ پہنچ جائیں۔ امریکہ نے اپنے حامی دہشت گردوں کی ٹیم نیٹو کے ساتھ مل ۱۸۰۷۷ کر افغانستان پر میزائلوں اور بموں کی بارش کر دی۔ طالبان کو اپنی طرف سے ختم کرنا چاہا لیکن وہ آج بھی اس کانٹے کی طرح امریکہ کے گلے میں پھنسے ہوئے ہیں جس کو نہ اگلا جا سکتا ہے نہ نگلا جا سکتا ہے۔ مشرقی تیمور میں امریکہ بہادر نے مداخلت کرکے اسے آزاد کروایا گویا وہاں کے عوام کو انکا حق دیا۔ اسکا وہاں کیا کام تھا؟ وہ تو انڈونیشیا کا اندرونی معاملہ تھا۔ اردن، شام، عراق، لیبیا وغیرہ میں داعش، نائجیریا میں بوکو حرام کو پیدا کرکے وہاں کے عوام کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہاں کے حکمرانوں کے تختے الٹ دیے۔

روس نے دس سال افغانستان میں جنگ لڑی۔ نتیجے میں یہاں سے بری طرح شکست کھا کر بھاگا۔ اور سونے پہ سہاگہ والی بات کہ اس شکست کے نتیجے میں اتنا کمزور ہوا کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ لیکن کتے کی دم سو سال بھی کسی لوہے کے پائپ میں رکھو تو وہ ٹیڑی کی ٹیڑی ہی رہتی ہے۔ روس کی لالچی طبیعت پھر جاگی ہے۔ اب پھر اس نے دوبارہ سے ان ممالک پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ اور اس سلسلے کا آغاز اس نے یوکرائن سے کیا ہے۔ جہاں جہاں امریکہ مداخلت کرتا ہے وہاں روس بلاواسطہ یا بالواسطہ گھس جاتا ہے کہ امریکہ کے پاؤں نہ جمنے دے۔ لیکن ہنوز دلی دور است۔ عالمی دہشت گرد اسرائیل نے فلسطین کی پاک زمین پر ناجائز قبضہ جمایا ہوا ہے۔ مزید کی ہوس نے اس کو اس حد تک بے چین کر دیا ہے کہ اپنے علاوہ ہر ملک اس کو دہشت گرد اور دنیا کے لیے خطرناک نظر آتا ہے۔ جیسے اس جیسا شریف ملک پوری دنیا میں کوئی نہیں۔ کیا کہنے اسکے۔۔۔ دوسرے ممالک کے سمندری حدود سے گزرنے والے بحری بیڑوں پر قبضہ کرنا، فضا میں اڑتے جہازوں کو مار گرانا اسکی شرافت کا بین الاقوامی ثبوت ہے اور یہ اسکی سرشت میں شامل ہے۔ کمال ہے۔ یعنی دنیا کے لیے خطرہ ایران ہے۔ امریکہ اسرائیل، روس اور بھارت نہیں۔

ذاتیات میں مداخلت

شروع اللہ کے پاک نام سے جو دلوں کے بھید بہتر جانتا ہے۔ دیکھتی آنکھوں، پڑھتی زبانوں، آپ کو ابن نیاز کا سلام پہنچے۔

پچھلے چند دنوں میں چند باتیں ایسی ہوئیں کہ مجھے لگا کہ آپ کے ساتھ شیئر کروں۔ پتہ نہیں میں صحیح ہوں یا نہیں لیکن دل نے چاہا کہ آپ سے بھی رائے لے لوں۔

لوگ پتہ نہیں کسی کی ذاتیات میں کیوں دخل اندازی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اور نہ صرف حق سمجھتے ہیں بلکہ آپ سے یوں بات کرتے ہیں جیسے اگر انھوں نے یہ بات نہ کی تو معلوم نہیں کتنا نقصان ہو جائے گا۔ چلیں یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ آپ نے کسی سے اپنی ذات کے بارے میں بات کی، یا اس سے کسی ذاتی مسلے پر بحث کی، اور انھوں نے تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا، اور آپ پچھتانے لگے کہ آخر آپ نے چھیڑی تو کیوں یہ بات چھیڑی۔ لیکن یہاں تو گنگا ہی الٹی بہتی ہے۔

ہوا کچھ یوں کہ میں نے اپنے لیے کپڑوں کا ایک جوڑا سلوایا۔ اسکا ہلکا بادامی رنگ مردوں کے لیے تھوڑا یونیک سا تھا کہ کم از کم شہر کے لوگ شاید اس طرح کا رنگ نہ پہنتے ہوں۔ کپڑے تو کپڑے ہوتے ہیں، اوپر سے میری عادت نہیں اپنے آپ کو ٹیپ ٹاپ رکھنے کی۔ بس جو ملا پہن لیا، اتنا ضرور خیال رہتا ہے کہ استری ہوں اور کہیں سے پھٹے ہوئے نہ ہوں کیونکہ آفس کا بھی تھوڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ لوگوں کی پروا میں نے کم از کم اپنی اس طرح کے ذاتی معاملات میں کبھی نہیں کی۔ اگر کسی نے کہا کہ یہ سوٹ آپ پر اچھا نہیں لگتا تو میری بلا سے نہ لگے۔ یہ جوتے ٹھیک نہیں تو نہ سہی۔ مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔ تو ہوا یوں کہ وہ لباس جو کہ شلوار قمیض پر مشتمل تھا، میں پہن کر آفس چلا گیا۔ سب سے پہلے تو صدر دروازے پر کھڑے دربان نے کچھ اس طرح دیکھا کہ میں اپنے آپ کو دیکھنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں کپڑے پر کوئی داغ وغیرہ تو نہیں لگ گیا یا کہیں سے پھٹ تو نہیں گیا۔ لیکن ایسی کوئی بات مجھے نظر نہ آئی۔ خیر انکی نظروں کو نظرانداز کر کے آفس اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سب سے پہلے اپنے ہی سیکشن کے کولیگ نے خوبصورت الفاظ سے نوازا۔ واہ! کیا یونیک رنگ پہنا ہوا ہے۔ اچھا جی۔ چلیں آپ نے کہا ہم نے مان لیا، ورنہ تو ایسی کوئی بات نہیں۔ پھر ایک آفس اٹنڈنٹ کا پاس سے گزر ہوا تو کہنے لگا ارے سر؟ کیا کسی زردے کی دیگ سے نکل کر آ رہے ہیں؟ ہیں۔ یہ کیا؟ خیر میں نے اسکی بات کو سنی ان سنی کر دیا۔ تھوڑی دیر گزری تو ایک آفیسر صاحب گویا

ہوئے۔پیٹا جی ! اگر آپ کے ہاتھ میں ایک عدد گن دے کر آپ کو گیٹ پر گارڈ کی جگہ کھڑا کر دیا جائے تو کوئی نہیں کہے گا کہ آپ گارڈ نہیں ہو۔ میں مسکرا دیا۔ دو تین گھنٹے اور گزر گئے۔ لنچ کا وقت ہوا۔ ہوٹل پر بیٹھے کھانا کھا رہا تھا کہ دو اور آفس کے ساتھی بھی وہاں آئے۔ مجھے دیکھا تو اسی ٹیبل پر ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ اب یہ نہیں دیکھا کہ کھلی جگہ ہے۔ دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہیں۔ کہنے لگے۔ آج خیریت تو ہے نہ لگتا ہے کہ کسی پنڈ کی کسی خاتون سے کپڑے سلوائے ہیں یا پنڈ کی کسی لڑکی نے گفٹ دیے ہیں۔ حسب عادت مسکرا کر چپ کر گیا۔ جب کہ ارد گرد موجود دوسرے لوگ بھی مجھے گھور کر دیکھنے لگے۔ ایک سے تو رہا نہ گیا، جھٹ سے کہا کہ واقعی کیا ایسے کپڑے مردوں کو اچھے لگتے ہیں۔ قارئین یہ بتا دوں کہ اس رنگ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو صرف عورتوں کے لیے ہوتی۔ جسطرح بادام کا اوپر والا چھلکا ہوتا ہے وہ کلر تھا۔ بس تھوڑا سا تیز تھا۔
اس شخص کی بات سن کر بھی میں نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ جتنا آپ لوگوں کے ایسے تبصروں کے جوابات دیں گے یا ایسی باتوں سے چڑیں گے وہ مزید آپ کو تنگ کریں گے، اور کوشش کریں گے کہ آپ کو اس حد تک لے جائیں جہاں آپ آپے سے باہر ہو جائے، اگرچہ یہ غیر اختیاری طور پر ہو گا لیکن ہوتا ہے۔
دوسری بات جو ہوئی وہ سر کے بالوں کے حوالے سے ہے۔ سر کے بال ویسے تو ہیں ہی کم کم۔ بقول انکل سرگم، آدھا گنجا آدھا بالم۔ تو جو تھے وہ کچھ زیادہ

بڑھ گئے تھے۔ گرمی کے موسم میں باقیوں کا تو پتہ نہیں لیکن میں ضرور تنگ ہوتا ہوں تو اکثر چھوٹے کرالیتا ہوں۔ اس بار معلوم نہیں کیا موڈ بنا کہ آرمی کٹ کروا لی۔ اوپر سے بال بھی چھوٹے کروالیے۔ اتنے چھوٹے کہ کنگھی کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہ تراش خراش ویک اینڈ پر کرائی۔ سوموار کے دن جب آفس آیا تو سلام نہ دعا، ارے صاحب یہ کس نائی کے سامنے بیٹھ گئے تھے یا خود ہی مشق کی ہے۔ اب کوئی بتائے کہ بتاؤں کیا؟ ایک دوسرے نے دیکھا۔ ارے یہ کیا، سر کے بال کدھر گئے؟ ایک اور کی باری آئی۔ سر جی، اگر بال اسی طرح ہی کٹوانے تھے تو مجھے کہہ دیتے۔ میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ شاید ان میں سے کوئی بھی اپنے بال نہ کٹواتا ہو، خود ہی کٹ کٹ کر گرتے ہوں گے۔ کبھی کسی نے اپنا سر صفاچٹ نہ کروایا ہوگا۔ کسی نے بھی کبھی بال چھوٹے نہ کروائے ہوں گے۔

ایک مشہور شوز کی فرنچائز سے جوتے خریدے۔ جس نے دیکھا تو جھٹ سے بولا سر جی، صاحب جی، جس لنڈے سے یہ جوتے خریدے ہیں ہمارے لیے بھی لے آئیں۔ یہ بات سن کر تو میرے قہقہے ہی نکل گئے کہ زندگی میں پہلی بار اصلی قیمتی اور کسی کمپنی کے معیاری جوتے خریدے تھے وہ لنڈے کے مال میں شمار ہونے لگ گئے ہیں۔ اور اس پہلے زیادہ تر لنڈے کے جوتے پہنے کسی کو بھی نہیں لگا۔ واہ رے تیری قسمت ابن نیاز صاحب۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ لگتا ہے بیگم کے

بھائیوں کے جوتے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ بندہ جائے تے کتھے جائے۔۔

سوال یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں میری ذاتی استعمال میں تھیں۔ مجھے پسند تھیں۔ تو کیا لوگوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مجھ پر بلاوجہ تنقید کریں۔ جبکہ ان چیزوں کے میرے استعمال سے کسی کو بھی رتی پھر بھی نقصان پہنچنے کا خدشہ بھی نہیں۔ یہ تو اچھا ہے کہ میری طبیعت ایسی ہے کہ اسی باتوں کو ہمیشہ سے نظر انداز کرتا آیا ہوں۔ کیونکہ لوگوں کی اگر سننے لگوں تو لوگ تو اس دنیا میں جینے بھی نہیں دیتے۔ میرے والد مرحوم نے یہ سبق دیا تھا کہ بیٹا سنو سب کی لیکن کرو وہ جو من چاہے۔ تب سے کسی سے ایسی بات پر کبھی بھی بحث تک نہیں ہوئی، لڑائی ہونا تو دور کی بات۔ لیکن میرا سوال ہنوز قائم ہے کہ کیوں لوگ اپنے کام سے کام نہیں رکھتے۔ کیوں دوسروں کی بالکل ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں؟ کوئی جواب دے سکتا ہے۔۔۔۔

خواتین کس قسم کی آزادی چاہتی ہیں؟

آٹھ مارچ کو خواتین کا عالمی دن منایا گیا۔ کہاں پر، یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ لیکن ایک دن پہلے اخبارات سے معلوم ہوا کہ کل یعنی اگلے دن یعنی ۸ مارچ کو خواتین کا عالمی دن منایا جا رہا ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کس لیے؟ خواتین کو یہ دن منانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ بہت غور کیا، یار دوستوں سے بات چیت کی، پھر ایک سروے کیا۔ یہ نہیں بتا پاؤں گا کہ سروے میں کتنے افراد تھے اور کس قسم کے افراد تھے، یعنی کہ شادی شدہ، کنوارے، رنڈوے، منگنی شدہ، گھر جمائی، جورو کے غلام یا وہ جن کی تصویریں رشتے والی مائیاں لے کر پھرتی ہیں، یا پھر گھر سے بھاگے ہوئے، یا بھگائے ہوئے، سسر کی فیکٹری میں ملازم افراد، شاپنگ کے شاپنگ بیگ اٹھانے والے یا بچوں کو اٹھا کر بیوی کے پیچھے بازار میں پھرنے والے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ٹھہریں، کہاں جا رہے ہیں۔ ایک خاص کا ذکر کرنا تو بھول گیا۔ یہ بھی شاید ان افراد میں شامل تھا۔ ہے تو شادی شدہ، لیکن کچھ اس طرح کے شادی سے پہلے اسکے کمرے میں عشقیہ کتابیں، ناولز، سی ڈیز، جینز کی پتلونیں، شرٹیں، پرفیومز، فیسز نیس کریمیں، ہیئر برش، مختلف نیٹ ورکس کی سمیں، تین چار قسم

کے موبائل، پرس میں دس بارہ نام نہاد محبوباؤں کی تصویریں، مختلف بینکوں کے کریڈٹ کارڈز، مختلف دوستوں کی طرف سے دیے گئے گفٹ ہیمپرز، شاید سگریٹ کے مختلف برانڈ کے خالی پیکٹ، کولڈ ڈرنک کی خالی اور ادھ بھرے ٹن پیک وغیرہ وغیرہ اشیاء موجود تھیں۔ لیکن اب جو اس سروے کے ساتھ اسکے کمرے کو بھی چیک کیا گیا تو بے اختیار یہ بات یاد آگئی کہ بس کر پگلے، اب رلائے گا کیا؟ تو اب شادی کے بعد اس کے کمرے میں سر درد کی گولیاں، بچوں کے استعمال شدہ اور غیر استعمال شدہ پیمپرز، پرس میں بیگم کے لیے خریدی جانے والی اشیاء کی لسٹ ، سر پر خوبصورت بالوں کی بجائے ایئر پورٹ بننے کی تیاری، اپنی قمیض کے بٹن ندارد، بچوں کے سکول ورک کی کاپیاں، کتابیں، بیگم کی ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا سامان، ایک آدھ بیلنا بھی بقول شوہر کے کبھی کبھار یہاں دکھائی دے جاتا ہے، پھر شوہر کے سمارٹ جسم پر اسی بیلنے کے نشان اور بھی بہت کچھ۔ تو یہ بھی اس سروے میں شامل تھا۔

سروے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ عام طور پر اس عالمی دن کا تعلق پاکستان میں بسنے والی عام خواتین سے نہیں ہے بلکہ اس کا ظاہری تعلق مغربی معاشرے کی خواتین سے ہے۔ کیونکہ عالمی دن کا تعین کرنے والا ادارہ بھی اقوامِ متحدہ ہے، جو کہ مسلمانوں کا ہر گز نہیں ہے۔ تو مغربی معاشرے کی خواتین جو اس عالمی دن منانے میں کوشاں رہتی ہیں وہ بھی بنیادی طور پر اپنے آقاؤں کے

کھنے پر مناتی ہیں، تاکہ ان کی دیکھا دیکھی اسلامی ممالک کی خواتین بھی اسی طرح کی آزادی کے لیے آواز اٹھائیں۔ ورنہ ان کے پاس کون سا حق نہیں ہے۔اپنی مرضی سے اٹھارہ سال کی ہو کر یا تو اپنے ماں باپ کے گھر سے علیحدہ ہو جاتی ہیں یا انہیں علیحدہ کر دیتی ہیں۔ اگر ساتھ بھی رہتی ہیں تو کسی غلطی پر انکی معمولی سی سرزنش پر فوراً سے پیشتر پولیس کو اطلاع کر دیتی ہیں اور انہیں بتاتی ہے کہ مسٹر اینڈ مسز سمتھ (اس کے ماں باپ کا نام) نے اسے ہراساں کرنے کی کوشش کی ہے۔تو پولیس یا تو ماں باپ کو وارننگ دے کر چلی جاتی ہے یا پھر ساتھ ہی لے جاتی ہے۔ اس کے بعد انہیں جرمانہ ہوتا ہے یا سزا، یہ وہاں کے عالمی خواتین کے موقع پر خطاب کرنے والی خواتین سے پوچھا جائے۔ اور کس قسم کا حق چاہتی ہیں وہ خواتین۔ اپنی مرضی سے بنا چرچ میں بیوی شوہر کا قانون پاس کرائے بغیر میاں بیوی بن کر رہتے ہیں اور دنوں، ہفتوں نہیں بلکہ سالوں تک۔

اس کی مثال انجلینا جولی اور بریڈ پٹ کی سب کے سامنے ہے۔ اور کون سا حق ان کو چاہیے۔ اپنی مرضی سے اپنی مرضی کی نوکری وہ کرتی ہیں۔ جہاں دل چاہے وہیں سو جاتی ہیں اکیلے میں یا تنہائی کو دور کرنے کے لیے کسی کے بغل میں۔ کیا یہ حق کافی نہیں۔اگر وہ شادی شدہ ہیں تو شوہر ان کو مار نہیں سکتا، انہیں ڈرا دھمکا نہیں سکتا کہ انھوں نے جھٹ سے پولیس ایمرجنسی کو فون کر دینا ہے یا الٹا دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو خود گھر کو چھوڑ کر چلے جانا ہے یا پھر شوہر کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتی ہیں۔

ان خواتین کو اور کیا حق چاہیے۔ مختصر ترین لباس پہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اپنے جسم کی نمائش (اپنے ان الفاظ پر مسلمان بہنوں سے انتہائی معذرت۔ لیکن لکھنا مجبوری ہے) دھڑلے سے کرتی ہیں۔ پیراکی کا لباس پہن کر بنا کسی شرم وحیا کے بیچ چوراہے میں بنے پول یعنی تالاب میں نہاتی ہیں۔ سمندر کے کنارے سورج کی روشنی سے غسل لیتی ہیں، اپنی گوری چمڑی کو جس کی خاطر پاکستان بھر کی خواتین فیئر اینڈ لولی اور پتہ نہی کون کون سی کریمیں اور لوشنز استعمال کرتی ہیں، سنہری بنانے کے مختلف جتن کرتی ہیں۔ کوئی بھی انہیں نہیں ٹوکتا، کوئی بھی روکنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ ان خواتین کو اور کتنی آزادی چاہیے کہ جب دل کرتا ہے اپنے بوائے فرینڈ کو بیچ سڑک میں کھڑے ہو کر ایک عدد اسکے خشک ہونٹوں کو تر کر دیتی ہیں اور پھر مزے سے بائے کہہ کر اپنی راہ لے لیتی ہیں۔ اگر اس بوائے فرینڈ سے ان بن ہو جائے تو اگلے ہی دن کوئی دوسرا ساتھی بغل سے ہاتھ نکالے اسکے ہاتھوں کو گرما رہا ہوتا ہے۔ ان کو اور کس قسم کی آزادی چاہیے۔ مادر پدر یہ آزاد ہیں، بھائی بہنوں کی محبت سے یہ آزاد ہیں۔ کسی رشتہ کی انہیں پروا نہیں۔ وقتی طور پر شاید اولاد کی محبت ان کے دلوں کو پگھلا دیتی ہے تو اور بات ہے۔ لیکن جب یہی اولاد بڑی ہو کر انہیں اولڈ ہاؤسز میں بھیج دیتی ہے تو پھر چند دن آنسو بہانے کے بعد انہیں پھر سے اپنی زندگی یاد آتی ہے اور پھر سے یہ آزادی مانگتی ہیں۔

کیا پاکستان کی یا عالمِ اسلام کی خواتین ! آپ بھی اسی آزدی کی متمنی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کو ان سے زیادہ آزادی حاصل ہے۔ اسلام نے تو آپ کو وہ حقوق دیے ہیں جو کسی بھی مذہب نے اپنے ماننے والی خواتین کو نہیں دیے۔ آپ کو ماں کا درجہ دیا تو انتہا تک پہنچا دیا۔ جنت آپ کے قدموں کے نیچے رکھ دی۔ کلاس میں ایک استاد نے بچوں سے کہا کہ آپ میں سے کل جو بچہ جنت کی مٹی لائے گا اسے انعام ملے گا۔ اگلے دن ایک بچے کے علاوہ سارے خالی ہاتھ آئے۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔ ایک بچہ اپنے پاس شاپنگ بیگ میں مٹی اٹھائے ہوئے تھا۔ استاد کو سمجھ تو آ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے غصے میں اس بچے سے پوچھا کہ استاد کے ساتھ مذاق کرتے ہو؟ بچے نے سہم کر جواب دیا کہ جناب آپ نے ہی کہا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے تو جہاں جہاں میری ماں نے قدم رکھے، میں وہاں کی مٹی اٹھا کر لے آیا۔ اگر ماں آپ سے ناراض ہو جاتی ہے تو پھر آپ کچھ بھی کر لیں، شاید آپ کی روح بھی جسم چھوڑے پر آمادہ نہ ہو۔ حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ ان کی والدہ ان سے ناراض تھیں۔ وہ عالمِ نزع کے میں کافی دیر سے تھے۔ کافی وقت کے بعد حضور ﷺ کو اطلاع دی گئی۔ وہ تشریف لائے۔ ان کو بارگاہِ الٰہی سے اطلاع دی گئی۔ آپ ﷺ نے ان صحابی کی والدہ کو بلایا۔ ان سے ساری بات سننے کے بعد ان سے درخواست کی کہ انھیں معاف کر دیں۔ ماں نے انکار کر دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ آگ جلائی جائے اور حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ کو اس آگ میں جلایا جائے۔ ماں ماں

ہوتی ہے، فوراً انہیں معاف کر دیا۔ معافی ملتے ہی ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور آپ وہ ماں بننا چاہتی ہو کہ جس کی اولاد جو چاہے کرے، جس کا شوہر جو چاہے کرے، آپ کی آزادی میں مداخلت نہ کرے۔ اس پر آپ کی عاقبت تو خراب ہو گی ہی، شوہر بھی گناہ گار ہو گا کہ اس نے اپنی زوجہ کو سیدھے رستے پر کیوں نہ چلایا۔

آپ کو بیٹی بنایا۔ اور بیٹی کا درجہ دیکھیں کہ جس کی وجہ سے ماں باپ جنت میں جا سکتے ہیں۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ جس نے اپنی بیٹی کی پرورش اس طرح کی کہ بیٹی ایمان کی حالت میں اور ماں باپ سے ہنسی خوشی اس دنیا سے رخصت ہوئی تو وہ قیامت کے دن نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح دو انگلیاں آپس میں جڑی ہوتی ہیں۔ یہ ہوتا ہے بیٹی کا درجہ۔ اور آپ وہ بیٹی بننا چاہتی ہو جس کی وجہ سے آپ کی اپنی عاقبت خراب ہو۔ کیا آپ ایسی بیٹی بننا چاہتی ہو کہ جس کی وجہ سے آپ کے والد دنیا والوں سے منہ چھپاتے پھریں۔ آپ کے گھر والے گھر سے نکلنے میں عار محسوس کریں۔

اسلام نے تو آپ کو بہن کا درجہ دیا۔ اور یہ درجہ اس درجے پر ہے کہ کوئی بھی اچھا بھائی بہن کے ناز نخرے اٹھانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بہن کے منہ سے کوئی فرمائش نکلتے ہی بھائی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اسے پورا کیا جائے۔ بہن

کو تنگ کرنا، اور اس کے ناراض ہونے پر اس کو منانے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔ بہنیں تو بھائیوں کی رازدان ہوتی ہیں۔اور آپ چاہتی ہو کہ آپ کے کوئی بھائی نہ ہو، جس پر آپ کو فخر ہو۔آپ کسی مشکل میں ہو اور آپ کا بھائی اس مشکل کا مداوا نہ کرے۔

آپ اگر مغربی رویہ رکھو گی اور گلی ، محلے ، بازار میں اگر کوئی لڑکا آپ کو آپ کی مغربی طرز کی حرکتوں ، لباس کی وجہ سے آپ پر انگلی اٹھائے گا، آپ پر آواز کسے گا، آپ کو چھیڑے گا، آپ کا پیچھا کرے گا، تو آپ کا کیا خیال ہے کہ مغربی ماحول کے گھر میں کسی بھائی میں غیرت جاگے گی۔ شاید نہیں۔ کہ یہ سب آپ کا کیا دھرا ہو گا۔آپ کو ایسی آزادی چاہیے؟

رسولِ پاک ﷺ کی حدیث پاک ہے کہ تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو۔ اور میں تم سب میں سے اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہوں۔ اگر اس حدیث پر طائرانہ نگاہ بھی دوڑائی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان الفاظ کے پیچھے دراصل ایک شوہر کا اپنی بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔اب اگر کوئی اپنی بیوی کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے تو وہ گویا اس حدیث کے خلاف عمل کرتا ہے۔

رسول پاک ﷺ نے اپنی بیوی کے ساتھ دل جوئی کرنے کا حکم دیا ہے۔اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے کا حکم دیا ہے جو کہ اسلام کے دائرے کے اندر ہو۔ جس طرح شوہر کا دل چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے لیے سجے ، سنورے۔ اسی طرح شوہر کو بھی ایسا حلیہ بنانے کا کہا گیا ہے کہ بیوی اسے دیکھے تو خوشی محسوس کرے۔

بیوی کے جائز حقوق پورے کرنا ہر شوہر کا فرض ہے۔ اگر شوہر اس میں کمی کوتاہی کرتا ہے اور اس سلسلے میں اگر بیوی کوئی غلط کام کرتی ہے، جیسے اگر شوہر معاشی حق پوری طرح نہیں دیتا جس کی وجہ سے بیوی کو اپنے والدین، بہن بھائیوں سے رقم طلب کرنی پڑتی ہے تو اسکا اگر کوئی گناہ ہو گا تو وہ شوہر پر بار ہو گا۔ جب بیوی کے غلط کاموں کی وجہ سے شوہر کی گردن میں طوق پڑے گا، تو بیوی کو اور کیا حق چاہیے۔ اگر بیوی چاہتی ہے کہ وہ نوکری کرے، تو کس لیے؟ اگر اسکی معاشی ضروریات شوہر پوری نہیں کرتا، تو وہ شوہر کو پیار سے کہے کہ یہ یہ اسکی جائز ضروریات ہیں، شوہر ان کو پورا کرے۔ نہیں تو پھر اس کو نوکری کرنے کی اجازت دے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ نوکری ایک تو ایسے حالات میں ہو جہاں پر غیر مردوں یعنی نامحرموں کے ساتھ رابطہ نہ ہو۔ یا اس درجہ تک ہی ہو کہ وہ اس دفتر کا حصہ ہوں۔ اس نے بات چیت بلا کسی اشد ضرورت کے کرنے کا حکم نہیں۔

اب اگر بیوی کو یہ حق بھی چاہیے کہ وہ بیلنے سے (جس کا ذکر اوپر کیا گیا) شوہر کی پٹائی بھی کر سکیں۔ جب مرضی آئے اسے گھر سے نکال سکیں تو یہ تو اسلام کے دائرے میں نہیں۔ کیونکہ شوہر کو بھی یہ حق ہر گز حاصل نہیں کہ وہ بیوی پر ہاتھ اٹھائے۔ سوائے اس کے کہ جب وہ بہت مجبور ہو جائے تو ضرور ہاتھ اٹھائے لیکن اس طرح سے کہ بیوی کو ڈر محسوس ہو، اور اگلی بار اس طرح کی

غلطی نہ دہرائے۔ بیوی کو اللہ پاک نے طلاق مانگنے کا حق دے دیا ہے جسے خلع کا نام دیا گیا ہے۔ جب بیوی سمجھتی ہے کہ اس کا اس شوہر کے ساتھ کسی طور بھی گزارا نہیں ہو پا رہا۔ وہ جسمانی طور پر کمزور ہے، اسکی شکل و صورت اچھی نہیں ہے، وہ اسکی ضروریات پوری نہیں کر پا رہا۔ وہ اسکو ناجائز طور پر تنگ کرتا ہے۔ اسکو وقت بے وقت مارتا ہے۔ ہر وقت طعنے دیتا رہتا ہے۔ تو بیوی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ عدالت کے ذریعے سے خلع کا مطالبہ کرے۔ اور عدالت اس کی بات سن کر اور باقاعدہ ثبوت لے کر بیوی کو خلع دلوا دے۔ اور بیوی کو کیا چاہیے۔

اگر خواتین ان سب کے خلاف کام کرتی ہیں تو یقینا وہ شریعت سے، اسلام سے فرار چاہتی ہیں۔ وہ قرآن کے احکامات کو ماننے سے انکار کرنا چاہتی ہیں۔ وہ رسول پاک ﷺ کی عائلی زندگی کو اپنی زندگی میں شامل ہرگز نہیں کرنا چاہتیں۔ یہ یاد رہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے روزِ آخرت میں آپ کا ساتھ نہیں دینا۔ اگر کچھ کام آئے گا تو قرآن و سنت پر عمل کام آئے گا۔ باپ کی رضامندی، ماں کی معافی کام آئے گی۔ بھائی کے نخرے اور شوہر کی اسلام پر چلانے کے احکامات کام آئیں گے۔

پھانسی کی سزا پر یہ شور شرابا کیوں برپا ہے؟

قران پاک کی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۸ کا ترجمہ ہے:۔ " مومنو! تم کو مقتولوں کے بارے میں قصاص (یعنی خون کے بدلے خون) کا حکم دیا جاتا ہے (اس طرح پر کہ) آزاد کے بدلے آزاد (مارا جائے) اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ اور اگر قاتل کو اس کے (مقتول) بھائی (کے قصاص میں) سے کچھ معاف کر دیا جائے تو (وارث مقتول کو) پسندیدہ طریق سے (قرارداد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خون بہا کرنا) اور (قاتل کو) خوش خوئی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے یہ پروردگار کی طرف سے (تمہارے لئے) آسانی اور مہربانی ہے جو اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لئے دکھ کا عذاب ہے۔"

قرآن کی اس آیت کی بہت سی تفاسیر ہوئی ہیں جو کہ ان کتب میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ میں کوئی تفسیر بیان نہیں کروں گا۔ کیوں کہ ہمارے اسلاف میں ایک سے بڑھ کر ایک عالم، مفتی پیدا ہوا ہے، ولی اللہ پیدا ہوا ہے۔ سب سے بڑھ کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت تھی، جنھوں نے براہِ راست حضور نبی کریم ﷺ سے درس لیا۔ قرآن کی مجسم تفسیر کو اپنی آنکھوں سے پڑھتے رہے۔ ان کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر پر لکیر ہوتا تھا اور تا قیامت رہے گا۔ تو مجھے یہ حق کہاں حاصل کہ میں قرآن کی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر بیان

کروں، یا اس میں کوئی کمی بیشی کروں۔ میں تو یہاں پر قاتل کو موت کے حوالے کرنے کے ایک طریقے پھانسی کی سزا پر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے آیا ہوں۔

شاید سب پڑھنے والے، لکھنے والے ہابیل و قابیل کے واقع سے واقف ہیں۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ انجام کیا ہوا! قیامت تک دنیا میں جتنے بھی لوگ بے گناہ مارے جائیں گے، چاہے وہ کسی بھی طریقے سے ہوں، ان سب کے جرم میں اور آخرت کی سزا میں قابیل برابر کا حصہ دار ہوگا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قتل کتنا بڑا جرم ہے۔ اور پھر حدیثِ پاک کے وہ الفاظ کہ ایک شخص کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ تو کیا پوری انسانیت کے قاتل کو زندہ رہنے کا حق دیا جائے، کہاں کا انصاف ہے؟ اسلیے قاتل کے لیے سزائے موت تو ہے۔ لیکن ۔۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں قتل کے مجرم کو، کسی دہشت گرد کو، کسی جاسوس کو مختلف قسم کی موت کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ جس میں لوہے کی کرسی پر بٹھا کر اسے کرنٹ سے مارنا، زہریلا انجیکشن لگانا وغیرہ شامل ہیں۔ جب مارنا ہی ٹھہرا تو کیا کرنٹ سے، کیا زہر سے یا پھر کیا پھانسی سے۔

پھانسی کی سزا یا موت کی سزا عمومی طور پر اس مجرم کو دی جاتی ہے جس پر کوئی نہ کوئی قتل ثابت ہو چکا ہو۔ اسی ثبوت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیت کے شروع کا ترجمہ پڑھیں۔ مومنو! تم کو مقتولوں کے بارے میں قصاص یعنی خون کے بدلے خون کا حکم دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ بس۔ اس آیت میں شک کہاں پر ہے؟ متشابہات میں

سے تو یہ آیت ہر گز نہیں ہے۔ صریح پتہ چلتا ہے کہ جب کسی شخص کو قتل کیا جائے گا تو اسکے بدلے میں بھی ایک جان کو جان دینی پڑے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون ہو گا جو جان کے بدلے اپنی جان دے گا۔اس کا جواب آگے ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ جہاں تک آزاد غلام کی بات ہے تو بے شک آج کے دور میں غلام موجود نہیں۔ لیکن اگر ہم غلام کو اس معنوں میں لے لیں جیسے آج کل مختلف تنظیموں نے اجرتی قاتل رکھے ہوئے ہیں، اور وہ اپنے اوپر والوں کے کہنے پر مختلف قتل کی وارداتوں میں ملوث ہو جاتے ہیں، تو اس میں ان کا ذاتی کیا قصور۔ تو جب کہا گیا کہ آزاد کے بدلے آزاد۔ تو میرے خیال میں مقتول کے بدلے اس شخص کو موت کی سزا دینی چاہیے جس نے یہ حکم دیا ہے، نہ اس شخص کو جس نے یہ قتل کیا ہے۔ بے شک اس قاتل کو بھی سزا تو دینی ہی ہے، لیکن پہلے حق دار وہ حاکم ہے جس نے یہ کام کروایا ہے۔تو یوں آزاد کے بدلے آزاد ہوا۔

اب بات آتی ہے عورت کے بدلے عورت کی۔ تو پرانے زمانے میں یہ کیا جاتا تھا کہ اگر کسی قبیلے کی کوئی عورت کسی دوسرے قبیلے کی کسی عورت کو قتل کرتی تھی تو اسکے بدلے میں پہلے قبیلے کے کسی نہ کسی مرد کو موت کی سزا سنا دی جاتی تھی، جو کہ عموماً اسکے رشتہ داروں میں سے ہوتا تھا۔ لیکن ان احکامات

نے واضح کر دیا کہ اگر مجرم عورت ہے تو عورت کو ہی موت کی سزا دی جائے گی، نہ کہ اسکے بدلے کسی مرد کو سزا ملے گی۔ سزا ملنی ہے اور وہ بھی موت کی۔ جو کہ ہمارے خدا کی طرف سے ہمیں بحیثیت مسلمان، مومن ہونے کے حکم ہے، تو پھر وہ پھانسی کی سزا کیوں نہ ہو۔ زہر دے کر یا کرسی میں کرنٹ دوڑا کر تڑپا تڑپا کر مارنے سے بہتر نہیں کہ اسے تین، چار سیکنڈ میں ہی دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔ اور اسکی لاش کی بے حرمتی بھی نہ ہو، یعنی اسکا جسم اندر باہر سے پورا ہو۔

کرنٹ جب جسم سے گزارا جاتا ہے تو وہ جس کے بہت سے حصوں کو جلا دیتا ہے۔

اگر نکلنے کا راستہ نہ ہو اور کرنٹ کا وولٹیج زیادہ ہو تو عین ممکن ہے کہ جسم میں سوراخ بھی ہو جائیں۔ پھر جس شخص کو کرنٹ دیا جاتا ہے، وہ کتنی دیر تک تڑپتا ہے، اس کی روح نکلنے میں کتنا وقت لگاتی ہے، رب ہی جانتا ہے۔ جب کسی شخص کو زہر دیا جاتا ہے سوائے سائنائیڈ زہر کے، تو وہ زہر اس کے جسم کی رگوں کو کاٹتے ہوئے پورے بدن میں گردش کرتی ہے۔ یا تو پھر مساموں سے خون خارج ہوتا ہے یا وہ کٹے کلیجے کی الٹی کرتا ہے یا پھر تڑپ تڑپ کو اپنی جان دے دیتا ہے۔ لیکن جب کسی شخص کو پھانسی دی جاتی ہے تو چند لمحوں کے لیے تڑپتا ہے، اسکی گردن کا منکا ٹوٹتا ہے اور اس کی روح دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ بتائیے قارئین! کس طریقے سے کسی شخص کو موت کے حوالے کرنے میں کم وقت

اور لگتا ہے اور کم تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

انگریزوں کے پاکستان، انڈیا پر قبضے کے دوران انگریزوں نے پھانسی کا قانون رائج کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں گرفتار ہونے والوں کو یہ سزا دی گئی تھی، اور وہاں سے با قاعدہ آغاز ہوا تھا۔ بعد میں اس کو با قاعدہ قانون کی کتابوں میں درج کیا گیا۔ ٹو بی ہینگڈ ٹِل ڈیتھ۔ جب تک جان نہ نکل جائے، پھانسی پر لٹکائے رکھو۔ شروع میں تو یہ سزا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متوالوں، جیالوں کو دی گئی تھی جو حق پر تھے۔ آزادی چاہنا ہر اک کا حق ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں غالباً حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے کسی بیٹے نے ایک شخص کو مارا تھا۔ اس شخص نے خلیفۂ وقت کے دربار میں شکایت کی تھی تو خلیفۂ وقت نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا تھا کہ اے عمرو۔ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، جب کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا۔ اور اسکے ہزار سال بعد مشہور فلسفی جے جے روسو نے کہا تھا کہ انسان تو آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں ہے۔ یعنی کوئی نہ کوئی قدغن اس پر لگی رہتی ہے۔ تو آزادی چاہنا بھی ہر کسی کا حق ہوتا ہے۔ خیر۔ پھانسی کی سزا یہاں پر انگریزوں نے جب لاگو کی تو جرموں کی تعداد میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ کیونکہ پھانسی کی سزا سے ہر کوئی ڈرتا تھا۔

انگریزوں کا اپنا لایا ہوا قانون، اور آج یورپی یونین اٹھ کھڑی ہوئی کہ اس ظالمانہ سزا کو پاکستان سے ختم کیا جائے۔ کیونکہ جینا ہر کسی کا بنیادی حق ہے۔ ارے عقل کے اندھو! کیا پھانسی کی سزا راہ چلتے کسی بھی بندے کو پکڑ کر دی جاتی ہے؟ کوئی مذاق ہے کیا؟ یہ سزا تو اس شخص کو دی جاتی ہے جس نے قتل کیا ہو۔ اور اب جس شخص نے ایک سو چار قتل کیے ہوں، اس کو جینے کا حق دیا جائے اور جو ایک سو چار افراد اس کے ہاتھوں اس دنیا سے چلے گئے اور پیچھے ایک سو چار خاندان ہمیشہ کے لیے تڑپتے رہ گئے، ان کو جینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ دہشت گرد کلاشنکوفیں، ریپیٹرز، بم لے کر آئیں، سکولوں، مسجدوں، چرچوں میں آکر بے گناہ افراد پر گولیاں برسائیں۔ اور پھر ان گولیاں برسانے والوں کو جینے کا حق دیا جائے۔ یورپی یونین والو! کیا یہ جینے کا حق ہوتا ہے کہ ایک بے گناہ خاتون کو اسکے ناکردہ گناہ پر پورے امریکہ نے چوراسی سال کی قید کی سزا سنا دی۔ جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے امریکہ سے پڑھ کر امریکہ کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے حق کو حق کہا تھا۔ اس نے امریکہ کے جرائم، جو وہ افغانستان میں بے گناہ افراد کو مار کر رہا تھا، کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اس ڈاکٹر عافیہ کے حق میں تو آپ نے کبھی بھی کوئی بات نہیں کی۔ اس ڈاکٹر عافیہ کی آج پندرہ سال ہونے کو آئے ہیں، تنہا کال کوٹھڑی میں روزانہ گوروں کے ہاتھوں عزت لوٹی جاتی ہے، اور آپ کہتے ہیں کہ موت کی

سزا نہ دے کر جینے کا حق دیا جائے۔ اگر ڈاکٹر عافیہ کو چوراسی سال کی سزا دینے کی بجائے ڈائریکٹ پھانسی کی سزا سنا دی جاتی یا کسی بھی طریقے سے لمحوں میں مل جانی والی موت دی جاتی تو آج پندرہ سال میں اسکے بہن بھائیوں، اولاد کو بھی صبر آ جاتا اور ان کو جینے کا حق بھی حاصل ہوتا۔ آج وہ روزانہ جیتے ہیں، روزانہ مرتے ہیں، لیکن یورپی یونین والو، تمھارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اندھوں میں کانا راجا، اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بانکی مون بھی بولے۔ کہ پاکستان میں رائج پھانسی کی سزا ختم کرو۔ کیوں؟ کیونکہ امریکہ، برطانیہ، انڈیا، فرانس، اسرائیل کے بہت سے چیلے اور گرگے یہاں گرفتار ہیں یا ان شاء اللہ عنقریب مختلف جرموں کے بدلے میں جن میں قتل تک شامل ہے، گرفتار ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے جرم ثابت ہو گا اور پھر ان کو پھانسی کی ہی سزا ملے گی۔ تو ان ممال کو یہ خطرہ ہے کہ پھر کون انکو پاکستان کی کمزوریاں بتائے گا۔ کون پاکستان کے راز افشا کرے گا۔ کون انکے جاسوسوں کو جائے پناہ دے گا۔ تو انھوں نے براہِ راست کہنے کی بجائے ایک فورم کا انتخاب کیا گیا، جسے دنیا یونائیٹڈ نیشنز کے نام سے جانتی ہے۔ اسکے سیکرٹری جنرل کے ذریعے پاکستان کے حکمرانوں کو پیغام پہنچایا گیا کہ یہ ظالمانہ سزا ختم کرو۔ اقوامِ متحدہ کی ویسے تو کوئی مانتا نہیں، خاص طور پر بڑے ممالک، جن کا

سرِبارہ شیطان کا کارندہ امریکہ ہے۔ تو ہم کیوں مانیں۔ اور پھر خاص طور پر وہ بات جس کو کرنے کا حکم ہمیں ہمارے رب نے دیا ہے۔ یعنی ہم اپنے عاقبت خراب کریں۔ یہاں ہم سے مراد پاکستان کے حکمران ہیں۔

دنیا میں واقعی اندھیر نگری ہی ہے۔ قانون کی بھینس بھی اسی کی ہے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ فرانس کا پوپ بھی بولا کہ ہم کسی طور بھی پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کی اجازت نہیں دے سکتے۔ واہ رے تیرے کیا کہنے۔ تم سے پوچھا کس نے ہے؟ تم ہوتے کون ہو پاکستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے والے۔ اگر تم سے کہا جائے کہ ایک پاکستانی ہے جو پاکستان سے ہزاروں میل دور ایک اور ملک میں بیٹھا پاکستان کے خلاف جوشِ خطابت کے مظاہرے کر رہا ہوتا ہے، اسے اس ملک کو کہہ کر پاکستان کے حوالے کرواؤ تو کیا اتنی جرات کر سکوگے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہاں یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دینا ہے کہ وہ تو اس ملک کا اندرونی معاملہ ہے۔ عقل کے اندھوں کو بس پاکستان نظر آتا ہے۔ اور اسلیے کہ اس پر اللہ پاک کی خاص الخاص نظر ہے۔ ورنہ چین کے ایک دانشور کے مطابق اگر چین کے ساتھ یہ صورت حال ہوتی تو چین آج سے تیس سال پہلے ختم ہو چکا ہوتا کہ پاکستان کو لوگ باہر سے بھی کھا رہے ہیں اور اندر سے بھی۔ کیا خیال ہے پھانسی کے فوائد کچھ بھی نہیں کیا؟ میرے خیال میں تو کافی ہیں۔

جب ہر گلی، محلے، قصبے سے نکلنے والا ایک چھوٹے درجے کا بدمعاش اپنے آقاؤں کے بل بوتے پر جیل میں عیاشی کی زندگی گزارتا ہے، دنیا کی ہر آسائش اس کو میسر ہوتی ہے، اسکو جب بیچ چوراہے کہ پھانسی دی جائے تو شاید بہت سے مجرموں کی، ملزموں کی، جرم کا خیال دل میں لانے والوں کی سوچ بدل جائے کہ کل انکا انجام یہ ہو سکتا ہے۔ پچھلے آٹھ سالوں میں آٹھ ہزار سے زیادہ پھانسی کے لیے ثابت شدہ مجرموں کو پھانسی گھاٹ کے قریب بھی نہ پھٹکا کر ان پر تیرہ ارب سے زیادہ اخراجات کیے گئے۔ یاد رہے یہ اخراجات مجرموں پر کیے گئے۔ اگر یہی مجرم سزا ملنے کے اگلے دن ہی پھانسی لگ جاتے تو یہ تیرہ ارب شاید، شاید پاکستان میں کسی بہتر کام کے لیے مہیا کیے جا سکتے تھے۔
پھانسی کی سزا واقعی ایک سخت سزا ہے، لیکن جس طرح سعودی عرب میں ایک چور کا پہلی مرتبہ چوری ثابت ہونے پر دایاں ہاتھ کاٹا جاتا ہے تو اس کو لوگ دیکھ کر عبرت پکڑتے ہیں اور شاید بہت سے چوری کرنے کا سوچتے بھی نہیں۔ تو اسی طرح جب عوامی سطح پر بیچ چوک کے پھانسی دی جائے گی تو بہت ممکن ہے کہ جرائم کی سطح میں کمی آجائے، ان شاء اللہ۔ شاید موت کی سزا ہی کی وجہ سے چین اور سعودی عرب میں جرائم کی شرح کم ترین سطح پر ہے۔ تو پھانسی کی سزا سے ہمارے معاشرہ بھی اگر سدھر سکتا ہے تو کیا پرامن پاکستان دنیا کی نظروں میں کھٹکتا ہے؟؟؟ اگر بانکی مون، پوپ فرانس یا یورپی یونین کے پاس اس سے بہتر کوئی سزا ہے جس کی وجہ سے جرائم کی شرح میں کمی آئے تو بتا دیں۔۔۔

جناب عالی۔ پھانسی کی سزا صرف ایک صورت میں ختم ہو سکتی ہے وہ بھی مجرم کی، نہ کہ قانون کی کہ جب اللہ کے حکم کے مطابق قاتل مقتول کے ورثا کو دیت دے گا۔ جو کہ باہمی افہام و تفہیم کے مطابق آزاد ماحول میں، بنا کسی زور زبردستی کے طے پا جائے گی۔ تب ہی اس مجرم کی پھانسی کی سزا ختم ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی اللہ کا حکم ہے۔ اور اس طرح معافی دینے کے بعد کوئی بھی کسی قسم کی زیادتی نہیں کرے گا۔ کہ معاف کرنے والا پھر بھری محفلوں میں احسان جتاتا پھرے کہ اگر وہ معاف نہ کرتا تو آج اسکی لاش کو کیڑے کھا چکے ہوتے۔ اور قاتل کے گھرانے والے یہ کہتے پھریں کہ اگر وہ دیت نہ ادا کرتے تو یہ لوگ غریب کے غریب ہی رہتے، یا انھوں نے تو پھر بھی اپنے قاتل کو دے دلا کر بچا لینا تھا وغیرہ وغیرہ۔ زیادتی کرنے والے کے لیے، چاہے وہ کسی بھی طرف سے ہو، اللہ پاک نے دکھ دینے والا عذاب رکھا ہے۔ پھانسی کی سزا کے لیے قانون میں تبدیلی کر کے چوراہے میں دینی چاہیے کہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ اور آئندہ جرم کرنے سے توبہ کریں۔ یہ اللہ کا حکم بھی ہے اور وقت کی آواز بھی۔

نماز کی ادائیگی کوئی مذاق نہیں۔

کوئی عنوان سے یہ نہ سمجھے کہ یہاں میں کسی مفتی سے فتویٰ یا کسی عالم سے کی گئی کوئی ماہرانہ گفتگو تحریر کروں گا۔ کیونکہ میرے ذہن میں اور آنکھوں کے سامنے جو چیز کلبلا رہی ہے وہ در حقیقت نماز کی ادائیگی کا طریقہ کار ہے۔ ویسے تو نماز میں خشوع و خضو کا حکم ہے اور شاید (علماء کرام تصیح کریں گے) واجب ہے کہ ایک حدیث پاک ﷺ کے مفہوم کے مطابق جس کی نماز اسکی روح کے مطابق ادا نہیں کی ہوئی ہو گی ، اسکی نماز کو قیامت کے دن اسکے چہرے پر یوں مارا جائے گا جیسے رومال میں کوئی چیز لپیٹ کر ماری جائے۔ اب خشوع و خضوع بھی دو قسم کا ہو جاتا ہے۔ ایک ظاہری جس کو ساری دنیا دیکھ سکتی ہے اور ایک باطنی یا اندرونی، جس سے بندہ یا پھر اللہ ہی واقف ہوتا ہے۔ یہاں میں ظاہری خشوع کی بات کروں گا۔ اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ جو میں تحریر کروں، وہ کوئی پتھر پر لکیر ہو گی، نہیں ۔ البتہ وہ شاید کسی حد تک ان لوگوں کو آئینہ دکھا دے، جو زیرِ بحث طریقوں میں سے کسی بھی طریقے سے نماز ادا کرتے ہیں۔

میں تو مشہور کامیڈین عمر شریف کے اس شعر کی مانند ہوں۔۔

مانا کہ پورا مسلماں تو نہیں ہوں لیکن

دین سے اتنا رشتہ تو جوڑ سکتا ہوں
نماز، روزہ، حج، زکوۃ، کچھ بھی نہیں
شبِ برا کی رات پٹاخے تو چھوڑ سکتا ہوں۔

یعنی میں کوئی توکل علی اللہ کرنے والا، قناعت پسندی اختیار کرنے والا مومن نہیں۔ نماز کبھی پانچ وقت پڑ لیتا ہوں، کبھی پانچ دن نہیں پڑتا۔ مسجد کبھی جاتا ہوں، کبھی غائب ہو جاتا ہوں۔ لیکن پھر بھی جب بھی اپنے مسلمان بھائیوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو کچھ کو دیکھ کر رشک نہیں، بلکہ حسد محسوس ہوتا ہے کہ میں اس طرح کیوں نہیں پڑھ پاتا۔ اس طرح سکون سے میں کیوں نماز ادا نہیں کرپاتا۔ اگرچہ اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔ اور جب دل اطمینان میں ہو، سکون میں ہو تو سمجھیں کہ سارا جسم ہی سکون میں ہو گا۔ روح بھی سکون میں ہو گی، دماغ بھی سکون میں ہو گا۔ اب نماز بھی ذکرِ الٰہی کی ہی ایک قسم ہے۔ لیکن ہم پھر بھی بے سکون رہتے ہیں، کیوں؟ نماز میں جو ظاہری خشوع ہے اس کا مطلب نماز کے ارکان کو انتہائی سکون سے ادا کرنا ہے۔ اگر قیام ہے تو قیام نظر آئے، اس میں حرکت کوئی نہ ہو۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوئی اپنے کپڑوں سے کھیل رہا ہے۔ قمیص کی سلوٹیں درست کر رہا ہے، آستینوں اوپر نیچے کر رہا ہے۔ کوئی اپنی داڑھی کا خلال کر رہا ہے، باقاعدہ ہاتھوں سے سر کے بالوں میں یا

داڑھی میں کنگھی کی جا رہی ہے۔ اگر ناک صاف کیا جا رہا ہے تو مسلسل صاف ہو رہا ہے معذرت کے ساتھ) اور نہ صرف ناک کی صفائی ہو رہی ہے بلکہ ناک سے نکلنے والے) مواد کو چیک کیا جا رہا ہے کہ کیا کچھ خارج ہوا ہے۔ اگر جسم کے کسی حصے میں خارش ہو رہی ہے تو خارش کیے جا رہا ہے۔ سنا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ قلیل حرکت کی وہ بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں اجازت ہے۔ اب قلیل حرکت کیا ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں کہ اگر کہیں خارش کا احساس ہو رہا ہے تو پہلے تو برداشت کرے، لیکن اگر نہیں ہو رہی تو پھر وہاں ایک ہاتھ کی ایک انگلی سے ہلکی سی خارش اس طرح نامحسوس طریقے سے کرے کہ دوسرا اگر دیکھ بھی لے تو یہی سمجھے کہ غلطی سے ہاتھ اٹھ گیا ہے۔ یہ ایک مثال ہے۔ لیکن میں نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اگر خارش کرنی ہے تو بے شک ہاتھ تو ایک ہی ہو گا، لیکن پورے ہاتھ سے سیکنڈوں تک خارش کی جا رہی ہو گی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ پورا قیام اسی خارش میں گزر جائے۔ پورا قیام اسی داڑھی کے خلال میں گزر جائے یا کپڑوں کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے گزر جائے۔ پھر قیام میں سیدھا کھڑا ہو کر نگاہیں سجدے کی جگہ جمانے کا کہا گیا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے اور کئی افراد کو دیکھا ہے کہ وہ بجائے سجدے کی جگہ نظریں ٹکانے کے یا تو ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی قریب سے گزرے تو کن انکھیوں سے دیکھیں گے کہ کون گزرا ہے۔ اگر کوئی حرکت قریب میں ہوئی ہے تو بھی اس کو دیکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو

اگرچہ ادھر ادھر تو نہیں دیکھتے، لیکن بجائے سجدے کی جگہ دیکھنے کے اس طرح قیا کی حالت میں اس طرح جھک جاتے ہیں کہ نظریں اپنے قدموں پر جماتے ہیں یا ان کی نظریں پنجوں پر ہوتی ہیں۔ قیام سے رکوع میں جاتے ہوئے پہلے دامن کو ہلکا سا جھٹکا دیا جاتا ہے پھر رکوع کیا جاتا ہے۔ اور پھر رکوع میں حکم ہے کہ اپنے پاؤں کی انگلیوں پر نظر جمائی جائے۔ لیکن یہاں نظروں کے ساتھ پاؤں کو گویا حرکت دی جاتی ہے۔ پاؤں کی انگلیاں ورزش کر رہی ہوتی ہیں۔ ہاتھ گھٹنوں پر ہوتے ہیں لیکن شاید گھٹنوں کی مالش کرنے کے لیے نہ کہ رکوع کے ایک رکن کے طور پر۔ رکوع اس طرح کیا جانا چاہیے کہ کمر سیدھی رہے۔ لیکن یہاں یا تو پورا جھکا ہی نہیں جاتا کہ کمر سیدھی ہو یا پھر اتنا جھکا جاتا ہے کہ سر بس گھٹنوں کو اب چھوئے کہ اب چھوئے۔ اب باری آتی ہے رکوع سے اوپر اٹھنے کی۔ تو پہلے ایک دفعہ مزید نیچے جھکا جاتا ہے، جیسے سپرنگ پر سے اچھلنے کے لیے سپرنگ کو ایک دفعہ دبایا جاتا ہے، پھر اوپر اچھلا جاتا ہے، اسی طرح پہلے رکوع میں جھکا جاتا ہے پھر جھٹکے سے اوپر اٹھا جاتا ہے۔ اور اٹھتے ہی دونوں ہاتھوں سے پچھلے دامن کو سیدھا کیا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جس میں دونوں ہاتھ استعمال ہو جائیں تو نماز میں کراہت آجاتی ہے۔ اور یہاں تو یہ حرکت شاید عام ہے۔ سجدے میں جاتے ہوئے دامن کو باقاعدہ دونوں ہاتھوں سے سیدھا کیا جاتا ہے۔ جیسے استری کی جا رہی ہو۔ پھر دامن کو نیچے جاتے ہوئے باقاعدہ گھٹنوں پر پھیلایا جاتا ہے کہ کہیں سجدے کے

دوران دامن ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ سجدے کے دوران پاؤں سیدھے کھڑے ہوں۔ بے شک اسی طرح ہوتے ہیں لیکن سجدے سے جلسہ کی حالت میں آتے ہوئے اور پھر سجدے کی طرف جاتے ہوئے پاؤں کی حرکت یوں ہو جاتی ہے کہ زمین سے اٹھ جاتے ہیں۔ اور جب زمین سے پاؤں اٹھ گئے اور انکے نیچے سے ہوا کا گزر ہو گیا تو نماز میں فرق آگیا۔ سجدے میں بھی رکوع کی سی حالت یعنی کمر سیدھی ہو۔ رکوع اور سجدے کمر کا سیدھا ہونا یوں ہے کہ اگر کمر پر پانی سے بھرا پیالہ رکھا جائے تو وہ نہ گرے۔ یہاں سجدے میں کولہوں کو تو اٹھایا جاتا ہے لیکن ناف سے لیکر چھاتی تک یوں سجدہ کیا جاتا ہے کہ چھاتی زمین سے ملتی دکھائی دیتی ہے۔اس کے بعد اگر تو زمین پر مٹی ہے تو ایک بار ہاتھوں سے اس کو صاف کرنا جائز ہے لیکن سجدے کی جگہ پر پھونک مارنا قطعاً جائز نہیں۔ اور یہاں ایک بار نہیں بلکہ بار بار پھونک ماری جاتی ہے اور وہ بھی کچی مٹی والی زمین پر نہیں بلکہ پلاسٹک یا قالین والی صفوں پر۔ کوئی کرے تو کیا کرے، کوئی جائے تو کہاں جائے۔ قعدہ کرتے ہوئے ہاتھوں کو گھٹنوں پر اس طرح رکھا جاتا ہے کہ انگلیاں سیدھی قبلہ کی طرف ہوں اور گھٹنوں سے آگے لٹکی ہوئی نہ نظر آئیں۔ اور سکون کی حالت میں ہوں۔ لیکن یہاں انگلیاں لٹکی ہوئی بھی ہوتی ہیں اور حرکت میں بھی ہوتی ہیں۔ میں اس حرکت کا ذکر نہیں کر رہا جو ایک انگلی کھڑی کرکے اشارہ کیا جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر خارش ہو رہی ہو گی یا ایک ہی ہاتھ اپنی جگہ رکھے رکھے دامن سے کھیل رہا ہو گا۔

قیام کی مانند اپنی داڑھی سے کھیلا جا رہا ہوگا۔ داڑھی کو سنوارا جا رہا ہوگا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی بہت ضروری ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ساری عمر سر پر عمامہ مبارک رکھا۔ اور نماز کے اوقات میں تو خاص طور ہمیشہ سر کو عمامہ مبارک سے ڈھانپا ہوتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو اسے سنتِ مؤکدہ کہا جائے گا۔ علمائے کرام بہتر بتائیں گے۔ ہم سر کو تو نہیں ڈھانپتے۔ چلیں کوئی بات نہیں۔ البتہ کم از کم نماز میں تو سر کو ڈھانپنا چاہیے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ نمازیوں کی اکثریت کے سر ننگے ہوتے ہیں۔ جب قریب میں ٹوپی موجود نہیں تو شائد علمائے کرام، مفتی صاحبان اجتہادی فیصلہ دے دیں کہ کبھی کبھار نماز ہو جائے گی۔ لیکن اس کو عادت نہ بنایا جائے۔ مقتدی کی حدتک تو میرا دل بھی گوارا کرتا ہے کہ مجبوری کی حالت میں (جب ٹوپی موجود نہ ہو) تو بنا سر ڈھانپے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر امام بنا سر ڈھانپے نماز پڑھائے تو دل کیسے گوارا کرے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔ اوپر سے وہ امام جو سورتوں کی ترتیب بھی آگے پیچھے کر دیتا ہو۔ یعنی پہلی رکعت میں مثال کے طور پر سورۃ الفلق اور دوسری رکعت میں سورۃ الفیل پڑھائے۔ ہو سکتا ہے نماز ہو جاتی ہو، لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ یہ جو کچھ میں نے تحریر کیا، میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ ہو سکتا ہے غلط ہو، لیکن کافی لوگ اگر غور کریں تو مندرجہ بالا ساری غلطیاں نہ سہی تو ایک آدھ تو ان سے انجانے میں سرزد ہو ہی جاتی ہو گی۔ تو کوشش کریں کہ ان غلطیوں سے اپنی

نمازوں کو پاک کریں، تاکہ دلوں کو، روح کو، جسم کو سکون نصیب ہو۔ جہاں تک باطنی خشوع کا تعلق ہے تو وہ اسطرح ہونا چاہیے کہ دل و دماغ میں کسی بھی قسم کا خیال نہ ہو سوائے اس بات کے کہ نماز اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کے لیے ادا کی جا رہی ہے۔ اور یہ سمجھ کر نماز پڑھی جائے کہ مبادا یہ آخری نماز ہو۔ اس پر ان شاء اللہ پھر لکھوں گا، لیکن علماء کرام سے پوری تفصیل لے کر۔ کیونکہ یہ ایک نازک موضوع ہے۔ اللہ پاک ہمیں اپنی عبادات کو انکی اصلی روح کے مطابق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

نیٹ کے منہ بولے رشتے

کیا آپ کا کبھی کنجوس لوگوں سے پالا پڑا ہے؟ خاص طور پر منہ بولے کنجوس رشتہ داروں سے۔ اور مزید خاص طور پر جو لاسلکی ذرائع سے بنے ہوں۔ ارے حیران کیوں ہو گئے آپ لوگ۔ یقیناً پڑا ہو گا اور بڑے بڑے مہا طرم خانوں سے پڑا ہو گا۔ لیکن میں جن کا ذکرِ خیر کرنے جا رہا ہوں، اب آپ واقعی پریشان ہو جائیں گے کہ یہ ذکر کرنے کی کیا سوجھی۔ لیکن آپ جب سنیں گے یا پڑھیں گے تو آپ بھی کہیں گے کہ واہ ابنِ نیاز کیا لکھا ہے اور کیا ذکر کیا ہے۔ ویسے ان کا ذکرِ خیر کرنے کا ایک مقصد دنیا کو ایسے لوگوں سے دور رکھنا ہے تا کہ وہ اپنے ارد گرد ایسے لوگوں سے ہوشیار رہیں۔ اور نہ تو ایسے افراد سے کوئی رابطہ رکھیں اور نہ ہی کوئی میل جول۔ بلکہ بہتر ہو گا کہ ان سے کبھی بھی خاص طور پر انکی خوشی میں کوئی دعوت، یا چیز نہ طلب کریں، جس کا عام طور پر مطلب یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے آپ کو اپنی خوشی میں شامل کیا ہے۔ جب آپ انھیں لفٹ نہیں کرائیں گے تو شاید ان کو شرم آجائے اور وہ کنجوسی چھوڑ دیں، ورنہ تو وہ کہتے ہیں کہ ان کو شرم تو آتی ہے لیکن پاس سے گزر کر چلی جاتی ہے۔

منہ بولے رشتوں کی ویسے تو کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اگر کوئی نبھانا چاہے تو کافی دور تک نبھائے جا سکتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ منہ بولے رشتوں کو اہمیت کوئی بھی نہیں۔ کیونکہ رسولِ پاک ﷺ نے حضرت زید بن حارثؓ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا، لیکن اللہ پاک نے قرآن میں واضح کر دیا کہ حضرت محمد ﷺ کسی بھی مرد کے باپ نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔ الاخیر۔ تو اگر ایک نبی کو اللہ کا یہ حکم ہے تو ہم تو اس نبی پاک ﷺ کے ماننے والے ہیں، ہمارے لیے تو یہ حکم بہت واضح ہے کہ آپ جتنے بھی منہ بولے رشتے بنالو، اسکی حیثیت کوئی نہیں۔ ہاں لڑکوں کی لڑکوں سے دوستی ہو سکتی ہے، لڑکیوں کی لڑکیوں سے دوستی۔ لیکن صنفِ مخالف سے اس طرح کے رشتے قائم کرنا صرف منہ سے ہی ہوتا ہے، جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ کوئی لاکھ کہے کہ آپ نے تو بھائی کہا تھا، بہن کہا تھا، بیٹا، بیٹی بنایا تھا۔ وہ آپس میں اسی طرح نامحرم ہی رہتے ہیں۔ یہی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا حکم ہے۔ اور اس سے روگردانی کرنے والا گویا اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا انکاری ہے۔

نیٹ کی دنیا بھی ایک ایسی ہی دنیا ہے جہاں منہ بولے رشتے بنتے رہتے ہیں اور ان رشتوں کو وجہ سے جہاں اگر ایک طرف بے حیائی جنم لیتی ہے تو دوسری طرف کچھ رشتے بھی بنتے ہیں۔ بے حیائی تو اللہ معاف کرے، بہت دور تک جاتی ہے، اور اکثریت کو اگر گھر کی طرف سے سختی نہ ہو، آزادی میسر ہو، تو پھر اللہ ہی عزت

وآبرو کی حفاظت کرے تو بچت ممکن ہو، ورنہ گھر کے گھر تباہ ہو جائیں۔ اور دوسری طرف اسی نیٹ کی دنیا میں منہ بولے رشتے لاسلکی طور پر نبھائے بھی جاتے ہیں۔ کوئی بہن بنتی ہے تو کوئی بھائی بن کر بھائی کا رشتے کی لاج رکھتا ہے۔ کوئی انکل بنتا ہے تو کوئی بھتیجی، بھتیجا بن کر انکل کو نخرے دکھاتا ہے۔ اگر ان میں اچھا انکل بھتیجے، بھتیجی کا رشتہ بن جائے توانکل کے دماغ کی دہی بنانے میں ان کو ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گھر میں امی ابو تو اس طرح لفٹ نہیں کراتے جو لاسلکی انکل کراتے ہیں۔

اسی طرح منہ بولی بہنیں بھائیوں کے سر پر چڑھ کر ان سے مختلف معلومات لیتی رہتی ہیں۔ ان کو مختلف کاموں کے لیے تنگ کرتی رہتی ہیں جو کہ نیٹ سے ہی متعلق ہوتا ہے۔ اور لڑکیاں بے چاری اپنی سادگی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے لڑکے کو اپنا بھائی کہتی رہتی ہیں اور بھائی کے دل میں چور ہوتا ہے، وہ لڑکی کو صرف لڑکی سمجھ کر اس کا کام کرتا ہے کہ شاید کبھی ہنس جائے۔ کیونکہ وہ جملہ اسکے ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے کہ جو ہنسی تو وہ پھنسی۔ خیر یہ تو ایک بات ہو گئی۔ لیکن کچھ افراد پر اللہ کا کرم ہوتا ہے اور وہ بھائی بن کر ہی رہتے ہیں۔ ان کے دل میں بھی چور کی گرہ ضرور پڑتی ہوگی، لیکن اپنے نفس پر قابو کرتے ہوئے وہ منہ بولی بہن کو بہن ہی سمجھتے ہیں۔ مختلف مواقع پر ان سے اسی طرح فرمائش کرتے ہیں جس طرح کوئی سگا بھائی اپنی سگی بہن سے

فرمائش کرتا ہے۔ جیسے کھانے کی کسی ڈش کی فرمائش دھر دی کہ ہم تو تب مانیں گے جاب بہن ہمیں فلاں ڈش بنا کر بھیجے گی۔ اور ہم چٹخارہ لے کر کھائیں گے۔ پھر بتائیں گے کہ بہن کے ہاتھ میں زیادہ لذت ہے یا آنٹی کے ہاتھ میں۔ لذت جس کے ہاتھ میں بھی ہو، آپ جتنا بھی اپنے نفس پر قابو پائیں، لیکن پھر وہی بات کہ اللہ کا اور اسکے رسول پاک ﷺ کا حکم افضل ہے۔

جو شروع میں ذکر کیا گیا تھا کنجوس لوگوں کا تو اس مندرجہ بالا گفتگو میں کنجوسی کی بات یہ ہے کہ جب یہ بھتیجیاں یا بہنیں کبھی انکل یا بھائی کی طرف سے کسی فرمائش کے چکر میں پڑتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی سخی ہیں۔ ان کو بھی علم ہوتا ہے کہ وہ لاسلکی بھتیجیاں ہیں، بہنیں ہیں، اسلیے فرمائش کو پوری کرنے کے لیے حامی بھرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسلیے وہ دھڑلے سے کہہ دیتی ہیں کہ جی بالکل انکل جی۔ جب آپ کہیں، آپ کو سپیشل ڈش مل جائے گی۔ اور پھر دو دن کے لیے پردہ سکرین سے غائب ہو جاتی ہیں کہ انکل کو بھول جائے گا تو پھر السلام علیکم بھائی کی آواز لگائیں گی۔ لیکن یہ جو انکل ٹائپ کی چیزیں ہوتی ہیں نا، یہ نا تو خود کنجوس ہوتے ہیں اور نہ ایسی بھتیجی رکھتے ہیں جو کنجوس ہوں۔ یہ کھانے پینے کی چیزیں کا ذکر پڑھ کر قارئین کرام آپ کے منہ میں پانی آرہا ہوگا، لیکن مجبوری ہے کہ میں اس وقت ایک ایسی ہی مرحلے سے گزر رہا ہوں کہ دو عدد لاسلکی بھتیجیاں گزشتہ ماہ بیپر دے کر ماشاء اللہ

پاس ہوئیں۔ ایک نے تو شاید اپنی کلاس کو ٹاپ کیا۔ اور دوسری بھتیجی نے بھی اچھے مارکس لیے۔ دونوں نے وعدہ کیا تھا کہ انکل کو مٹھائی کھلائیں گی۔ میں بھی خوش کہ چلو لاسلکی طور سہی، مٹھائی کوئی تو بھیجے گا، ورنہ مجھے مٹھائی کا کوئی نہیں پوچھتا کہ پوچھنے والا پھر پچھتاتا ہے کہ کیوں پوچھا۔ یہ پچھتاوا اسلیے ہوتا ہے کہ اپنا دو، تین رس گلوں، یا گلاب جامن سے جی نہیں بھرتا، جب تک ایک آدھ ڈبہ پورا نہ ہضم ہو جائے۔

اب ہوا یوں کہ ان دونوں نے حامی بھر لی تھی کہ مٹھائی کھلائیں گی۔ اب نتیجہ آیا اور انھوں نے مجھ سے گلہ کیا کہ میں نے ان کا رزلٹ تک نہیں پوچھا۔ تو میں نے کہا کہ یہ تو ان کا کام تھا کہ مٹھائی کا ڈبہ لے کر انکل کی خدمت میں حاضر ہوتیں کہ یہ انکل ہمارے پاس ہونے کی خوشی میں مٹھائی کا پانچ کلو کا ڈبہ حاضر ہے۔ الٹا انھوں نے شکایت کر ڈالی۔ کمال ہے ویسے۔ خیر میں نے ان کا گلہ ٹالا۔ اور مٹھائی مٹھائی کی رٹ لگائی۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ لیکن انھیں طریقہ بتایا جائے کہ وہ کس طرح بھیجیں۔ میں نے کہا کہ میں تو کھانے والا بندہ ہوں، یہ ان کا دردِ سر ہے کہ وہ کیسے بھیجتی ہیں۔ ایک نے تو کہہ دیا کہ انکل اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں تو وہ ابھی ہمارے بھائی یعنی اپنے ابو کو کہہ کر بھجوا دیتی ہیں، میں اسے پتہ لکھوا دوں۔ اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ جب کہ دوسری بھتیجی اس تحریر کے لکھنے تک ٹال رہی ہے۔ یعنی

کنجوس۔ اور ایسی کنجوس کہ نیٹ پر بھی حامی نہیں بھر سکتی۔ آخر میں نے کیا کر لینا تھا۔ کیا واقعی میں نے مٹھائی کھا لینی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کیا کہ نیٹ کی دنیا کی بھتیجی سے حقیقت میں مٹھائی کھانا ناممکن حد تک مشکل کام ہے۔ اللہ اسے بھی خوش رکھے، چاہے ہمیں مٹھائی ملے یا نہ ملے۔

دوسری طرف ایک عدد منہ بولی بہن بھی ہے، اس کا کہنا ہے کہ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہے، تو میں نے کہا کہ میں کیسے مان جاؤں کہ وہ واقعی سچ کہہ رہی ہے۔ کہنے لگی کہ وہ جب بھی پکاتی تو ہر کھانے والا انگلیاں چاٹ کر رہ جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ ظاہر ہے وہ پریشان ہو جاتے ہیں کہ یہ انگلیوں پر کس قسم کا ذائقہ لگ گیا ہے، فوراً سے پہلے صاف کر لینا چاہیے۔ ناراض ہو گئی۔ میں نے کہا اچھا ٹھیک ہے۔ اگر واقعی سچ ہے تو پھر مجھے کھانا کھلانا پڑے گا۔ اس نے جھٹ سے حامی بھر لی۔ کہنے لگی بھیا، آپ کو ضرور کھلاؤں گی۔ آپ ہمارے گھر آئیں، امی ابو سے بھی ملیں، وہ بھی خوش ہوں گے۔ اور وہ اپنے ہاتھ سے پکائیں گی۔ پھر بتایئے گا کہ کھانا کیسا تھا۔ یعنی اس نے حاتم طائی کی سخاوت کو بھی مات دے دی۔

اب کوئی کنجوس ہو یا سخی۔ لیکن نیٹ کی دنیا کے یہ رشتے درحقیقت منہ بولے بھی صرف اس حد تک ہوتے ہیں جب تک وہ آمنے سامنے نہیں ہو جاتے۔ یہ دنیا ہوس

کی دنیا ہے۔ مطلب کی دنیا ہے۔ یہاں اپنا اپنا نہیں ہوتا تو پرایا کیا اپنا ہو گا۔ ہر کوئی مطلب نکالنے کے چکر میں ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بات کہ لڑکی اور لڑکے کی آپس میں بات چیت ہو گئی۔ بے شک منہ بولا بھائی بہن کا رشتہ بن گیا۔ لیکن اسلام کے قوانین میں، اسلام کے اصولوں کے مطابق اصل رشتہ ماں جائی بہن بھائی کا ہی ہوتا ہے۔ ہاں رضاعی بہن بھائی کا رشتہ بھی اصل کی طرح ہی ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ سارے بہن بھائی کے رشتے بس نام کے ہوتے ہیں۔ جب کوئی بہن کسی منہ بولے بھائی پر اعتبار کر کے اس سے اکیلے میں ملنے جاتی ہے تو وہ کیا سوچ کر جاتی ہے کہ وہ اسکا سگا بھائی ہے۔ نہ کبھی نہیں۔ یہ غلط فہمی دل سے نکال دینی چاہیے۔ نہ لاسکی رشتے کبھی بنتے ہیں اور نہ ہی کبھی ان میں سچ ہوتا ہے۔ لاکھ قسمیں کھائی جائیں، لاکھ ضمانتیں دلوائی جائیں، لاکھ کوئی کسی کے صدق کی گواہی دے، جب اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے کہہ دیا کہ منہ بولے رشتے کی کوئی حیثیت نہیں، تو ہم کون ہوتی ہیں ان رشتوں کو سچا کہنے والے۔

اقراء۔ پڑھ

اللہ پاک بھی پڑھنے پڑھانے کو پسند فرماتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں اپنے پیارے محبوب مصطفیٰ ﷺ سے کہ آپ بس پڑھتے جائیں۔ اس کو یاد کرنے کی خاطر تیزی سے زبان نہ ہلائیں۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ آپ کے دل و دماغ میں اس طرح سے کلام کو بٹھا دیں گے کہ رہتی دنیا تک آپ کی پیروی کی جائے گی۔ پھر یہ کلام بار بار پڑھا جائے گا۔ اللہ پاک نے جو پہلا لفظ نازل کیا "اقراء" پڑھ۔ بظاہر تو یہ ہمارے نبی پاک ﷺ کو حکم ہے کہ اسکے بعد جو کچھ بھی آپ پر اتارا جائے گا اس کو پڑھیں۔ لیکن اس ایک لفظ "اقراء" میں ایک سمندر پنہاں ہے۔ یہ صرف پڑھ کے معنوں میں ہی نہیں آتا بلکہ پڑھنے کے بعد مزید پڑھا ہی تو نہیں جاتا۔ جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کو سمجھا بھی جاتا ہے۔ جب سمجھا جاتا ہے تو پھر اس پر غور کیا جاتا ہے کہ اس کا ہماری زندگی کے کسی بھی حصے میں کہیں عمل دخل تو نہیں۔ کہیں زندگی گزارنے کے کسی اصول کا حصہ تو نہیں۔ کہیں ہمارے آنے والے کل سے متعلق تو نہیں۔ کہیں ہمارے ماضی سے اسکا کوئی رابطہ تو نہیں رہا۔ کہیں ہمارے متعلقین کے بارے میں تو ہمیں اشارہ نہیں دیا جارہا ۔ کہیں یہ پڑھی گئی چیز زندگی کے کسی بھی مرحلے میں شامل تو نہیں ہونے والی۔ کہیں ہمارے ملنے جلنے والے افراد میں سے کسی کی زندگی کا کوئی معمولی سا حصہ تو نہیں جو ہمارے سامنے بنا اسکا نام

پتہ بتائے آشکارا کیا جا رہا ہے۔

پڑھنے کا حکم بظاہر تو اللہ پاک نے اس وقت کلام پاک کے لیے دیا۔ لیکن ظاہر ہے اسی کلام پاک میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ جو ہم نے نازل کیا ہے، ہے کوئی اس کو سمجھنے والا، اس پر غور و فکر کرنے والا۔ تو قارئین، جب اس کلامِ پاک پر غور کیا جاتا ہے تو مزید معانی نکلتے ہیں۔ ان معانی کو ہم اپنے الفاظ میں سموتے ہوئے ان کے موتی بنتے ہیں، اور ان موتیوں کو ہم صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ اور جب یہ قرطاسِ ابیض سے قرطاسِ سیاہ ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ واقعی یہ کتاب پڑھنے کے لائق تھی۔ پڑھنا بہت آسان ہے۔ جس شخص نے قرآن پاک پڑھنا سیکھا، جس کے لیے ابتدا نورانی قاعدہ سے کرائی جاتی ہے۔ تو پڑھنے کے لیے یہ کم سے کم تعلیم ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ پوری کی پوری کتاب پڑھ لے گا، البتہ جو مشکل الفاظ، خاص طور پر فارسی یا عربی تراکیب استعمال کی گئی ہوں گی، ان کے معنی اس کو شاید سمجھ نہ آئیں۔ لیکن اگر قاری تھوڑی سی ذہانت کا بھی حامل ہے تو اس لفظ کے سیاق و سباق سے وہ اس مشکل لفظ کے معنی بھی اخذ کر سکتا ہے یا کم از کم اس کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔

علامہ اقبال رحمہ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے۔۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا ـــ

لیا جائے گا کام تجھ سے دنیا کی امامت کا

یہاں بھی ذکر پڑھنے کا ہے۔ لیکن اب یہ کونسا پڑھنا ہے، تو یہ وہ سبق ہے جو حضرت ابو بکر صدیقؓ سے شروع ہوتا ہے، حضرت عمرؓ سے ہوتا ہوا حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ جب ان ساری خصوصیات کا سبق کوئی پڑھ لیتا ہے، پھر ان کو ازبر کر لیتا ہے، پھر اپنی زندگی پر لاگو کر لیتا ہے تو پھر اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔۔۔ کہ عشق اس کے سر پر یوں سوار ہو جاتا ہے کہ وہ بس اپنے آپ میں مگن ہو کر اللہ کے دین کی خاطر اپنی جان ، مال ، دھن دولت قربان کر دیتا ہے۔بنیادی بات پڑھنے کی ہے۔ جو جس طرح کا سبق پڑھتا ہے اور اس کو اپنی زندگی میں شامل کرتا ہے، اسی طرح اس کی زندگی سنورتی ہے یا بگڑتی ہے۔

اسی طرح کی صورت حال تعلیم کے معاملے میں بھی پیش آتی ہے۔ اساتذہ کرام جب بچوں کو پڑھاتے ہیں، سکھاتے ہیں، جس طرح سکھاتے ہیں، بچہ بھی اسی طرح پڑھتا ہے، سیکھتا ہے۔اور سیکھتے سیکھتے وہ بڑا ہو جاتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ اگر اس تعلیم کے ساتھ اس کو گھر کا ماحول بھی اچھا ملے، یار دوست اچھے ملیں تو وہ ایک کامیاب انسان بنتا ہے۔ یہ کامیابی دنیوی بھی ہوتی ہے اور دنیاوی بھی۔ قائدِ اعظم کا فرمان، کام، کام ، اور بس کام بھی تب ہی کام آتا ہے، جب شاگرد کی پڑھائی ٹھیک ہوتی ہے۔ کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی تربیت کی

جاتی ہے، وہ بھی گویا پڑھائی کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ پھر اس کی جسمانی تربیت کی جاتی ہے، گویا جسم کو روح کے تابع کرنے کے گر پڑھائے جاتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے بتانا، ایک ہوتا ہے پڑھانا۔ دونوں میں بظاہر معمولی سا فرق نظر آتا ہے۔ لیکن بتانے میں گویا اس کو اطلاع دی جاتی ہے، آگے اس کی مرضی کہ وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دے۔ جب کہ پڑھانے میں جب تک وہ پڑھائی ہوئی چیز کو لاگو نہیں کرلیتا، اس کو رٹ نہیں لیتا، اس کو استاد کو باقاعدہ سیکھ کر نہیں دکھاتا، تب تک استاد اس کو اسی سبق پر لٹکا کر رکھتا ہے۔

نصابی پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی پڑھائی بھی ہوتی ہے۔ اپنی سکول، کالج، یونیورسٹی کی کتابوں کے علاوہ بھی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، پڑھی جاتی ہیں۔ کچھ میں اساتذہ کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ قاری خود ہی پڑھ کر سمجھ لیتا ہے۔ مسلہ صرف وہاں پیش آتا ہے جب اس کو ایک ہی عنوان پر دو یا زیادہ مختلف کتابیں پڑھنے کو ملتی ہیں اور ان میں لکھی گئی تحریریں آپس میں مطابقت نہیں رکھتیں۔ تو ایسے میں اس طالب علم کو جو سیکھنے کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے، اس کا دل و دماغ میں انتشار پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ کہ اب وہ کس کو درست سمجھے اور کس کو غلط۔ کیونکہ اگر وہ طالب علم ہے اور اسکو کوئی اسائنمنٹ ملی ہوئی ہے تو ظاہر ہے اس نے اس وقت تو دونوں کا حوالہ دے دینا ہے لیکن نقطہ نظر یا نتیجہ بھی ضرور لکھنا ہوتا ہے۔ تو ایسے میں اس طالب کا

کیا حال ہوتا ہے گا جب وہ تین میں رہتا ہو گا نہ تیرہ میں۔ چلیں یہ تو ایک بات ہو گئی۔ بات ہو رہی تھی پڑھائی کی۔ آج کل جو صورتحال ہے وہ اتنی گھمبیر ہے کہ مجلد کتاب سے پڑھنے کی طرف ملا جلا رجحان ہے۔ کیونکہ کتابوں کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ جب کہ کتاب شائع ہونے کے مرحلے سے گزر کر اس دکان تک پہنچتی ہے جہاں سے قاری نے خریدنی ہوتی ہے تو ایک تین سو صفحات کی کتاب پر جس کی ایک ہزار جلدیں شائع کی گئی ہوں، زیادہ سے زیادہ خرچہ ایک سو روپے آتا ہے۔ جس میں کاغذ کی قیمت، کمپوزنگ، پرنٹنگ، جلد بندی، کرایہ وغیرہ شامل ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے ڈسٹری بیوٹر کہتا ہے کہ اس کو بھی کم از کم فی کتاب پچاس روپیہ ضروری ہے۔ دکاندار کہتا ہے کہ وہ بھی پچاس روپے تو رکھے گا۔ اور مصنف کا تو ویسے بھی حق بنتا ہے کہ ساری محنت اسکی ہے۔ اسی نے ہی قارئین تک اپنے الفاظ پہنچانے کے لیے تو دن رات ایک کیے ہیں۔ تو فی کتاب پچاس روپے وہ بھی رکھتا ہے۔ مصنف کو یہ رقم کچھ پبلشر اس طرح ادا کرتے ہیں اور کچھ یک مشت ادائیگی کر کے جملہ حقوق اپنے پاس رکھ لیتے ہیں کہ اس کے بعد اس کے جتنے بھی ایڈیشن پبلش ہوں، وہ آمدنی پبلشر کی ہو گی۔ اب مذکورہ بالا اخراجات ڈال کر اڑھائی سو روپے بن جاتی ہیں۔ لیکن ہوتا کیا ہے کہ وہ کتاب کم از کم پانچ سو روپے کی ہوتی ہے۔ جس میں سے چند دکاندار دس سے پچیس فیصد ڈسکاؤنٹ کر کے کتاب فروخت کرتے ہیں۔ پھر بھی تین سو پچھتّر سے چار سو کی کتاب خریدنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو میں نے ان

مصنفین کی بات کی ہے جو ابھی زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ ورنہ تارڑ صاحب کی کتاب خریدنا جوئے شیئر لانے کے برابر ہے۔ یا پھر وہ کتاب جو کسی سال میں بیسٹ سیلر بن چکی ہو، اور اتفاق سے وہ قسط وار کسی ڈائجسٹ میں شائع بھی ہو چکی ہو۔ ان اقساط سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر وہ کتاب کتابی صورت میں سامنے آئی تو ریکارڈ توڑ سکتی ہے۔ تو اس کتاب کی قیمت بھی صفحات کی نسبت دوگنی ہوتی ہے۔

پبلشر سے پوچھا جاتا ہے تو ان سارے قصوں کے ساتھ وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ جناب آپ نے حکومتِ وقت کے ٹیکس تو شمار کیے ہی نہیں۔ ہم نے بھی ٹیکس دینا ہوتا ہے، ڈسٹری بیوٹر نے بھی اور دکاندار نے بھی۔ تو کم از کم ایک سو روپیہ ان سب کی طرف سے ٹیکسوں کی مد میں بھی ڈال دیں۔ اب کوئی بتائے کہ ہم پڑھیں کیا اور سیکھیں کیا۔ پاکستان میں کاغذ بن نہیں سکتا کہ یہاں کارخانوں کو چلانے کے لیے بجلی چاہیے، گیس چاہیے، جو کہ کمیاب نہیں بلکہ نایاب ہے۔ اس لیے کاغذ باہر سے امپورٹ کیا جاتا ہے اور امپورٹ پر ڈیوٹی ہے، بہت سے ٹیکسز ہیں۔ اربابِ اختیار سے بس اتنی سی گزارش ہے کہ کاغذ پر ڈیوٹی کی شرح کم کر دیں بلکہ نہ ہو تو بہتر ہے کہ بعد میں بھی تو پبلشر سے لے کر دکاندار تک ٹیکسز تو دیتے ہی ہیں۔ یعنی ایک کتاب پر جس کی کل قیمت ایک سو روپے ہوتی ہے اس کو قاری کے ہاتھ تک پہنچے تک اس پر سو فیصد ٹیکس بنتا ہے۔ یہی مختصر سی

گزارش ہے کہ قیمتیں کتابوں کی کم ہوں گی تو قارئین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا اور
کاپی رائیٹ کا مسلہ بھی کافی حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔

خالی دماغ شیطان کا کارخانہ

انگریزی کی ایک ضرب المثل کا ترجمہ اردو میں یوں کیا جاتا ہے کہ خالی دماغ شیطان کا کارخانہ ہے۔ مجھے تو یہ بھی سمجھ نہیں آئی کہ خالی دماغ سے مراد کیا ہے؟ خالی سر تو سنا ہے کہ جہاں دماغ کی بجائے بھوسہ بھرا ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ یعنی ایسی حالت میں کہ کسی کو کوئی بات بار بار سمجھانے کے باوجود سمجھ ہی نہ آئے، جب کوئی عقل کی بات نہ کرے، کسی دلیل کو نہ سمجھے، بس اپنی ہی کہے جائے تو اسکے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اسکی کھوپڑی میں نرا بھوسہ بھرا ہوا ہے یا اسکا سر عقل سے خالی ہے۔
اب دماغ خالی ہونا سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ کوئی بنا کسی سوچ کے، کسی خیال کے بس خالی الذہن ہو کر بیٹھا ہے تو شاید ٹھیک ہو۔ لیکن ایسا دماغ شیطان کا کارخانہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا ہمہ وقت یا زیادہ وقت خالی رہنے سے شیطان وہاں آ کر عبادت شروع کر دیتا ہے؟ یا انسان ایسے کاموں میں ملوث ہو جاتا ہے جو شیطان کو پسند ہیں یعنی جن کے کرنے پر خدا کی ناراضگی ہو سکتی ہے اور شیطان کو خوشی۔ بظاہر تو یہ معنی ہی نظر آتا ہے۔اس لحاظ سے جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے یہ ضرب المثل اس شخص کے لیے موزوں ہے جسکی پرورش منفی

ماحول میں ہوئی ہو یا اسکو گھر سے تو مثبت رجحان ملتا ہو لیکن گھر سے باہر اسکی اٹھک بیٹھک منفی سوچ کے حامی لوگوں میں ہو۔ گھر میں اسکو اچھی باتیں سکھائی تو گئی ہوں لیکن ان پر عمل درآمد کا عملی طریقے سے نہ بتایا گیا ہو۔ ایسا شخص آسانی سے دوسروں کے بہکاوے میں آ سکتا ہے۔ چاہے بہکانے والا جن شیطان ہو یا انسان کے بھیس میں چھپا شیطان۔

خالی دماغ والا انسان بہت خطرناک حد تک ذہن ہو سکتا ہے۔ ایسے ایسے منصوبے بناتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس دنیا پر اپنی نبی پاک ﷺ کے صدقے خاص نظر کرم نہ ہو تو اس شخص کے بنائے ہوئے منصوبے، اسکی سازشیں دنیا کا نظام ہی تہہ و بالا کر دیں۔ اسکی ایک چھوٹی سی مثال 11 ستمبر 2001 کو ہونے والا دہشتگردی کا واقعہ ہی لے لیں۔ اس پورے منصوبے کا خالق یا کم از کم آئیڈیا دینے والا صرف ایک شخص تھا جو اس وقت جائے حادثہ سے ہزاروں میل دور بیٹھا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک مسلمان ملک کی مومن حکومت کھٹکتی تھی۔ ذرا شیطان کے کارخانے میں بننے والے اس منصوبے کے نتائج پر غور کریں جو آج سب کے سامنے ہیں۔

اصل میں انگریز اور پھر غیر مسلموں نے ہی اس ضرب المثل کو شیطان سے جوڑا ہے۔ کیونکہ غیر مسلم کبھی بھی کم از کم مسلمانوں کے حق میں مثبت سوچ رکھ ہی

نہیں سکتے۔اسی لیے تو انکا خالی دماغ شیطان کا کارخانہ ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جیسا کہ وہ تھا۔ وہ بھی تو ایک انگریز ہی تھا۔ جو ایک دن بنا کسی سوچ، کسی خیال کے بیٹھا ہوا تھا۔ پانی کی ابلتی ہوئی کیتلی یا دیگچی پر نظر پڑی۔ بھاپ کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ معلوم نہیں کیا ذہن میں آیا، اس برتن کے اوپر دو تین وزنی پتھر رکھ ڈالے کہ بھاپ کو نکلنے سے روک سکے۔ لیکن بھاپ اپنے دباؤ پر وقفے وقفے سے ان پتھروں کو بہت معمولی ہی سہی، اچھال کر باہر نکلتی رہی۔ وہ دماغ بھی اس وقت خالی تھا۔ لیکن شیطان کا کارخانہ نہیں تھا۔ بس یہ بھاپ ہی تو دباؤ کے زور پر نکلتے دیکھی تھی۔ خیال آیا اور جڑ پکڑتا گیا اور نتیجہ جڑواں میناروں کی تباہی نہیں تھا۔ بلکہ ذرائع آمدورفت میں ایک بہترین ایجاد ریل گاڑی کا انجن تھا۔ جس کا مؤجد جارج سٹیفن سن تھا۔

خالی ذہن رکھنے والے تخلیق کار ہوتے ہیں۔ لیکن انکی تخلیق کیا ہوتی ہے اسکا دارومدار ان کے ماحول پر ہوتا ہے۔ اس خالی دماغ میں جو تخلیق کا آئیڈیا آئے گا وہ اسکی تربیت پر منحصر ہو گا۔ اگر تو وہ ایک بزنس مین ہے تو اپنے بزنس کو پھیلانے کے اور دن بدن ترقی دینے کے بارے میں سوچے گا۔ اور اگر ایماندار بھی ہے تو یہ بھی ذہن میں رکھے گا کہ عوام الناس کو بھی فائدہ حاصل ہو اور اسکو بھی نقصان نہ ہو۔ اگر کوئی سائنسدان ہے تو بھی دو ہی کام

ہوں گے۔ یا تو انسانیت کی فلاح کے لیے کچھ ایجاد کا سوچے گا یا پھر اسی انسانیت کی تباہی کے لیے ایٹم بم کی ایجاد کا۔

اکثر اوقات اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی بیٹھا ہوتا ہے اور دور پار خلا میں اسکی نظریں ساکت ہوتی ہیں۔ کوئی اور اسے دیکھتا ہے تو یہی اسکے ذہن میں آتا ہے کہ بہت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن ہوتا اسکے برعکس ہے۔ گہری سوچ تو دور کی بات، کوئی سوچ ہی نہیں ہوتی۔ بس کبھی کبھی بغیر کچھ سوچے ہی انسان دور چلا جاتا ہے۔ کوئی اس کے قریب آکر بیٹھ جائے، کوئی اسکو آواز دے اسکو پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ خالی الذہن ہونا بھی ایک قسم کا فائدہ ہی دیتا ہے کہ انسان کچھ دیر ہی سہی اپنی پریشانیوں سے جزوقتی نجات پا لیتا ہے۔ ایسی حالت تو اکثر انجانے میں ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ماہر نفسیات نے ہی کہا ہے کہ کبھی کبھی انسان کو خود بھی خالی ذہن رکھنا چاہیئے۔ آپکو کسی قسم کی بھی پریشانی ہے۔ کوئی مسئلہ ہے جسکا حل سمجھ میں نہیں آتا۔ یا پھر آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ زیادہ نہیں صرف دس منٹ کوشش کر کے دیکھیں۔ اپنے دماغ کو ہر قسم کے خیالات سے صاف رکھیں۔ کچھ بھی نہ سوچیں۔ یہاں تک کہ ہوا کا گزر بھی نہ ہو۔ جب اپنے ماحول میں واپس آئیں گے تو دماغ تر و تازہ ہو چکا ہو گا۔ تھوڑا سا سوچنے پر آپ کو اپنے مسئلے کا حل مل جائے گا۔ یا کم از کم اسکے حل کی راہ سوجھائی دے جائے گی۔ آپ کی ذہنی تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔ جسمانی تھکاوٹ

دور کرنے کے لیے نمک ملے نیم گرم سے نہانا ایک بہترین نسخہ ہے۔

اللہ سب کو ہر قسم کی پریشانیوں اور تکالیف سے نجات عطا فرمائے۔ اور ہمیں اپنی صلاحیتیں مثبت طریقے سے استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جواب دہ کون؟

کلم راعٍ و کلم مسئول عن رعیتہِ۔۔ تم میں سے ہر اک نگہبان ہے اور تم سے تمھاری رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ حدیثِ پاک کے یہ الفاظ اپنے اندر اک جہاں سموئے ہوئے ہیں۔ ہر اک نگہبان ہے۔ یعنی صرف حکمران ہی نہیں، کسی ادارے کا سر براہ ہی نہیں، بلکہ عمومی حکم ہے کہ ہر اک نگہبان ہے۔ ہر بندہ، ہر بشر۔ چاہے ملک کا سر براہ ہے، کسی ادارے کا سر براہ ہے، کسی گھر کا سر براہ ہے یا کسی بھی لحاظ سے وہ کسی جگہ کا بھی سر براہ ہے، وہ در حقیقت نگہبان ہے۔ اور جب سر براہ کے پاس اختیار ہوتا ہے تو گویا وہ پھر حاکمِ اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہو گا کہ اس کو جب یہ سر براہی دی گئی تھی اور اس کو اختیار دیا گیا تھا تو اس نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ان کے ساتھ کس قسم کا رویہ روا رکھا۔ آیا صرف حکم ہی جاری کرتا رہا، ان سے کام ہی کرواتا رہا یا پھر ان کے حقوق کا بھی خیال رکھا۔ کہیں انکے حقوق غضب تو نہیں کیے۔ ان کو غلط کام کرنے سے بھی روکا یا ان کو چھوڑ دیا کہ جو مرضی کریں، بشر طیکہ وہ ادارے کے لیے نقصان دہ نہ ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سر براہ کو صرف سر براہ ہی نہیں رہنے دیا۔ بلکہ حضرت عمر فاروقؓ کے بقول اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی قدرتی موت کی بجائے کسی اور طریقے سے مر گیا تو عمر سے مدینہ میں رہتے ہوئے بھی قیامت کے

دن اس کی پوچھ گچھ ہو گی۔ تو نہیں یہ ڈر ہے کہ وہ اس کا جواب نہ دیں سکیں گے۔ اب کوئی کہے کہ گیارہ لاکھ مربع میل کے علاقے پر اسلامی سلطنت پھیلی ہوئی ہے، کروڑوں کی تعداد میں افراد ہیں، حضرت عمرؓ کس کس کا خیال رکھیں گے، کس کس کی خبر گیری کریں گے۔ لیکن انہیں اس حدیث کا علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ رسول پاک ﷺ نے یہ الفاظ ایسے نہیں ادا کیے۔ یقیناً سربراہ صرف سربراہ نہیں ہوتا بلکہ نگہبان ہوتا ہے جیسا کہ چرواہا۔ راع بنیادی طور پر عربی میں چرواہے کو کہتے ہیں۔ جس طرح چرواہا بکریوں کا ہر لحاظ سے خیال رکھتا ہے کہ اس کی بکریاں اچھی طرح سے کھائیں پئیں، انہیں کوئی نقصان نہ ہو۔ وہ پرائی فصلوں، کھیتوں میں نہ گھومیں، اکٹھی رہ کر چراگاہ سے گھاس کھائیں۔ بکریاں بے شک زیادہ ہوں لیکن چرواہے کی نظر ان سب پر ہوتی ہے کہ کہیں وہ دور نہ چلی جائیں۔ غرض چرواہا ہر طرح ان کا خیال رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ان کی نگہبانی کرتا ہے۔ تو انسان کے لیے بھی رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے راع یعنی نگہبان کا لفظ استعمال کیا۔

جب بچے ہوتے ہیں تو والدین انکا بہت خیال کرتے ہیں۔ ان پر نظر رکھتے ہیں کہ کہیں وہ گر نہ جائیں، ان کو چوٹ نہ لگ جائے، وہ کوئی غلط چیز اٹھا کر منہ میں نہ ڈال لیں۔ ان کی تربیت کرتے ہیں کہ ایسے بیٹھیں، اس طرح کھائیں، اس طرح بات کریں، چلنا کیسے ہے، پھرنا کیسے ہے، کوئی مہمان آ جائے

تو کیا کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر جب وہ بچہ بڑا ہوتا ہے تو ان کو سکول کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ تو بچہ گھر والوں کی رعیت کے ساتھ ساتھ سکول کی رعیت میں بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اب اسکی تعلیمی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ اس کو سکھایا جاتا ہے کہ دنیا میں جینا کیسے ہے۔ اب اگر اسکو غلط رستہ دکھایا جائے اور بچہ اس رستے پر چل کر اپنی زندگی گزارے ذمہ دار کون ہوگا۔ یا بچے کو رستے دونوں دکھا دیے جائیں ان پر چلنے کے فائدے نقصانات بتا دیے جائیں، اور پھر بچے کو چھوڑ دیا جائے کہ اب وہ چلنا سیکھ چکا ہے۔ لیکن یہ چھوڑنا کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ بچے کو چھوڑ کر پھر اس کو دیکھا بھی جاتا ہے کہ آیا وہ سیدھے رستے پر چل رہا ہے یا غلط۔ اگر غلط رستے پر ہے تو اسکی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اس کو بتایا جاتا ہے کہ وہ غلط سمت میں جا رہا ہے۔ اس کو کبھی پیار سے، کبھی غصے سے، کبھی مار سے، ڈانٹ ڈپٹ سے سیدھے رستے کی طرف گامزن کیا جاتا ہے۔ کبھی سختی کی جاتی ہے۔ ہر ممکن طریقے سے اسے سیدھے رستے کی طرف ہی رکھا جاتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اگر کارخانۂ قدرت سے اس کے نصیب میں گمراہی کا سانچہ ڈھل کر نکلا ہوا ہو تو پھر یہ سارے طور طریقے علیحدہ علیحدہ یا مل کر بھی اسے صراطِ مستقیم پر نہیں چلا سکتے۔ پہلی صورت میں جب بچے کی رہنمائی نہ کی جائے تو قصوروار راعی ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ اپنے کیے پر خود ہی جواب دہ ہوتا ہے۔

کچھ ایسی ہی صورت حال ایک گھر میں بھی پیش آتی ہے۔ جب خاندان کا سربراہ اپنے زیردستوں کی خیر خواہی نہ کرے۔ ان کی صرف معاشی ضروریات پوری کرے۔ ان کو ابتدائی تعلیم یا دنیاوی تعلیم تو دلادی، دین میں بھی قرآن پڑھنا سکھا دیا، نماز پڑھنا سکھا دی۔ اٹھنا بیٹھنا سکھا دیا۔ لیکن زمانے کے ساتھ کس طرح چلنا ہے، کیسے چال چلن رکھنے ہیں کہ زمانہ مثال دے، یہ سب کچھ نہ ہوا اور زیردست سب اپنی اپنی مرضی سے زندگی گزارنے لگے تو پھر سربراہ مذکورہ بالا حدیث کے مطابق کس طرح جواب دے گا۔ بیٹا گھر سے باہر نکلتا ہے اور آوارہ گردی کرتا ہے۔ اسکے پاس کمپیوٹر ہے، لیپ ٹاپ ہے، موبائل ہے، ان کا غلط استعمال کرتا ہے اور باپ کو فکر ہی نہیں۔ اخلاق باختہ رسالے ہیں، حیا سوز میگزین ہیں۔ باپ نے کبھی خیال نہیں کیا کہ جب وہ کمرے میں جاتا ہے تو بیٹے کا رنگ کیوں فق ہو جاتا ہے۔ بیٹا رات کر دیر سے گھر آتا ہے اور بہانہ بناتا ہے کہ کالج، یونیورسٹی کے کلاس فیلو کے ساتھ سٹڈی کر رہا تھا۔ کبھی باپ نے چیک نہیں کیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ۔

دینِ اسلام کے مطابق ایک عورت گھر سے اکیلی باہر نہیں جا سکتی۔ تو باپ، بھائی بیٹی یا بہن کو کالج چھوڑنے آتے ہیں، اچھی بات ہے بلکہ قابلِ تحسین قدم ہے۔ لیکن کیا پھر باپ نے کبھی ہفتے میں ایک آدھ بار بھی چیک کیا کہ ان کی بیٹی کالج میں واقعی پڑھتی ہی ہے یا کلاس کے اوقات میں دوسری کلاس فیلوز

کے ساتھ کینٹین، کیفے میں وقت گزارتی ہے۔ یا آوارہ لڑکوں سے رکھی ہوئی ہے۔ کالج کی ایک روٹین ہوتی ہے۔ چار سے چھ گھنٹے کی کل کلاسز ہوتی ہیں۔ اگر اس کے علاوہ بیٹی وقت سے پہلے یا وقت کے بعد دیر سے گھر آتی ہے اور باپ نہیں پوچھتا تو بیٹی کو بھی فکر نہیں ہوتی ہے کہ وہ ماں باپ سے ذکر کرے۔ اگر کسی دن بہن، بیٹی کہتی ہے کہ آج وہ ایک کلاس فیلو لڑکی کے ساتھ کالج جائے گی اور اسی کے ساتھ واپس آئے گی اور باپ بھائی چیک نہیں کرتے کہ آیا لڑکی کلاس فیلو لڑکی کے ساتھ ہی گئی ہے اور سیدھی کالج ہی گئی ہے، کلاسز لی ہیں اور واپسی بھی اسی لڑکی کے ساتھ ہوئی ہے تو پھر بھی مسئلہ ہے۔ پہلے تو بیٹی کی روٹین ہی خراب نہیں کرنی چاہیے۔ جس طرح باپ بھائی اس کو کالج یونیورسٹی چھوڑ کر آتے ہیں اسی طرح چھوڑ کر آیا کریں، اگر کسی دن خدانخواستہ، دونوں مصروف ہیں تو کوئی ایسا حل نکالیں کہ دوسری بار یہ عمل دہرایا نہ جاسکے۔ میں باپ، بھائی کے ساتھ جانے میں اسلیے زور دے رہا ہوں کہ اس طرح لڑکی کی عزت بنی بھی رہتی ہے اور قائم بھی رہتی ہے۔ اور دوسری بات کہ کوئی بھی آوارہ، لوفر لڑکا اس بہن کی طرف شاید ہی ٹیڑی آنکھ سے دیکھنے کی جرات کرسکے۔ چہ جائیکہ اس کے ذہن میں اس کو چھیڑنے کا خیال آئے۔

کچھ شہروں میں لیٹ کلاسز ہوتی ہیں اور چھٹی عشاء کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ ایسے میں ان گناہ گر آنکھوں نے دیکھا ہے کہ نامحرم لڑکے لڑکیا ہاتھوں میں ہاتھ

ڈالے چل رہی ہوتی ہیں۔ آپس میں گھل مل کر باتیں کر رہی ہوتی ہیں۔ مزے کی بات تو یہ اکثر لڑکیاں پورے حجاب میں ہوتی ہیں لیکن شاید وہ گھر والوں کی طرف سے ان کے لیے سختی ہوتی ہے۔ مگر کیا حجاب میں رہتے ہوئے اس طرح چھٹی کے بعد نامحرم لڑکوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلنا کہاں کا چلتر ہے۔ باپ نے یونیورسٹی میں داخل کرا کر انہیں پھر پلٹ کر نہیں دیکھا کہ وہ کس وقت گھر آتی ہیں کس وقت گھر سے جاتی ہیں۔ بھائی نے کبھی خیال نہیں کیا کہ اس کی بہن یونیورسٹی سے نکل کر سیدھی گھر تو آتی ہے لیکن راستے میں کیا کیا گل کھلا کر آتی ہے۔ کیا باپ نے بحیثیت سربراہ بیٹی کو اسلام کی راہ نہیں سکھائی کہ بے حیائی کی راہ اختیار کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ کسی نامحرم لڑکے سے ہنس کر بات کر لو۔ نہ اس لڑکے کے باپ نے کبھی اس کو بتایا کہ کسی نامحرم کی طرف دیکھو گے تو مکافاتِ عمل کے تحت اسکی بہن کی طرف بھی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا بھی جا سکتا ہے اور ہاتھ بھی پکڑا جا سکتا ہے۔ اور جب بات دیکھنے سے بڑھتی ہے، ہاتھ پکڑنے تک پہنچتی ہے تو شیطان اس لمس کے احساس کو بہت خوبصورت کرکے پیش کرتا ہے۔ اور اس احساس کی رسی جب دراز ہوتی جاتی ہے تو ہوش اس وقت آتا ہے جب ہوش کھویا جا چکا ہوتا ہے۔

،باپ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دے

لیکن ان پر نظر بھی ضرور رکھے۔ باپ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کو اپنا وارث ضرور بنائے لیکن ان پر شیر کی نگاہ ہر دم رکھے کہ وہ پرائے بیٹیوں، بہو کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے تو نہیں دیکھ رہا۔ وہ کسی غلط کاموں میں ملوث تو نہیں ہے۔ وہ کہیں ملک کی سالمیت کے خلاف کسی سرگرمی میں شامل تو نہیں ہے۔ اسکا اٹھنا بیٹھنا کس قسم کے لوگوں کے درمیان ہے۔ کالج میں اسکی سنگت کس قسم کے لوگوں سے ہے۔ یہ سب گھر سے شروع ہوتا ہے اور گھر پر ہی ختم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر گھر سے اس کو بہترین تعلیم دی جائے گی، تربیت کی جائے گی، دنیا کی اونچ نیچ سے بیٹی، بیٹے کو سمجھایا جائے گا اور پھر ان پر نظر بھی رکھی جائے گی تو کوئی وجہ نہیں کہ اولاد ماں باپ کے لیے فخر کا باعث نہ بن سکے۔ ہم اسلام کے نام لیوا ہیں۔ اور ہمیں ہمارے دین نے یہ حق دیا ہے کہ ہم اپنے اہل وعیال کی خبر گیری کریں۔ ان کے اچھے برے کا خیال رکھیں۔ تو ہی ایک اچھے راعی کی صورت میں ہم اللہ پاک کی عدالت میں شاید اچھی طرح سے کھڑے ہو کر جواب دے سکیں۔ یہ انگریزوں کا معاشرہ نہیں ہے جہاں اولاد اٹھارہ سال کی ہوئی اور پھر وہ ماں باپ کو اور ماں باپ اس کو جواب دہ نہیں۔

یہ ہماری بے حسی۔۔۔

چند ماہ پہلے میں راولپنڈی اسلام آباد کے مشترکہ روڈ سے آفس سے واپس گھر جا رہا تھا، یہی کوئی سات بجے کا عشاء کا وقت تھا۔ ٹریفک سگنل کی وجہ سے رکنا پڑا۔ ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا جو کہ پورے لباس میں بلکہ حجاب میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اسکے ہاتھوں نے اخبارات اٹھائے ہوئے تھے، اور وہ اس وقت، جب ہر کوئی یا تو اپنے گھروں کو روانہ ہوا ہوتا ہے، یا اپنے گھر کے اندر گرم لحاف میں گھسا سکون سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ گپ شپ لگا رہا ہوتا ہے، ہاکر (پھیری لگانے والا/ والی) بنی ہوئی تھی اور ہر گاڑی کے قریب پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے رکتی، اخبار کی طرف اشارہ کرتی، اور کوئی مثبت جواب نہ ملنے پر آگے بڑھ جاتی۔ جب وہ ہماری گاڑی کے پاس سے گذری تو میری نظر اسکی آنکھوں پر پڑی جہاں دنیا جہان کی یاس ہی نظر آئی، لیکن اشکوں میں ڈوبی ہوئی۔ بس ایک لمحہ ہی چاہیے تھا کہ اشک اس کے گر پڑنے کو بے قرار تھے۔ خدا کی قسم اگر کوئی کار میں سے اتر کر صرف اسکی طرف بڑھ جاتا تو اسنے وہیں کھڑے رونا شروع کر دینا تھا، بے بسی کے مارے۔

کیا یہ وقت جب عشاء کی نماز کی تیاریاں ہو رہی ہوتی ہیں، کوئی رزق کمانے کا

ہوتا ہے؟ اور وہ اُس وقت رزق کی تلاش میں تھی۔ لیکن کن لوگوں سے اپنا حق طلب کر رہی تھی، جو بے حس تھے۔ جن کو صرف یہ احساس تھا کہ وہ کب اپنے گھر پہنچے گے، اس گھر میں جو پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ کنالوں کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یا دو دو، تین تین منزلہ ہے، بہترین طریقے سے آراستہ ہے۔ لاکھوں کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن مجال ہے کہ جو انکے کانوں پر جوں تک رینگی ہو۔ ہاں یہ ضرور دیکھا میں نے کہ اخبار تو شاید ہی کسی نے خریدا ہو، لیکن بری نظر اس جوان لڑکی پر سب نے ڈالی۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ اپنی گاڑی سے اتر کر اس کو شاباش بھی دیتا کہ خود داری بہت ہے، پھر اسکے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنی بیٹی، بہن بنا کر اسکو حوصلہ دیتا۔ اسکو کہتا کہ وہ گھر جائے، اوراللہ سے دعا مانگے وہ بہتر کرے گا۔ لیکن اگر کوئی اترتا بھی تو صرف اس لیے کہ اپنی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولے، اور اس میں اس کو بٹھائے۔ اور چند لمحوں کی عیاشی کے لیے اسکو زبردستی لے جائے۔ لعنت ہے ایسوں پر۔

یہ کسی نے نہ سوچا کہ بیچاری کتنی مجبور ولاچار ہو گی جو ایسے وقت میں رزق ڈھونڈ رہی ہے جب چرند پرند بھی اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اسکو کیا کیا مجبوریاں ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ اسکا باپ معذور ہو، بہن بھائی چھوٹے ہوں، گھر میں کوئی اور کمانے والا نہ ہو، یا وہ اگر صبح کے وقت کہیں نوکری کر بھی رہی ہو گی تو اسکی آمدنی کم ہو گی، گھر کا خرچہ نہیں پورا

ہوتا ہو گا۔ لیکن کوئی بھی اسکی مدد کے لیے تیار نہیں ہوا۔ تیار کیوں ہوتا۔ آج کی اس دنیا میں مغربیت اپنے پنجے اس حد تک ہماری جڑوں میں دھنس چکی ہے کہ جس طرح وہاں اگر کوئی ہمسائے میں مر جائے تو جب تک اسکی لاش سے تعفن اٹھ کر پورے پلازے میں یا محلے میں نہ پھیل جائے کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ وہاں تو کسی کو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ انکے ہمسائے میں کون رہتا ہے؟ اسی طرح ہمیں بھی صرف اپنی فکر کھائے جا رہی ہے۔ یہ فکر ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہوگا، کوئی بچہ بیمار نہ ہوگیا ہو، بیگم کو خریداری بھی کرانی ہے۔۔۔ یہ نہیں سوچیں گے کہ جب تک اجتماعی سوچ ہم لوگوں میں جنم نہیں لے گی، ہم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، اس طرح کے ہزاروں واقعات پورے پاکستان میں ہر وقت ہر جگہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن شاید محترم عبدالستار ایدھی کے علاوہ کوئی بھی دل میں درد نہیں رکھتا۔ انصار برنی بھی اسی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی اور برنی یا ایدھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ یقینا ہو سکتا ہے، لیکن عوام کو دوسروے کاموں میں الجھا دیا گیا ہے تو کوئی اس طرف کیا توجہ دے گا۔ کویت کے سلطان نے اپنی سالگرہ کے موقع پر اپنی پوری عوام کو ایک سال تک راشن مفت فراہم کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔ جب کہ ہمارے یہاں جو لوگوں کو میسر ہے وہ بھی مختلف حیلے بہانوں سے چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بچے عین

کسی چوراہے پر آ کر گاڑی کا فرنٹ شیشہ صاف کر رہے ہوتے ہیں، کوئی چنبیلی کے پھول کی مالائیں بنائے بیچ رہا ہوتا ہے۔ کتنے لوگ یہاں لاکھوں، کروڑوں میں کھیلنے والے ہیں، تو کیا صرف ایک فیملی کو نہیں سنبھال سکتے۔ بہت افسوس ہوتا ہے جب بھی میں کسی ایسے موقع پر کسی بے بس کا سامنا کرتا ہوں تو اپنی بے بسی پر میرا خون کے آنسو رونے کو دل چاہتا ہے۔ اور دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ اے اللہ مجھے اتنی دولت عطا کر دے کہ تیرے یہ باپردہ لوگ گھروں میں رہ کر تیری عبادت کریں، اور تیرا شکرادا کریں، کہ میں ان کو اس حد تک سپورٹ کر سکوں کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہ
پھیلائیں۔ اگرچہ وہ لڑکی بھی ہاتھ نہیں پھیلا رہی تھی، یہ ہی اسکی خودداری تھی، لیکن کیا کسی نے کبھی یہ سوچا ہے کہ اللہ نہ کرے کبھی اسکے گھر کے کسی فرد پر یہ وقت آئے جب وہ اپنے خاندان کے لیے اس طرح وقت بے وقت محنت کرتا دکھائی دے، شدید جاڑے کی سردی ہو یا آگ اگلتی گرمی، اسنے اپنے گھر کا چولہا ہر حال میں جلتے رکھنا ہے۔ کاش کہ ہم میں یہ بے حسی ختم ہو جائے، کاش۔۔

کیا یہ خدا کے غضب کو دعوت نہیں؟

آٹھ اکتوبر 2005 کے زلزلے کی تباہ کاریوں سے کون واقف نہیں۔ مانسہرہ، بالاکوٹ، کشمیر کے عوام پر اللہ کی ایک بہت بڑی آزمائش آئی تھی۔ اگرچہ پنجاب کے جنوبی علاقوں تک یہ جھٹکے محسوس کیے گئے لیکن مرکز وہ علاقہ ہی تھا۔ اسلام آباد میں مرگلہ ٹاورز کی جوڑی تنہا رہ گئی تھی کہ ایک ٹاور زمین بوس ہو گیا تھا۔
سات بج کر اٹھاون منٹ پر یہ زلزلہ آیا تھا۔ ساڑھے دس بجے تک پاکستان کا پورا میڈیا صرف مرگلہ ٹاورز کی تباہی دکھاتا رہا۔ پھر باہر کسی ملک سے اس وقت کے ارباب اختیارات کو اور میڈیا کو پیغام ملا کہ یہاں تو صرف سو، پچاس افراد ہی ہلاک ہوئے ہیں۔اور آپ سمجھ رہے ہو کہ بہت تباہی ہو گئی ہے۔ خبر لو اپنے ان علاقوں کی جہاں جھیل سیف الملوک کو راستہ نکلتا ہے، جہاں سے سے آنسو جھیل کے لیے گاڑیاں چلتی ہیں، جہاں سے کشمیر جنت نظیر کو نگاہ جاتی ہے۔ سید احمد شہید کے علاقے کی، جہاں زمین ایسی الٹ گئی ہے جیسے کوئی بھری ہوئی پلیٹ کو الٹ کر رکھ دے۔ پھر جب میڈیا نے وہاں کا رخ کیا تو کوئی اور خبر چلانا ہی بھول گئے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کبھی یہاں کوئی زندہ انسان مکانات میں بھی رہا ہو۔

پچاسی ہزار سے زیادہ افراد لقمہ اجل بنے۔ لاکھوں کی تعداد میں بے گھر ہوئے۔ ہزاروں بچے یتیم، ہزاروں خواتین بیوائیں، ہزاروں کی گود اجڑی۔ لاکھوں زخمی ہوئے۔ زخمیوں کو دیکھ کر کبھی تو زبان سے استغفر اللہ نکلتا تھا تو ساتھ میں سبحان اللہ بھی کہ اللہ نے کیسے حالات میں بھی انھیں زندگی سے نوازا۔ لیکن ان کی حالت دیکھ کر کہ کسی کا بازو نہیں، تو کوئی ٹانگوں سے محروم ہوا، بے اختیار زبان سے استغفر اللہ کا ورد جاری ہوتا تھا۔

یہ سب کچھ بظاہر تو اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تھی۔ لیکن اس سے بڑا امتحان ان لوگوں کے لیے شروع ہو گیا تھا جو کہ ان علاقوں سے باہر تھے یا ان ہی علاقوں میں بالکل زندہ سلامت بچ گئے تھے یا بہت معمولی زخمی ہوئے تھے۔ ان کا امتحان یہ تھا آیا وہ ان بے بس لوگوں کی مدد کرتے ہیں، انکے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں یا انکی تکالیف میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ پاک سب پر رحم فرمائے، آمین۔

ACCC

میرا چھوٹا بھائی بھی ان دنوں بالاکوٹ میں جاب کرتا تھا۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کے مصداق اسے بھی اللہ نے زندگی دی۔ اسکے آفس کی عمارت گر گئی تھی۔ اسے، اسکے باس اور ایک اور ساتھی کو ملبے کے نیچے سے نکالا گیا۔ وہ زخمی

تھے۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے روڈ پر آئے۔ ایک ٹیکسی والے کو اشارہ کیا کہ ان تینوں نے بالاکوٹ سے مانسہرہ آنا تھا۔ بکنگ کی بات کی۔ اس وقت ٹیکسی عام طور پر دو سو سے اڑھائی سو لیتی تھی۔ لیکن صد افسوس۔ بجائے اسکے کہ انکی حالت دیکھ کر اور ارد گرد لوگوں کی حالت دیکھ کر خدا کی پناہ طلب کرتا، الٹا ایک ہزار روپے کا مطالبہ کیا۔
جج صاحب (میرے بھائی کا باس) تو گویا بپھر ہی گئے کہ ایک طرف لوگوں پر کیسی اللہ کی آزمائش آئی ہوئی ہے اور وہ لوگوں کو لوٹنے پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسری ٹیکسی والے سے بات کی۔ اس نے منہ پھاڑ کر پندرہ سو کا مطالبہ کیا۔ غضب خدا کو للکارنے والی بات ہو گئی۔ جج صاحب اور بھائی لوگوں نے آنا تو تھا۔ مسئلہ رقم کا نہیں تھا۔ اس وقت حالات ایسے تھے کہ سب گاڑی رکھنے والوں کو چاہیۓ تھا کہ زخمیوں کو اپنی اپنی گاڑی میں سوار کرتے اور ہسپتال پہنچاتے۔ جیسا کہ کوئی چھ، سات گھنٹے کے بعد دیکھنے میں آیا۔ لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ انکے پاس پجارو ہے، لینڈ کروزر ہے یا ایکس ایل آئی ہے۔ بس پھیروں پر پھیرے لگاتے رہے اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچاتے رہے۔
خیر چار و ناچار ٹیکسی والے کو ایک ہزار روپے پر ہائر کیا۔ جج صاحب نے راستے میں ٹیکسی ڈرائیور کو خوب سنائیں کہ ایسے حالات میں تو خدا یاد آتا ہے۔ بندہ اپنے منہ سے نوالا نکال کر دوسرے کے منہ میں ڈالتا ہے اور وہ ایسے

میں لاچاروں، بے بسوں کو لوٹنے میں لگا ہوا ہے۔ ڈرائیور ڈھٹائی سے بولا کہ صاحب یہ ہی تو موقع ہے کمائی کا۔ (کیا بات کہی۔ حالانکہ یہ موقع کمائی کا تھا لیکن نیکیاں کمانے کا)۔ یہ کوئی بالاکوٹ کا ایک واقعہ ہی نہیں ہے۔ ہر شہر میں اسی طرح ہوتا ہے۔

موسلادھار بارش ہو رہی ہے۔ ٹیکسی والا اگر ایک مقام کے عام حالات میں ایک سو روپے لیتا ہے تو اس وقت یہ دیکھنے کے باوجود کے لوگ مجبور ہیں منہ پھاڑ کر کم از کم دو سو روپے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ کیوں ؟ تو جواب کہ یہ ہی تو کمانے کے اوقات ہیں۔ رمضان کے دنوں سے کون واقف نہیں۔ مہنگائی کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ لاکھ لعنت ہے اور تف ہے ایسی کمائی پر اور ایسی بات پر۔ جبکہ عیسائیوں کے ایسٹر کے تہوار پر یا کرسمس کے دنوں میں غیر ممالک میں ہر وہ چیز جو عام آدمی استعمال میں لاتا ہے اسکی قیمت اگر بہت زیادہ بھی ہو تو آدھی کر دی جاتی ہے۔

پھر اگلے چند دنوں میں جو آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا اس پر تو شہر کے جانور بھی ماتم کریں۔ جو گھر مکمل گرنے سے بچ گئے ان گھروں میں لٹیروں کی طرح گھس کر قیمتی سامان کو چرایا گیا۔ لوٹنے والے چور ڈاکو نہیں تھے بلکہ موقع پرست تھے۔ پھر زخمی خواتین کے کانوں سے بالیاں نکالی گئیں۔ مردہ عورتوں کی تو بات ہی نہیں۔ اگر کسی خاتون کی لاش کی کلائی میں سونے کی چوڑیاں نظر آئیں اور نکالے سے نہ نکل سکیں تو ہاتھ کاٹے گئے۔ وقت کی کمی کے باعث اسی

طرح کانوں سے بالیاں اور گلے سے لاکٹ کھینچ کر نکالے گئے۔ یہ نہ سوچا گیا کہ لاشوں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ یہاں تک کے اگر کسی امیر گھرانے کا بچہ انگلیوں میں انگوٹھی پہنے نظر آیا یا گلے میں سونے کی زنجیر تو اسکو بھی نہیں بخشا گیا۔ بجائے اسکے کے انکی لاشوں کو ڈھانپا جاتا، یہ سلوک انکے ساتھ کیا گیا۔

کوئی بتائے کہ ہم بتائیں کیا؟ بجائے استغفار کرنے کے، اپنے کردہ، ناکردہ گناہوں کی معافی مانگنے کے جب اس قسم کے اعمال کئے جائیں گے تو کیا یہ خدا کے غضب کو پکارنے والی بات نہیں۔ اللہ ہم سے کیسے راضی ہو۔ اور اسکی ناراضگی کی صورتیں ہم سب کے سامنے آتی رہتی ہیں۔ ہم ہی انجان بنے رہتے ہیں۔

ملالہ اور نوبل انعام

(یہ آرٹیکل ۲۴، اکتوبر ۲۰۱۲ کو لکھا گیا تھا)

جس جس نے اپنے اپنے آرٹیکل میں یہ لکھا کہ ملالہ کے ساتھ والی اس بچی شازیہ کا کیا قصور تھا جس کو سیدو شریف کے ہسپتال میں وہاں کے ڈاکٹرز کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا جب کہ ملالہ کے لیے پاکستان کے سی۔ایم۔ایچ ہسپتال، عمران خان کا شوکت خانم ہسپتال کے ساتھ ساتھ امریکہ،،برطانیہ سمیت شاید ہر بڑے ملک نے علاج کی پیشکش کی ہے۔ہاں جی، وہ بچی قصوروار تھی۔ اس بچی کا قصور یہ تھا کہ اس نے کبھی بھی حیثیت سے بین الاقوامی طور پر کچھ بھی شیئر نہیں کیا۔ نہ اس نے کبھی طالبان کے خلاف کوئی بات کی نہ اس نے اسلام کے خلاف کوئی بات کی۔نہ اس نے پاک فوج کی سوات میں فوجی کارروائی پر کسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ نہ اس بچی نے کبھی خواتین پر ظلم کی بات کی اور نہ ہی اس نے یہ لکھا کہ سوات کی خواتین کو باہر نکلنے سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر وہ بچی بھی اور شاید تیسری بچی بھی یہ سب کچھ کہہ سکتی تو آج وہ بھی ملالہ کے ساتھ کسی اچھے ہسپتال میں اپنا علاج کرا رہی ہوتیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو 1979 عیسوی میں طبیعات کا نوبل انعام دیا گیا۔ اگر

تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو آج تک جن جن افراد کو یہ نوبل انعام ملا ہے ان میں سے نانوے فیصد غیر مسلم ہیں۔ ڈاکٹر عبد السلام کو مسلمان قطعاً نہ سمجھا جائے کہ وہ قادیانی ہیں۔ اور قادیانیوں کو تمام مسلم امہ غیر مسلم قرار دے چکی ہے۔ جو باقی بچے، ان میں ایک خاتون شیرین عبادی ایران کی ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہلاتی ہیں اور شاید یہ ملالہ بھی اس خاتون کے ساتھ آئندہ کسی سال میں نوبل انعام لینے والی دوسری مسلمان خاتون بن جائے۔ لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو شیرین عبادی کو اگرچہ امن کا نوبل انعام ملا ہے، لیکن اسکے پیچھے جو وجوہات ہیں، وہ ایران والے بھی جانتے ہیں اور اسلامی ممالک بھی۔ جو خاتون انسانی حقوق کی خواتین کی چیئرپرسن ہو، خواتین اور بچوں کے ان حقوق کے لیے آواز اٹھاتی ہو جو دین اسلام نے 1400 سال پہلے ہی عطا کردیے ہیں۔ تو ایسی خاتون یقیناً نوبل انعام کمیٹی کی نظروں میں بہت اعلیٰ مقام کی حامل ہو گی۔ کیونکہ جن حقوق کی بات یہ محترمہ کرتی رہی ہیں وہ یہ ہی ہوں گے کہ ان کو بازاروں میں کھلے عام گھومنے پھرنے دیا جائے، مخلوط محفلوں میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے، حکومت میں جتنا حصہ مرد حضرات کا ہے اتنا ہی خواتین کا بھی ہونا چاہیے۔ اگر کوئی خاتون پردہ کرنا چاہے تو اسکی مرضی، کسی پر یہ پابند لاگو نہ کی جائے۔ بلکہ بقول اس قسم کی تنظیموں میں شامل خواتین کے پردہ تو پتھر کے زمانے کا رواج تھا، اب جدت پسندی اختیار کرنی چاہیے۔ تو مجھے نہ جانے کیوں لگتا ہے کہ اگر خوش قسمتی سے

ملالہ زندگی کی طرف لوٹ آئی تو اس نے بھی زندگی کے کسی مقام پر امن کا نوبل انعام ضرور حاصل کرنا ہے۔ امن کا نوبل انعام، جس کے بانی نے ڈائنامائیٹ ایجاد کیا تھا۔ ملالہ، گل مکئی کے نام سے بی بی سی کو مکتوب لکھا کرتی تھی اور اس میں لکھا کرتی ہو گی کہ طالبان نے اسکا گھر سے نکلنا بند کر دیا ہے، کیونکہ انھوں نے سکول ہی بند کر دیے ہیں۔ میں طالبان کی طرفداری نہیں کر رہا کیونکہ انھوں نے یہ کام یقینا غلط کیا تھا۔ کہ تعلیم کا حق مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی اتنا ہی ہے۔ اور پھر یہ تو بچیوں کا سکول بھی علیحدہ ہوتا تھا، جس میں خواتین استانیاں پڑھایا کرتی ہوں گی۔ لیکن گل مکئی یہ لکھنا بھول گئی کہ بچیوں پر تو تعلیم کی پابندی لگ گئی ہے لیکن لڑکے بھی اس نعمت سے فی الوقت معذور ہیں۔ انکے والد محترم مرد ہوتے ہوئے بھی سکون سے نوکری بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ شاید مساجد بھی خدا کے خوف کی بجائے طالبان کے خوف سے آباد ہوتی ہوں گی۔ گل مکئی یہ بھی لکھنا بھول گئی کہ اب اگر کوئی خاتون گھر سے نکل کر کہیں کسی رشتے دار کے گھر بھی جاتی ہے تو اسکو کوئی مرد نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اس خاتون کو اب یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کوئی اسکے نظروں نظروں میں ہی ایک ہی نظر میں گھر تک پہنچا کر نہیں آتا۔ گل مکئی یہ لکھنا بھول گئی کہ پہلے اسکے علاقے میں گناہوں کے پارک ہوتے تھے، جہاں مرد عورت مخلوط

گھوما کرتے تھے، بلکہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں بات چیت کرکے دوستی کیا کرتے تھے، اب ان گناہوں سے لوگ کافی حد تک بچ چکے ہیں۔

لیکن جو کچھ گل مکئی نے لکھا ہوگا وہ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے غیر مسلم انسانی حقوق کی تنظیموں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا۔ وہ تنظیمیں جنھیں کشمیر میں، فلسطین میں، فلپائن میں، برما میں کبھی کسی قسم کا ظلم نظر نہیں آیا۔ بس پھر کیا تھا ان تنظیموں نے اپنے نمائندے مختلف روپ میں بھیج کر گل مکئی کے حوالے سے اس علاقے کا سروے کرتے رہے اور عین گل مکئی کے دل کی آواز کی طرح اپنی رپورٹیں اپنے افسرانِ اعلیٰ کو پہنچاتے رہے۔ نتیجہ کیا تھا، ملالہ کی بین الاقوامی ایوارڈ کے لیے نامزدگی۔ جو کہ اگرچہ اسے نہ مل سکا لیکن بین الاقوامی طور پر اسکی ایک پہچان بن گئی۔ ان ہی غیر مسلم آقاؤں کے کہنے میں ملالہ کو امن کو قومی ایوارڈ دیاگیا۔ اسکا کارنامہ کیا تھا، سوات میں امن قائم کرنا اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے جدو جہد کرنا۔

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر طالبان چند سال مزید سوات میں رہ جاتے تو ملالہ کو بین الاقوامی ایوارڈ بھی اب تک مل چکا ہوتا بلکہ شاید اس وقت وہ امریکہ، برطانیہ میں سے کسی ملک کی شہری ہوتی اور اسکو وہاں تمام شہری سہولیات

میسر ہوتیں، ویسے ہی جیسے شیریں عبادی آج کل برطانیہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے۔ کیونکہ ایران کی حکومت نے اسکے نظریات کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ شاید اسکے نوبل ایوارڈ کو ضبط بھی کر لیا تھا۔ تو اگر طالبان چند سال اور سوات میں اسلام کے قوانین کو لاگو کیے ہوئے رہتے تو ملالہ آج کی بجائے 2، 3 سال پہلے ہی بین الاقوامی ایوارڈ حاصل کر کے شہرت کی بلندیوں کو چھو رہی ہوتی۔

آج جس اخبار کو اٹھا کر پڑھا جائے، جس ٹی وی چینل کو دیکھا جائے ملالہ کی خبر کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ملالہ کو مستقبل کے نوبل انعام کے ساتھ پاکستان میں کوئی اعلیٰ عہدہ دینے کی بھی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ نیوز کاسٹر اسکے حوالے سے ایک بات خاص طور پر کہتے ہیں کہ اسکی صحت یابی کے لیے خاص طور پر دعا کی گئی۔ اللہ پاک اسے صحت دے، روحانی بھی اور جسمانی بھی۔ اسکو اپنے راہ پر چلنے کی عملی توفیق عطا کرے، پھر میں دیکھتا ہوں کہ ملالہ کب تک امریکہ، برطانیہ کی چہیتی بیٹی رہتی ہے۔ اگر اسامہ بن لادن نے ملالہ کی صورت میں نہ جنم لیا تو کہیے گا کہ میں نے غلط کہا۔ میری دل سے دعا ہے کہ اللہ اسکو روحانی صحت بھی عطا کرے اور وہ خود ہی اپنے موجودہ نظریات سے پھر کر اللہ پاک کے پاک دین کو پھیلانے میں لگ جائے اور مستقبل کی رابعہ بصری کی پیروکار ثابت ہو۔

اللہ پاک ہم سب کو اپنے دین پر ہر لحاظ سے عمل کی توفیق عطا فرمائے، کہ یہ بہت پیارا اور سادہ دین ہے۔ عین انسانی فطرت کے مطابق۔ عورت چاہتی ہے کہ وہ محفوظ رہے، ہر تکلیف دہ چیز سے، اور مرد کی نظر سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ تو اسلام نے اسکا آسان حل پردہ کی صورت میں فرما دیا۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے، آمین۔

مفت مشورہ

شکر ہے اللہ کا کہ پاپڑ، نمکو یا چیونگم بیچنے والوں والوں کی طرح مشورے دینے والے بھی گاڑی میں چڑھ کر آواز نہیں لگاتے کہ لے لو جی، لو جی مفت مشورے لے لو۔ بالکل مفت۔ فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ اب سوچا جائے کہ مشورہ مفت بھی ہے اور قیمت بھی واپس ہونی ہے تو قیمت کس قسم کی ہو گی۔ بہت سوچا تو یہی خیال ہوا کہ جب مشورہ عمل کے قابل نہ ہوگا، یا عمل پذیر ہو کر فائدہ نہیں دے گا تو مشورے دینے والا اب خود تیار ہو گا کہ اسکو مشوروں کا پٹارہ حوالہ کیا جائے کہ اب وہ ان سب مشوروں پر فرداً فرداً عمل کرے۔ اور ہر کوئی اسکے سر پر کھڑا ہو کر مشوروں پر عمل کرائے۔ (اس کو پرندہ مت سمجھ لیں، سر پر اور کھڑا ہونا، کہ کھڑے ہونے کے لیے ٹانگوں کا استعمال ضروری ہے)۔

مشورہ مجھے بھی چاہیئے تھا کہ میں کیا کروں کیونکہ میں فارغ رہ رہ کر کسی برگد کے درخت کی طرح بور ہو چکا تھا۔ اسلیے اپنے دماغ کی ڈائریکٹری کو کھنگالنا شروع کیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک نام سامنے آتے گئے جو کہ مجھ سے بھی بڑے ویلے تھے۔ خیال آیا کہ اگر ان سے مشورہ لینا شروع کر دیا تو یہ تو جو میں دو چار منٹ اپنے قیمتی وقت سے مصروفیت کے نکال لیتا ہوں کہیں ان سے بھی نہ

رہ جاؤں۔

لیکن کیا کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ قسمت اور گاہک بنا بتائے کسی وقت بھی آجاتے ہیں تو میری قست بھی ایک دم جاگ اٹھی۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا بلکہ لیٹا تھا اور خیالی پلاؤ کے ساتھ ہوائی قلعے بھی تعمیر کر رہا تھا کہ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔

ایک طوفان کی آمد ہوئی۔ طوفان کیا تھا سونامی اور ریٹا بھی اسکے آگے شاید ہاتھ باندھ کر چلیں۔ خیر طوفان ایک انسان کی شکل میں تھا جو کہ کسی نہ کسی طور میرا کزن لگتا ہے۔ نعرے مارتے ہوا اور اچھلتے کودتے ہوئے میرے بستر کی پائینتی پر تھوڑا سا ٹکا لیکن پارے کی طرح کسی پل چین نہ آرہا تھا۔ ساتھ میں اسکا پیٹ بھی تھرک رہا تھا کہ کوئی بات اسکا پیٹ پھاڑ کر باہر آنے کو بے قرار تھی۔خدا خدا کرکے اسکو تھوڑا سا قرار ہوا۔ سنبھل کر کرسی پر بیٹھا۔ پھر اسنے اپنا منہ کھولا،چیک کروانے کے لیے نہیں نہ ہی زبان دکھانے کے لیے بلکہ کچھ اگلنے کے لیے۔ اوہو، آپ لوگ دل کیوں خراب کرتے ہیں، اس نے وہ بات اگلنی تھی جو کہ اسکے پیٹ کو پھاڑ کر باہر آنے کو تیار تھی۔

اللہ اللہ کرکے اسنے جو الفاظ جوڑے انھیں سن کر تو مجھے لگا کہ غالب، میر، درد اپنی قبر میں کروٹیں بدلنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے اور احمد فراز مرحوم کے

لواحقین کو اپنے گھر میں دل کے دورے پڑ رہے ہوں گے۔ کیونکہ موصوف نے ایک عدد غزل اپنی غزل کے لیے لکھ ماری تھی۔ جس کا بحر بحرالکاہل سے بھی گہرا تھا۔ قافیہ سمجھنا زیادہ مشکل تھا جبکہ تورا بورا کے پہاڑوں میں اسامہ بن لادن کو ڈھونڈنا آسان۔ اور صرف آخری حرف ملتا تھا ورنہ باقی سب جلتا تھا۔ ردیف کی تکرار ایسی تھی جیسے نصرت فتح علی خان راگ درباری یا ملہار کی گردان شروع کر دے۔ اور پھر آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ مجھے لگا کہ میں جو عرصہ دراز سے نیند میں تھا جاگ گیا ہوں کیوں کہ مجھے بار بار جھٹکے لگ رہے تھے۔ شاید کوئی یقین نہ کرے کہ اسنے اپنے ہر شعر کو اس طرح پڑھا کہ ہر مصرعہ وزن میں (اگرچہ ایک مصرعہ قارون کا خزانہ تھا تو دوسرا رائی کا دانہ) یوں دوسرے مصرعے کے برابر ہوتا کہ بے اختیار عیش عیش (عش عش نہیں) کرنے کو جی چاہتا کہ کاش اسکی غزل میں ہوتا۔

بڑی مشکلوں سے اسکی چار شعروں پر مشتمل غزل ختم ہوئی تو میں نے جو اس سے پہلی بات کی کہ اسکے پاس کوئی ڈسپرین کی گولی ہے ایک نہیں دو۔ تو کہنے لگا کیوں اتنی ہی بری تھی اسکی غزل کہ سر میں درد ہو گیا۔ میں نے کہا کہ قصور اسکی غزل کا نہیں وہ تو سراپا غزل ہے جب چلتی ہے تو بے اختیار ہرن یاد آجاتا ہے، جب نظر اٹھا کر دیکھتی ہے تو جنگل میں کالی اندھیری پھیلی ہوئی نظر آتی ہے، جب گیلی زلف کو جھٹکتی ہے تو گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی دکھتی ہے۔

اس نے تڑ سے کہا کہ ارے میں اس غزل کی بات کر رہا ہوں جو کہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے
نہ کہ اس غزل کی پشاور میں رہتی ہے۔ میں نے کہا کہ جو کچھ لکھا ہے نہ لکھتے بس اپنی
غزل سے ملا دیتے تو ایک ہی بات تھی۔ وہ اس بات پر ناراض ہو گیا۔ اور منہ بسور کر
اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن جاتے جاتے وہ بات کر گیا جو کہ میری قسمت بدل گیا۔ اسنے کہا کہ
خود تو لکھ نہیں سکتا تو دوسروں کے لکھے پر تنقید کرتا ہوں۔ کیونکہ حسد کرتا ہوں، اور یہ
بھی کہا کہ تب ہی غزل کا پہلا شعر پڑھتے ہی جلنے کی بو آنا شروع ہو گئ تھی۔

یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ جلنے کی بو آئی تھی کہ نہیں لیکن ایک خوشبو ضرور دماغ کو معطر
کر گئی۔ وہ خیال کی خوشبو تھی، پروین شاکر کے شعری مجموعے کی نہیں۔ خیال یہ آیا کہ
کہیں پر پڑھا تھا کہ اگر کوئی نو (9) کتابیں پڑھ لے تو دسویں کتاب لکھ سکتا ہے۔ اگر میرا
یہ کزن بغیر کسی کی رہنمائی کے چار گھنٹے لگا کر چار اشعار پر مشتمل ایک غزل لکھ سکتا ہے
تو میں تو بہت سی نو عدد کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ میں کتنی ہی دسویں کتابیں لکھ سکتا
ہوں۔ بس اسکا یہ طنزیہ مشورہ میرے لیے وقت گزاری کا مرہم بن گیا۔ اور میں نے
بلاواسطہ کتاب لکھنے کا ارادہ شروع کر دیا۔

پیارے ہموطنو! میں آج آپ کو ایک نئے لکھاری سے ملانے جا رہا ہوں۔۔۔۔ کوئی

ستر، اسی کتابیں شروع کیں، سب کا آغاز کچھ اس جملے سے ملتا جلتا ہوتا۔ گو کہ ٹائٹل جدا ہوتا لیکن اسکا بنیادی خیال ایک ہی ہوتا کہ میں خود کو ایک ہیرو تصور کرتا اور ہیروئن کی تلاش میں قلم دوڑاتا۔ کبھی بھی دوسرے صفحے سے تیسرا صفحہ نہ ہوا۔ میں نے بھی ہمت نہ ہاری۔ ایک دن لکھتے لکھتے غزل لکھ ماری۔ کالج کا زمانہ تھا، آتش جوان تھا۔

سابقہ صوبہ سرحد کے مشہور شاعر غلام محمد قاصر صاحب ہمارے کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انکو غزل زبردستی دکھائی گئی (میرے ایک دوست نے میری نوٹ بک سے کاپی کرکے یہ کام کیا تھا) تو اگلے دن ان کی کلاس میں جو میری کلاس لگی اسکی روداد اگر بیان کر بیٹھا تو پوری ایک رپورتاژ بن جائے گی۔ خیر سارے جہاں سے اچھا ہے یہ گرم خون ہمارا، ہم بھی لکھتے رہے، وہ تکتے رہے، ہم لکھتے رہے وہ جہاز بنانے کے لیے باقی کلاس کو میرے صفحے تھماتے رہے۔ اگر ہمت ہار بیٹھتے تو آج یوں آپ کے سامنے یہ سب کچھ نہ لکھ رہے ہوتے۔

توحضرات کہنا صرف یہ تھا کہ کبھی کبھی مفت مشورہ بغیر مانگے ہوئے بھی کام کر جاتا ہے۔ بشرطیکہ آپ اسکو دل پر لے لیں۔ ویسے ہر بات دل پر نہیں لی جاتی۔ کیونکہ

کچھ باتوں کو بے پر کی میں اڑا دینا

دل پر لوگے، تو جان سے جاؤگے۔۔۔

سوشل میڈیا پر قرآن و احادیث کی شیئرنگ

مجھے یاد ہے کہ جب ہم چھوٹے ہوتے تھے ۔ سکول کا زمانہ تھا تو اکثر گھروں میں کوئی بندہ دروازہ کھٹکھٹا کر ایک کاغذ ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ اس پر لکھا ہوتا تھا کہ سیالکوٹ کے فلاں شخص کو بی بی زینب خواب میں آئی ہیں اور انھوں نے یہ پیغام دیا ہے۔ اور ساتھ میں اس کاغذ میں یہ بھی لکھا ہوتا تھا کہ اس کاغذ کی کم سے کم دس کاپیاں کر کے تقسیم کریں۔ نہ کرنے والا بہت نقصان اٹھائے گا۔ اس وقت اکثر لوگوں کے عقیدے کمزور ہوتے تھے تو فوٹو سٹیٹ والوں کے مزے ہو جاتے تھے۔ کتنی ہی دس کاپیاں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ بھی فوٹو سٹیٹ والوں کی ایک چال ہے کہ انکی بکری بہت زیادہ ہو۔ کیونکہ اس وقت طالب علم ہونے کے باوجود یہ سوال ذہن میں ضرور گردش کرتا تھا کہ جب ہمارے پاس قرآن کی صورت میں ، احادیث کی صورت میں سارے سوالوں کا حل موجود ہے تو پھر ایسے پیغامات کی کیا تک بنتی ہے۔ اور اب جب سے نیٹ کی دنیا میں پیغامات شیئرنگ کا سلسلہ شروع ہوا ہے تب سے اس طرح کے پیغامات پھیلانے کے لیے بھی اسی طرح کے لوگوں نے اس محاذ کو بھی بہت تیزی سے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ کوئی دس سال پہلے تک صرف ای میل سے ہی رابطہ ہوتا تھا، لیکن پھر فورمز بننا شروع ہوئے، فیس بک کی آمد ہوئی، ٹویٹر نے اڑان بھری، وٹس ایپ بھی پیغامات کے لیے

استعمال ہونے لگا ہے۔ لیکن ان پر پیغامات کی ترسیل کوئی سات آٹھ سال قبل شروع ہوئی ہے۔ کچھ اس قدر تیزی سے یہ سلسلہ پھیلا ہے کہ اب دماغ نے بھی حیران ہونا چھوڑ دیا ہے کہ مزید سکڑنے کی یا پھیلنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

بے شک اس سوشل انٹرنیٹ میڈیا کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ ایک ہی جگہ پر بہت سا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ چند لمحے پہلے ہونے والے کوئی واقعہ بھی اکثر اوقات علم میں آ جاتا ہے۔ اسی سوشل میڈیا کی بدولت بہت سے بچھڑے ہوئے دوست بھی آپس میں مل جاتے ہیں۔ گذشتہ دنوں ہی ایک خبر فیس بک کے ذریعے علم میں آئی کہ کوئی پچیس چھبیس سال پہلے بچھڑی ہوئی ماں بیٹی فیس بک کے ذریعے آپس میں ملیں۔ یہ تو مثبت استعمال کا ہوا ایک معمولی سا رخ۔ اسی رخ کو مزید سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں نے اس کو تبلیغ کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ بہت اچھی اور بہت ہی عمدہ بات ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ دوسرے مذاہب والے اس طرح نہ کریں۔ لیکن ان کی طرف داری بھی نہیں کروں گا کہ اللہ کے فرمان کے مطابق ایک تو سابق تمام انبیاء کرام کی تعلیمات منسوخ ہو چکی ہیں اور دوسرا ان انبیاء کرام پر جو کتب نازل کی گئی تھیں ان میں ابھی ان کے ماننے والوں نے اتنی تحریفات کی ہیں کہ اللہ نے خود فرما دیا کہ اب ان پر عمل ممکن ہی نہیں بلکہ وہ بھی رد و بدل و تحریف کے نتیجے میں قابلِ تقلید نہیں رہیں۔

اسلیے انبیاء میں صرف اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہی سب کے لیے ہیں اور تا قیامت ہیں اور ان پر نازل کی گئی اللہ کی آخری کتاب قرآن ہی سب کے لیے تعلیمات کا ذریعہ ہے۔تو بات ہو رہی تھی فیس بک کی۔ اچھے مسلمانوں نے اس کو تبلیغ کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ بلکہ اس فیس بک پر باقاعدہ سے مناظرے بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن اکثر یہ یک طرفہ ہی ہوتے ہیں کہ غیر مسلمانوں نے اسلام کے مختلف قوانین پر جو جو اعتراضات کی ہیں مسلمان ان کا جواب مختلف دلائل سے جو کہ قرآن اور احادیث پر مبنی ہوتے ہیں دیتے ہیں۔

مسلمانوں کا اللہ پر یقین جتنا بھی کمزور ہو۔ دین کے معاملہ میں انکا عقیدہ جتنا بھی کمزور ہو، اگر ان کے سامنے قرآن کی کوئی آیت یا کوئی احادیث بمعہ ترجمہ پیش کر دی جائے تو وہ اس پر جزاک اللہ، سبحان اللہ ، ماشاء اللہ وغیرہ ضرور کہتے ہیں اور نیٹ پر باقاعدہ لکھتے ہیں۔ جب کہ ان کو قطعاً یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ بات جو بیان کی گئی ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا جو کہ کسی سے کسی زمانے میں سنا تھا۔ ایک پاکستانی سعودی عرب گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ دو سعودی فرد آپس میں لڑ رہے تھے اور ظاہر ہے وہ بات چیت بھی عربی میں کر رہے ہوں گے۔ لڑتے لڑتے اتنی آگے بڑھ گئے کہ ایک دوسرے کو عربی میں گالیاں بھی دینے لگے۔ وہ پاکستانی جب پاکستان واپس آیا تو کسی نے اس سے پوچھا کہ سعودیہ میں سب سے اچھا کیا لگا؟ اس نے کہا کہ

سب کچھ بہت اچھا تھا لیکن ان کی ایک بات بہت کمال کی لگی کہ وہ آپس میں لڑتے ہوئے بھی قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ بندہ جائے تو کدھر جائے۔ یہی حال سوشل میڈیا کا ہے۔ جن میں فیس بک اور ٹویٹر نمایاں ہیں۔

مسلمانوں اور خاص طور پر پاکستانیوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے یہودیوں نے اپنے اردو میں ماہر افراد کو استعمال کرتے ہوئے قرآن میں گویا تحریف کا کام شروع کر دیا۔ پہلے کوشش کرتے ہیں کہ آیت کو اپنی مرضی سے تبدیل کریں اور پھر اسکا ترجمہ تحریف شدہ آیت کے مطابق لکھیں۔ اس کی ایک مثال سورۃ توبہ جو کہ قرآن کی نویں سورہ ہے کی آیت نمبر باون ہے، جس کے بارے میں موبائل کے ذریعے ایس ایم ایس بھی بہت پھیلا۔ اور پھر یہ فیس بک پر بھی کافی دفعہ نظر سے گزری۔ جب بھی اس آیت کا حوالہ نظر سے گزرا تو پہلے تو یہی لکھا ہوا نظر آیا امریکہ میں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء میں ہونے والے دہشت گردی کے حملے میں گرنے والے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جڑواں میناروں کی تباہی کا اس آیت میں باقاعدہ پیش گوئی ہے۔ جب پہلی بار مجھے یہ پیغام آیا تو میں نے نظر انداز کر دیا۔ لیکن پھر یکے بعد دیگر کئی دوستوں کی جانب سے جو کہ دنیاوی طور پر تو اتنے پڑھے لکھے ہیں کہ کم سے کم ایم فل کی اصلی ڈگری کے حامل ہیں یہ ایس ایم ایس آیا۔ میں حیران کہ یہ کیا ہے؟ کیوں کہ میں قرآن کی یہ آیت باقاعدہ پڑھ چکا تھا اور اسکا ترجمہ کیا، تشریح بھی پڑھ چکا تھا۔ جب مجھے

پہلا ایس ایم ایس آیا تھا۔اس آیت کا ترجمہ ہے: کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو اور ہم تمہارے حق میں اس بات کے منتظر ہیں کہ خدا (یا تو) اپنے پاس سے تم پر کوئی عذاب نازل کرے یا ہمارے ہاتھوں سے (عذاب دلوائے) تو تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔۔اس کی تشریح اگر دیکھی جائے تو کچھ اس طرح ہے۔"مسلمانوں کے جہاد میں دو ہی انجام ہوتے ہیں اور دونوں ہر طرح سے اچھے ہیں۔اگر شہادت ملی تو جنت اپنی ہے۔اور اگر غازی بن کر فتح ملی تو غنیمت اجر ہے۔پس (اے نبی ﷺ آپ کہہ دو) اے منافقو تم جو ہماری بابت انتظار کر رہے ہو وہ انہی دو اچھائیوں میں سے ایک کا ہے۔اور جس بات کا انتظار ہم تمھارے بارے میں کر رہے ہیں وہ دو برائیوں میں سے ایک کا ہے یعنی یہ کہ یا تو اللہ کا عذاب براہِ راست تم پر آ جائے یا ہمارے ہاتھوں سے تم پر اللہ کی مار پڑے کہ قتل و قید کیے جاؤ۔" اب کوئی بتائے کہ اس آیت میں کہاں سے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کا کسی بھی لحاظ سے ذکر ہے، اشارۃً یا مبالغۃً۔

یہ مثال تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح کی ڈھیروں آیات کے غلط ترجمہ فیس بک پر، ٹویٹر پر یا پھر موبائل ایس ایم ایس کے ذریعے شیئر کیے جاتے ہیں اور ساتھ میں بڑے دھڑلے یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ شیئر کرنے سے شیطان روکے گا۔ بے شک آیت درست ہوتی ہے، ترجمہ بھی درست ہوتا ہے لیکن یہ

دھمکی نما جملہ بڑا عجیب سے لگتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ یہ بات شیئر کی جائے۔ خیر فیس بک کو بھی یہودیوں نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا ایک ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور آیت سے واسطہ پڑا۔ جس کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا گیا کہ جو اہلِ کتاب ہیں وہ تمھارے حق میں برے نہیں ہیں اور انہیں دوست سمجھو۔ جب کہ اللہ پاک قرآن پاک میں فرماتے ہیں ۔ "تم ہر گز یہود و نصاریٰ کو ہر گز دوست نہ بناؤ، یہ تو آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جو ان سے دوستی رکھے گا وہ انہی میں سے ہو گا سورۃ مائدہ، آیت ۵۱) "۔ اب جو شخص کم علم ہو گا، تحقیق نہ کرنے والا ہو گا، اس نے تو) یہ آیت پڑھ کر آگے شیئر بھی کر لینی ہے اور سب کو بتانا بھی ہے کہ یہ اہلِ کتاب تو ہمارے دوست ہیں اور سب سے دوستی کرتا پھرے گا۔ یہ تو قرآن کی چند مثالیں ہو گئیں۔

احادیث کے حوالے سے تو فیس بک پر شیئرنگ کی بھرمار کی گئی ہے۔ اور ایسی ایسی احادیث پڑھنے میں ملتی ہیں کہ جنکا احادیث سے دور دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اور لوگ وہی سبحان اللہ، جزاک اللہ لکھتے پھرتے ہیں۔ رسول پاک ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جس نے میرے حوالے سے کوئی جھوٹی حدیث بیان کی اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اور جس سے نبی کریم ﷺ اپنا تعلق ختم کر دیں اس کا ٹھکانہ کہاں ہو گا ماسوا جہنم کے۔ بہت سی نام نہاد احادیث اس طرح کی ملیں گی جو تحقیق میں بالکل جھوٹی نکلتی ہیں۔ مزے کی بات ہے کہ ان پر جو حوالہ

دیا جاتا ہے وہ کسی بھی مستند کتاب کا نہیں ہوتا جن میں صحاح ستہ اور موطاء امام مالک شامل ہیں۔ اگر حوالہ دیا بھی جاتا ہے تو تو مستدرک حاکم، کنزالعمال کا۔ ٹھیک ہے کہ یہ احادیث کی کتابیں ہیں، لیکن ان کے اندر بھی جو حوالے دیے گئے ہیں ان کا ذکر قطعاً نہیں کیا جاتا۔ جس کی بنا پر وہ حدیث مشکوک ٹھہرتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث نظر سے گزری کہ جو شخص کھڑے ہو کر پانی پیے گا اس کو انتہائی شدید عذاب ہو گا اور جہنم کے آخری گڑھے میں اس کو پھینکا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ اللہ کے قانون اللہ کی مرضی سے اسکی مرضی کے مقامات پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اکڑ کر چلنے سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ لیکن حج یا عمرہ کے دوران طوافِ کعبہ کرتے ہوئے کچھ چکروں کے دوران تھوڑا اکڑ کر چلنے کا حکم ہے۔ اس طرح آبِ زم زم کھڑے ہو کر پینے کا حکم ہے۔ یہ درست ہے کہ پانی کھڑے ہو پینے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ایک شخص کو بیٹھنے میں دقت ہوتی ہے، اس قدر بیمار ہے کہ بیٹھتے ہوئے اور پھر بیٹھ کر اٹھ کر کھڑے ہونے میں اس کو بہت وقت لگتا ہے جسم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ کیا کرے گا۔ جیسا نماز کے بارے میں حکم ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھو، بیٹھ کر پڑھو، لیٹ کر، اشارے سے۔۔ لیکن چھوڑنی نہیں ہے۔ تو اگر عذاب ہوتا تو اس طرح کا کوئی نہ کوئی حکم احادیث میں سے ضرور ملتا۔ اور پھر یہ کہ عذاب تو اس بات پر ہوتا ہے جس سے اللہ پاک نے براہِ راست میں منع فرمایا ہو۔

سب احباب سے گزرش ہے کہ فیس بک ہو یا ٹویٹر یا ان کو اس طرح کو کوئی ایس ایم ایس آئے تو خدارا، پہلے اس کی تحقیق کر لیا کریں، پھر دل کرے تو آگے شیئر کر دیا کریں ۔ نہ شیئر کرنے پر ان شاء اللہ کوئی گناہ نہیں ہو گا، یہ مجھے یقین ہے۔ اللہ پاک ہمیں فیس بک کے، ٹویٹر کے اور یہود و نصاری کے شر سے ہر دم محفوظ و ممنون رکھے، آمین۔

Axact ایگزیکٹ کے پیچھے کیا کوئی سازش ہے؟؟

آج کل کی سب سے گرم خبر ایگزیکٹ کے حوالے سے یہ کوئی پہلی بار نہیں ہے کہ امریکہ نے پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی ہو اور پاکستانی اربابِ اختیار نے کوئی جواب دیا ہو۔ جب سے پاکستان امریکہ پنجہ لڑا ہے یعنی ۱۹۵۰ء میں جب پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم نوابزادہ خان لیاقت علی خان نے امریکہ یاترا کی تھی تب سے امریکہ کو احساس ہو گیا تھا یا پھر شاید اسکی چھٹی حس اتنی طاقتور تھی جو اس کو علم ہو گیا تھا کہ پاکستان اس خطے میں جلد یا بدیر انتہائی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ تب سے امریکہ نے یہاں اپنے زہریلے ناخنوں سے کریدنا شروع کیا اور کریدتے کریدتے اپنے پنجے اتنے مضبوطی سے گاڑ لیے کہ اب بظاہر نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ بس ایک ہی صورت ہے کہ جس طرح کسی زخم کی وجہ سے بدن کے کسی حصے میں زہر پھیل جاتا ہے تو جسم کے اس عضو کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح امریکہ کا پنجہ بے شک یہیں رہے، اسکے بازو کو کاٹ دیا جائے۔ آہستہ آہستہ یہ پنجہ بالآخر کسی عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور امریکہ کا بازو اس سے قطع تعلق کرنا ہے۔ سب مسلمان ملک اس سے قطع تعلق کر لیں۔ اپنا اپنا سرمایہ وہاں سے نکال لیں۔ اپنے ملک سے ان کی مداخلت جس طرح سے بھی ہے اس کو ختم کر دیں۔ اگر وہ کوئی ترقیاتی کام کر رہا ہے تو وہی کام مسلمان ممالک کے

افراد بھی کر سکتے ہیں۔ دیکھیں پھر اس بازو کا کیا ہوتا ہے۔
اگر امریکی حکومت براہِ راست پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں بھی کرتی تو پھر بھی اسکے باسی یہ گل کھلا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے امریکہ کا نعرہ ہے کہ بولنے کی آزادی، جو صرف وہاں کے نسلی رہائشی افراد کے لیے ہے۔ کوئی اور اس طرح کی آزادی کا نعرہ تو لگا کر دیکھے، پھر دنیا اس کو نہیں دیکھے گی۔ اسی طرح کی ناجائز آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اب کی وار جو پاکستان پر کیا گیا وہ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کی طرف سے تھا۔ اسکے رپورٹر مسٹر ڈیکلین والش نے اپنے اس اخبار کے توسط سے پاکستان کو پوری دنیا میں بدنام کر کے رکھ دیا۔ گزشتہ آٹھ دس سالوں سے ایگزیکٹ Axact کمپنی پاکستان میں کام کر رہی تھی۔ اور امریکہ اس سے بے خبر تھے۔ ہے نا حیرت کی بات۔ جس کا دعویٰ ہے کہ دنیا کے کسی مقام پر کوئی پتہ بھی بلاوجہ ہلے تو اسکا بھی اسے علم ہو جاتا ہے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عرصہ دس سال سے ایک کمپنی کام کر رہی ہو اور بقول مسٹر والش غلط طریقے سے کر رہی ہو اور امریکہ کو اسکی خبر نہ ہو۔ اسکی تین سو ویب سائٹس ہوں اور ساری دنیا کی انٹرنیٹ کے ذریعے ہر بندے کی ذاتی ای میل تک چیک کرنے والے امریکہ یا اسکے لے پالک اسرائیل کو ان ویب سائٹس کی خبر نہ ہو۔ میرا ذہن تو یہ بات نہیں مانتا۔ امریکہ میں ہی ایک کتے کو ایم بی اے کی ڈگری مل جائے اور وہاں کسی کو علم نہ ہو۔ حیرت ہے

کمال ہے۔

مسٹر والش نے یہ رپورٹ شائع کرنے کے بعد بیان دیا کہ وہ تو پاکستان تعلیمی میدان میں ،کے حوالے سے تحقیق کرنے نکلا تھا کہ سامنے یہ آگیا۔ اور جب اس نے تفصیل میں جانا شروع کیا تو اصل حقائق آشکار ہونا شروع ہوئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس طرح کے جعلی کاروبار کرنے والے کیا اتنا ہی کچا کام کرتے ہیں اخباری رپورٹر کے پاس تو ساری تفصیل آجاتی ہے اور کمپنی کو علم ہی نہیں ہوتا۔ وہ پاکستان کے حوالے سے کام کر رہا ہے، دنیا بھر سے معلومات اکٹھی کر رہا ہے، اور پاکستان والے بے خبر ہیں۔ ایگزیکٹ والوں نے جو کچھ بھی کیا کیا وہ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہوتا۔ مجھے ہفتے میں ایک آدھ بار ای میل آتی ہے کہ آپ کا مائیکروسافٹ کی قرعہ اندازی میں پانچ لاکھ پاؤنڈز کا انعام نکلا ہے۔ آپ مندرجہ ذیل ای میل پر رابطہ کریں، آپ کو تفصیل سے بتایا جائے گا کہ آپ وہ انعام کیسے وصول کر سکتے ہیں۔ اور جب میں سارے مراحل طے کر چکا ہوتا ہوں تو انکا آخری ای میل ہوتا ہے کہ اب آپ اڑھائی ہزار پاؤنڈ فلاں اکاؤنٹ میں جمع کروائیں جو کہ پروسسنگ فیس ہو گی۔ تب آپ کو بینک کی طرف سے پانچ لاکھ پاؤنڈ کا چیک جاری کیا جائے گا۔ میں نے اکثر اس طرح کی آخری ای میل کا جواب یہ دیتا ہوں کہ وہ چونکہ پروسس کروا رہا ہے تو پانچ لاکھ میں سے دو لاکھ اس کے۔ تو پھر اس کا جواب نہیں آتا۔ اور ان سب ای میل کے پیچھے جو

آئی پی استعمال ہو رہا ہوتا ہے وہ اکثر بیشتر مملکت امریکہ یا براعظم امریکہ کے کسی نہ کسی ملک کا ہوتا ہے۔ لیکن کسی کو وہ فراڈ نظر نہیں آتے۔

سنا ہے کہ امریکہ میں ہر سال ایک لاکھ کے قریب جعلی ڈگریاں تقسیم ہوتی ہیں جن میں چالیس فیصد ایم بی بی ایس کی ہوتی ہیں اور باقی ساٹھ فیصد ایم بی اے، ایل ایل بی، انجینئیرنگ کی ہوتی ہیں۔ برطانیہ کی ہر بڑی یونیورسٹی کی ڈگری وہاں سے مل جاتی ہے بنا یونیورسٹی میں کوئی کلاس لیے ہوئے۔ جس کا ایک ثبوت ہمارے سامنے ایک سابقہ صدر کے بیٹے کا ہے۔ یقینا فاصلاتی نظام تعلیم کا استعمال کیا گیا ہے، لیکن میرا سوال ہے کہ کیا کریڈٹ آورز کچھ نہیں ہوتے۔ سال میں تین ماہ یونیورسٹی سے دور اپنے وطن میں رہا۔ پھر سیاست میں بھی شرکت کی اور جاری ہے، تو کہاں گیا وہ قانون۔ مسٹر والش کو اپنے ملک میں یا کسی اور ملک کے نظام تعلیم میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ویسے اگر آتا بھی ہو تو وہ امریکن ہے، اس نے اپنے وطن کی توہین ہر گز نہیں کرنی۔ نہ ہی کسی برطانیہ یا جرمنی یا فرانس کی کرنی ہے کہ وہ مسلمان ملک نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی پاکستان ہے۔

اور اگر وہاں کے میڈیا کو بھی علم ہو تو بھی میڈیا کو آزادی کے باوجود یہ آزادی ہر گز نہیں کہ وہ اپنے ملک کو تمام دنیا میں بدنام کرتا پھرے۔ یہ تو پاکستانی الیکٹرانک میڈیا ہے جس کو پاکستان کی توہین کرنے کے لیے بس کوئی خبر چاہیے۔ پھر وہ ہر منٹ کے بعد بریکنگ نیوز ہوتی ہے۔

اب یہی صورت حال ایگزیکٹ کمپنی کی ہے۔ مسٹر ڈیکلین نے نیویارک ٹائمز میں کیا خبر شائع کی، پاکستانی میڈیا کو جیسے پر لگ گئے۔ جیسے تمام دنیا میں اور کوئی خبر اسکے بعد رہی ہی نہیں۔ سب کچھ ختم ہو گیا، گویا دجال نکل آیا کہ بس دنیا ختم ہونے کو ہے تو ایگزیکٹ ہی چلاتے جاؤ۔ مسٹر ڈیکلین والش نے تو تین سے چار ماہ لگائے ایگزیکٹ کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے میں ۔اور یہ معلومات کہیں باہر سے نہیں ملیں بلکہ اس کمپنی کے اندرونی سٹاف سے ہی لیں، جن میں سے ایک نام یاسر جمشید کا ہے، جو کہ وہاں کوالٹی کنٹرول آفیشل تھا۔کچھ معلومات وہاں سے لیں، کچھ نیٹ سے سرچ کیا۔ اس طرح سارا کچا چٹھا سامنے لایا۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر اس بات کا بہت افسوس ہوا جب ہمارے میڈیا نے نیویارک ٹائمز کو ہی اپنی خبر کا حوالہ بنایا اور مسلسل چار پانچ دن تک اسی کے حوالے سے خبریں چلاتا رہا۔ہر پانچ دس منٹ بعد ایگزیکٹ اور بول میڈیا گروپ کی خبر ہوتی تھی۔ جیسے ساری خبریں ختم ہو گئی ہوں۔ کسی ایک چینل والے نے یہ نہیں کہا آخر امریکہ کو یا مسٹر والش کو ساری دنیا میں سے ایک پاکستان ہی نظر آیا تھا۔ یونیورسٹیاں ساری امریکہ کی ، بینک اکاؤنٹ امریکہ کے بینکوں کے استعمال ہو رہے ہیں۔ جہاں ہر اکاؤنٹ کا چیک اینڈ بیلنس ہوتا ہے، امریکی ایف آئی اے اور دوسری امریکی خفیہ ایجنسیاں ہر ہر فرد کا ذاتی ڈیٹا تک چیک کرتی ہیں تو یہ ان کو علم کیوں نہ ہوا۔ دوبئ میں ان کے اکاؤنٹ

چل رہے ہیں، کوئی دیکھنے والا، پوچھنے والا نہیں۔

مجھے تو اس کے پیچھے بھی امریکہ کی یہ سازش نظر آ رہی ہے کہ مسٹر شعیب کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کے تعلیمی نظام کو دنیا میں فیل قرار دیا جائے۔ پہلے ہی پاکستان کی یونیورسٹیوں کی بین الاقوامی رینکنگ کافی نیچے ہے تو یہ سکینڈل اس رینکنگ میں مزید نشیب کا باعث ہی بنے گا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ امریکہ کی یونیورسٹی کی جعلی ڈگریاں ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہو رہی ہوں، اور کسی کو علم نہ ہو۔ کیونکہ ظاہر ہے ان ہزاروں لوگوں نے نوکریاں بھی تو حاصل کی ہوں گی۔ ایف آئی اے پاکستان والوں نے اب اگزیکٹ کا ڈیٹا لے کر اس کو ڈی کوڈ کیا ہے اور ان کو بہت سا ثبوت ملا ہے اگزیکٹ کے خلاف۔ لیکن میں یہ عرض بھی ضرور کروں گا کہ صرف ان ثبوتوں کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف ایکشن نہ لیا جائے بلکہ آٹھ دس سال پہلے کی کڑیاں ضرور تلاش کی جائیں۔ اس میں امریکہ، اسرائیل وغیرہ کا ہاتھ ضرور دیکھا جائے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ صرف مسٹر ڈیکلین والش ایک اخبار میں اپنی مرضی سے ایک فراڈ چھاپے اور امریکی حکومت کو علم نہ ہو۔ پاکستان کو بدنام کرنے کی سازش ہے، اور یقینا ہے۔

وادئ برما۔ مسلمانوں کے خون سے رنگی جارہی ہے

اے خاصہ خاصان رسل وقتِ دعا ہے

امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

پھر مسلمانوں پر وہ وقت آن پڑا ہے جب شدت سے ایک محمد بن قاسم کی ضرورت پڑ گئی ہے کہ آج ایک مسلمان بہن نہیں بلکہ برما (میانمار) کے ہزاروں مسلمان بھائی اور بہن صدا دے رہے ہیں، ان کی آہ و پکار عرش کو تو ہلا رہی ہے لیکن زمین کے خداؤں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی ہے۔ان کے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے بلکہ مہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ صم بکم عمی کے مصداق اندھے بہرے اور گونگے ہو چکے ہیں۔یہ وہ حکمران ہیں جو مسلمان ہیں تو اپنی عیاشیوں میں کھو چکے ہیں۔ ان کے پاس اپنے ملک کے عوام کے مسائل حل کرنے کا وقت نہیں ہے تو دوسرے ملک کے عوام کی کیا سنیں گے۔ سوائے ایک ملک کے جس کو حق حاصل ہے کہ وہ سب مسلمان ملکوں کا لیڈر بنے۔ ترکی، جو بے شک مصطفیٰ کمال پاشا بے نے سیکولر بنانا چاہا تھا لیکن بھلا ہو طیب اردگان بے کا جس نے وہاں اسلام کی روح پھونک دی۔ وہاں کے عوام کو سیکولرزم سے نکا کر اسلام کی راہ پر چلا دیا۔اس ترکی نے ہر مشکل وقت میں ہر مسلمان ملک کی مدد کے لیے سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا ہے۔ اور اس بار بھی وہ بازی لے گیا۔ سمندر میں گھرے ہزاروں بے گھر برمی روہنگی مسلمانوں کو اس نے نہ صرف پناہ دی بلکہ انکے کھانے پینے

اور رہائش تک کا انتظام کیا۔اور مزید کا انتظام بھی کر رہا ہے۔
جب کہ دوسری طرف انسانی حقوق کے نعرے بلند کرنے والے امریکہ، برطانیہ، روس، چین، فرانس، جرمنی، ناروے غرض سب بڑے بڑے ممالک بالکل خاموش بیٹھے ہیں۔ ان کو جیسے علم ہی نہیں کہ برما میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ بعینہٖ وہی صورت حال ہے جیسی انڈونیشیا کے ایک صوبہ مشرقی تیمور میں تھی۔ جہاں دنیا کے بقول عیسائیوں پر ظلم ہو رہا تھا۔ پھر دنیا نے اور خاص طور پر اقوامِ متحدہ نے وہ کھیل کھیلا کہ اس وقت کے انڈونیشین صدر جناب بی۔جے۔ حبیبی مشرقی تیمور میں ریفرنڈم کروانے پر مجبور ہو گئے۔ اور ریفرنڈم کے نتیجے میں اسی فیصد عوام نے آزادی کے حق میں فیصلہ دیا۔ وہاں کیا ظلم ہو رہا تھا شاید برما کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ کیونکہ کسی بھی عیسائی کی اس طرح کے مرنے کی خبر نہیں سنی گئی۔نہ ہی وہاں کسی عیسائی کو جلایا گیا۔ اب اقوامِ متحدہ کو کیا ہوا ہے؟ کیوں اس کو برما کے مسلمانوں پر ہونے والا ظلم نظر نہیں آ رہا۔ اور اگر آ رہا ہے تو کیوں وہ اس طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے؟ شاید اس لیے کہ یہ مسلمان ہیں اور اقوامِ متحدہ پر اصل حکومت امریکہ کی ہے اور امریکہ پر یہودیوں کی۔ تو یہودی کبھی نہیں چاہتے کہ مسلمان اس دنیا میں آبادی کے لحاظ سے پھیلیں اور نہ ہی وہ اپنے دین کی تعلیمات پر مستحکم طور پر عمل پیرا ہوں۔اسی لیے اقوامِ متحدہ کسی بھی قسم

کا کوئی ایکشن لینے سے پس و پیش سے کام لے رہا ہے۔

پاکستان کی عاصمہ جہانگیر جو ہر وقت انسانی حقوق کا نعرہ لگاتی رہتی ہے، آج وہ بھی بہری ہو چکی ہے، اندھی ہو چکی ہے۔ اس کو وہ خواتین نظر نہیں آ رہیں جن کی برہنہ مثلہ شدہ لاشوں کی تصاویر انٹرنیٹ پر، سوشل میڈیا پر ہر ذی روح انسان کو نظر آ رہی ہیں۔ لیکن وہ بوڑھی گھوڑی لال لگام کی طرح فیشن شو کی دلدادہ ہیں۔ چونکہ یہ تصاویر کسی فیشن شو کی نہیں ہیں اسلیے محترمہ کی نظر میں بلیک اینڈ وائیٹ ہیں۔ کہاں گئے انسانی حقوق کے دنیا میں رہنے والے اور علمبردار۔ جن کو دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی بھی غیر مسلم پر ہونے والے کسی بھی معمولی ظلم کی شکل تو نظر آ جاتی ہے۔ کہیں پر دھماکہ ہو اور غیر مسلم مارے جائیں تو ان انسانیت کے علمبرداروں کو ان پر ظلم نظر آ جاتا ہے لیکن پچھلے تین چار سالوں میں انتہائی ظالمانہ طریقے سے شہید ہونے والے مسلمانوں پر کیا گیا ظلم ان کو دھندلا دھندلا بھی نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کی سر بریدہ، کٹی پھٹی ، ٹکڑوں میں بٹی ہوئی لاشیں، بچوں کی کچلی ہوئی لاشیں ، خواتین کی عصمت دری کے بعد کی چیر پھاڑی کی ہوئی لاشیں ان کو قطعاً نظر نہیں آ تیں۔ افسوس ہے، تف ہے ، لعنت ہے ان لوگوں پر جو اپنے آپ کو پہلے مسلمان کہتے ہیں اور پھر انسانیت کے علمبردار کہتے ہیں۔

کہاں گئے طالبان جو خود کو امن کے داعی کہتے ہیں۔ جو کفار سے آخری سانس تک جہاد کرنے کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ کیا انکا جہاں صرف مسلمانوں کے خلاف ہے، پاکستانی افواج کے خلاف ہے، پاکستانی قوم کے خلاف ہے، پاکستانی بچوں کے خلاف ہے۔ افغانستان میں مسلمانوں کے خلاف ہے۔ انہیں کشمیر، فلسطین میں ہونے والا دشمن عناصر کا ظلم نظر نہیں آتا۔ اور سب سے بڑھ کر جو ظلم بربریت کی داستان برما میں رقم کی جارہی ہے اور ظلم کرنے والے بدھ مت کے ماننے والے ہیں۔ وہ بدھ مت جس کا بانی مہاتما بدھ مکمل طور پر امن کا داعی تھا۔ جنگ وجدل سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ انسانوں کو انسانیت کا درس دیتا تھا۔ جس نے امن کی خاطر بادشاہت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اسی سدھارتھ عرف مہاتما بدھ کے پیروکار آج برما میں چنگیز وہلاکو کو بھی مات دے رہے تھے۔ طالبان کو یہ ظلم نظر نہیں آرہا۔ اور کیوں نظر آئے، ظلم کرنے والے مسلمان نہیں ہیں اور نہ ہی یہ ظلم طالبان پر ہو رہا ہے۔ پھر کہاں ہے داعش۔۔ مشہور زمانہ داعش، جو طالبان کی طرح اسلام اسلام کی رٹ لگائے بیٹھی ہے۔ جس کو صرف شام، اردن، عراق میں ہی مسلمانوں کے بھیس میں غیر مسلم نظر آرہے ہیں۔ اس کی نظر بھی ان امن کے داعیان بدھ مت کے پیروکاروں پر نہیں پڑی۔ اسے برما میں ہونے والا ظلم بالکل بھی نظر نہیں آرہا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داعش اور یہ طالبان امریکہ کی پیداوار ہیں نہ کہ ان کا کوئی تعلق کسی بھی لحاظ سے اسلام سے ہے۔ یہ صرف نام کے اور حلیہ کے مسلمان ہیں، اسلامی تعلیمات سے ان کا دور

کا واسطہ بھی نہیں۔

تازہ خبر یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے برما کے مہاجرین کی کراچی میں آبادکاری پر غور شروع کر دیا ہے۔اس مد میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو مختلف قسم کی سفارشات حکومت کو پیش کرے گی، جس میں کراچی میں جگہ کی تلاش، اسکی خرید اور اس پر خیمہ بستی کی تعمیر شامل ہیں۔۔برما کے تیس لاکھ روہنگیں مسلمانوں میں سے دس لاکھ مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ جن جن کو موقع ملتا ہے وہ وہاں سے کشتیوں کے ذریعے بھاگ رہا ہے۔ قریب ترین ملک بنگلہ دیش بنتا ہے، لیکن وہاں پر آج بھی غداروں کی حکومت ہے جس نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھارت کے جیتنے کی خوشی میں انڈیا کو ایک ایوارڈ سے نوازا جس کو اس وقت کے بقول گوگل سب سے بڑے مجرم وزیراعظم مسٹر مودی نے وصول کیا۔اسکے بعد ظاہر ہے کہ بنگلہ دیش کی کبھی بھی یہ جرات نہ ہو گی کہ وہ برما کے مہاجر مسلمانوں کو اپنے ملک میں پناہ دے سکیں۔ جب کہ پاکستان نے کم از کم یہ قدم تو اٹھایا کہ مہاجرین کی آبادکاری کا سوچا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان اسلامی ممالک کی تنظیم کو غصہ دلاتا۔ اس کو اس کے ہونے کا احساس دلاتا اور پھر اسکے جھنڈے تلے مسلمان ممالک کی ایک فوج تیار ہوتی اور وہ نیٹو کے طرز پر بنا کسی سے اجازت مانگے برما کی طرف مارچ کرتی، اور اسے یہ دھمکی دیتی کہ اگر اس نے فوراً سے پہلے برما کے مسلمانوں کا قتلِ عام نہ چھوڑا اور ان کے

اسلامی و انسانی حقوق تسلیم نہ کیے تو بنا وقت ضائع کیے.برما پر حملہ کر دیا جائے گا۔ جس کا ذمہ دار.برما ہو گا۔ظاہر ہے جب ساٹھ سے زیادہ ممالک کی فوج یہ کام کرے گی تو دنیا کی کوئی طاقت اس فوج کو نہیں للکار سکتی۔ چلیں دیر آید درست آید کے مصداق پاکستان نے کوئی قدم تو اٹھایا۔ اللہ کرے کہ اگلا قدم ہر مسلمان حکومت کا اپنے اپنے ملک سے.برما کا سفارت خانہ ختم کرنے کا ہو۔ تاکہ.برما کی حکومت جو کہتی ہے کہ اسے اس بات کو کوئی علم نہیں ہے کہ آیا.برما میں کوئی ظلم بھی ہو رہا ہے۔.بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ حکومت کو معلوم نہ ہو اور روزانہ ہزاروں کی بنیاد پر مسلمانوں کو قتل کیا جارہا ہو۔
سوشل میڈیا میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی سازشوں کے پیچھے آشین ویراتھو کا ہاتھ ہے اور اس کی تصاویر نیٹ پر گردش کر رہی ہیں۔ بدھ بھکشو قتل کرتے ہوئے صاف نظر آتے ہیں۔ مسلمان بچوں کو تہہ تیغ کرتے، ان کو جلاتے ہوئے صاف نظر آتے ہیں اور حکومت میانمار کہتی ہے کہ اس کو علم نہیں۔ یعنی یہاں پر بھی امریکہ کا ہاتھ ہے کہ مسلمانوں کی نسل کشی جب آسانی سے ہو رہی ہے تو ہوتی رہے، کیا ضرورت ہے مشرقی تیمور کی طرح یہاں پر دخل اندازی کرنے کی۔ یہ تو انکا اندرونی مسلہ ہے۔اللہ پاک .برما کے مسلمانوں کی مدد فرمائے، اور سب مسلمانوں یہ توفیق دے کہ وہ اپنے طور پر ہر ممکن طریقے پر.برما کے مسلمانوں کی اخلاقی، معاشی، جسمانی طور پر مدد کر سکیں اور انہیں اس مشکل سے نکال سکیں۔آمین۔

میٹرو بس نے معیارِ زندگی بلند کر دیا ہے

حنیف عباسی صاحب نے اسلام آباد راولپنڈی میٹرو بس سروس کے افتتاح کے بعد آئی نائن ایچ نائن ایسٹ سروس روڈ کا افتتاح کرتے ہوئے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن ایک بات جو کہی وہ پڑھ کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ کہتے ہیں کہ میٹرو بس نے عوام کا معیارِ زندگی بلند کر دیا۔ کیا کہنے۔ اسی خبر کے ساتھ ہی دو صفحات چھوڑ کر ایک خبر اسی حوالے سے تھی کہ میٹرو کے ملازمین کو تین مہینے سے تنخواہ نہیں ملی اور اگر جلد ہی نہ ملی تو وہ ایک تو ہڑتال کریں گے دوسرا میٹرو بس سروس کو معطل کر دیں گے۔ چونکہ میٹرو سروس کو کسی نجی کمپنی کے زیرِ اہتمام دیا گیا ہے تو اس کمپنی نے ابھی تک اپنے ملازمین کو تنخواہوں کی مد میں کچھ بھی ادائیگی نہیں کی ہے۔ ملازمین نے یہاں تک کہا ہے کہ حنیف عباسی صاحب نہ تو فون اٹھاتے ہیں اور نہ ہی ان سے ملاقات کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ گھر پر موجود ہونے کے باوجود ان کے ملازمین جھوٹ بول کر کہ گھر پر نہیں ہیں ، ٹرخا دیتے ہیں۔ اور پھر حنیف عباسی صاحب کہتے ہیں کہ عوام کا معیارِ زندگی بلند کر دیا ہے۔

شاید معیارِ زندگی بلند ہوا ہو کہ مارکیٹ میں اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں چالیس سے پچاس فیصد اضافہ ہو گیا ہے، جب کہ ابھی بجٹ پر بحث ہو رہی ہے

اور تاجروں نے ابھی سے بجٹ کے حوالے سے اپنے پاس پہلے سے موجود اشیاء پر ہر وہ ٹیکس لگا دیا ہے جس کا بجٹ میں اعلان کیا گیا ہے۔ بجٹ میں نامیاتی پانی پر ٹیکس لگا ہے، دکانداروں نے صابن پر جمع کر دیا ہے۔ بجٹ میں موبائل انٹرنیٹ پر ٹیکس لگا ہے دکانداروں نے چینی پر لگا دیا ہے۔ بجٹ میں بجلی پر ٹیکس لگا ہے، تندور والے نے روٹی کا وزن کم کر دیا ہے۔ ٹماٹر سو روپے کلو، پیاز سو روپے کلو، مرغی کا ریٹ دو سو روپے کلو، سیب کم سے کم ڈیڑھ سو روپے کلو، کیلا ایک سو اسی سے دو سو تیس روپے درجن ہو گیا ہے۔ پٹرول کی قیمتوں کی سمری حکومت کے پاس جاتی ہے تو کیا حکومت کے پاس یہ اختیار نہیں کہ قیمتوں میں اضافہ نہ کرے۔ اور اگر نہ اضافہ کرے تو حکومت کو تو پھر بھی کوئی نقصان نہیں۔ جو ٹیکس پہلے سے موجود ہیں وہ تو پٹرولیم کمپنیوں نے ادا کرنے ہی ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ اضافہ بے حد ضروری ہے کہ کمپنیوں کو اپنے منافع میں ناجائز اضافہ بھی تو کرنا ہے۔ اور حنیف عباسی صاحب کہتے ہیں کہ میٹرو نے عوام کا معیارِ زندگی بلند کر دیا ہے۔

میں بھی میٹرو میں سفر کرتا ہوں ۔ اور آغاز سے ابھی تک بیٹھ کر سفر کرنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ میرا نصیب۔ لیکن ساتھ میں اگر کسی وجہ سے میٹرو کے آمد و رفت کے راستے سے ہٹ کر سفر کرنا ہو تو ٹیکسی لینی پڑتی ہے۔ اور ٹیکسی والوں نے پٹرول کی قیمتوں میں تین سے چار روپے اضافہ کے ساتھ اسی روٹ کا کرایہ

پچاس سے سو روپیہ بڑھا دیا ہے۔اور جب ان سے کہا جائے کہ بھائی جان پٹرول کی قیمت تو صرف اتنی بڑھی ہے تو کہتے ہیں کہ چھوٹی بھائی ٹماٹر، پیاز، سبزی اور پھلوں کی قیمتیں بھی تو بڑھی ہیں۔ اور یہ سن کر ہم اپنے کان دبا لیتے ہیں۔ کہ ان کی بات بالکل بجا ہے۔ آخر کو انھوں نے صرف پٹرول ہی نہیں برداشت کرنا ہوتا بلکہ گاڑی کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے، گھر بھی چلانا ہوتا ہے، بچوں کی سکول فیس بھی ادا کرنی ہوتی ہے۔ واقعی عباسی صاحب، عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو گیا ہے کہ وہ یہ سارے خرچے اس مہنگائی کے باوجود پورے کر سکتا ہے۔

اگر میٹرو بس کی بجائے اسی مری روڈ کو کشادہ کرکے اس پر تین سو کے لگ بھگ بڑی بسیں چلادی جاتیں تو چھپن ارب روپے کی بجائے شاید چھ ارب روپے کا ہی خرچہ آتا۔ وہ بسیں حکومت کے زیرِ نگرانی چلتیں تو پرائیویٹ گاڑیوں کے مالکان کی جرات نہ ہوتی کہ اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتے۔ اور جو باقی پچاس ارب روپے بچ جاتے اس سے جو پاکستان میں ہزار پندرہ سو کارخانے بند پڑے ہیں ان کو اس رقم میں سے ایک ایک دو دو کروڑ روپے عنایت کردیتے کہ وہ اپنا کارخانہ دوبارہ چلانے کے قابل ہوتے۔ پھر بھی کوئی پانچ دس ارب روپے کی رقم بچ جاتی تو کچھ سو دو سو نئے کارخانے شروع کر دیے جاتے۔ اس سے کیا ہوتا کہ شاید کچھ بھی نہیں تو تیس چالیس ہزار افراد کو روزگار مل جاتا اور تیس

چالیس ہزار افراد کو روزگار ملنے کا مطلب اتنے خاندانوں کی کفالت یعنی اڑھائی تین لاکھ افراد کے لیے روٹی روزی کا بندوبست۔ میٹرو سے کیا ہوا ہوگا، دو تین ہزار افراد (یہ میں زیادہ سے زیادہ تعداد بتا رہا ہوں) کو روزگار ملا ہوگا، جن کو ابھی تک بقول اخبار کے تنخواہیں ہی نہیں دی گئیں۔

اسلام آباد میں ابھی میٹرو زوروں پر ہے، ابھی تک منچلے اس پر سوار ہو کر اس کی سیر کرتے ہیں۔ بزرگوں اور معمر افراد کے لیے جو سیٹیں رکھی گئی ہیں ان پر جوان اور نوجوان تشریف فرما ہوتے ہیں۔ سیٹیں بھی اتنی بڑی بس میں مشکل سے تیس پینتیس کے قریب ہیں۔ اس وجہ سے ایک وقت میں پچاس سے زیادہ افراد کھڑے ہو کر سفر کرتے ہیں جس میں پچاس فیصد بزرگ ہوتے ہیں۔ خواتین کو بھی کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑ رہا ہے۔ عباسی صاحب، کیا یہی معیارِ زندگی ہوتا ہے جو بلند ہوتا ہے۔ لاہور میں میٹرو بس کے سٹیشنز کے آس پاس جو سیڑھیاں بنائی گئی ہیں وہ شاید قدرے کمزور ہو چکی ہیں۔ کیونکہ پچھلے دنوں کی ایک خبر کے مطابق سیڑھیاں اترتے ہوئے جب ایک بزرگ نے سہارے ساتھ ریلنگ کا سہارا لیا تو ریلنگ کے کمزور ہونے کی وجہ سے وہ جڑ سے اکھڑ گئی اور بزرگ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکے۔ سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرے۔ آخری خبریں آنے تک وہ شدید زخمی تھے۔ راولپنڈی اسلام آباد کی سیڑھیوں کا اور انکی ریلنگ کا بھی یہی حال ہونا ہے۔

پنجاب کے تعلیمی بجٹ کے لیے آٹھ سو ارب روپے سے زیادہ کی رقم رکھی گئ ہے۔ایک کارٹون میں یہ کہا گیا ہے کہ پچھلے سات سالوں میں ایک بھی نیا سکول نہیں تعمیر کیا گیا۔ البتہ دانش سکولوں کی بات میں نہیں کرتا۔ لیکن اس کارٹون میں یہ بھی تھا کہ اگر ان سکولوں میں تعلیم کی بجائے سریا سیمنٹ استعمال ہوتا تو یقینا ہزار پندرہ سو سکول بن چکے ہوتے ۔ چاہے استاد، شاگرد ہوتے یہ نہ ہوتے۔ اس کے باوجود بھی راولپنڈی اسلام آباد میں ایک اور میٹرو پراجیکٹ شروع کرنے کا پروگرام ہے، کراچی میں گرین بسیں، انٹر سٹی ریل ٹریک شرور کرنا ہے، جو کہ ۲۰۱۷ تک مکمل ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے کہ عوام کو سفر کی سہولت تو ملے گی، لیکن ان کی غربت، ان کے لیے بڑھتی ہوئی مہنگائی، ان کے لیے ہسپتالوں کا علاج اور غیر موجود دوائی کی حالت اسی طرح رہے گی۔ کہاں کا معیارِ زندگی؟

میٹرو شروع کرنے کی بجائے ٹرانسپورٹ کا نظام اگر درست کر دیا جاتا، اس پر باقاعدہ اچھے طریقے چیک اینڈ بیلنس رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پہلے سے موجود ٹرانسپورٹ سے ہی عوام کو فائدہ نہ ہو۔ لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے ؟؟؟

کراچی ۔۔ پانی اور بجلی کا مسئلہ

کراچی میں اللہ کا امتحان زوروں پر ہے۔ اسے آزمائش بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ بس اتنا کہ اگر اسے امتحان سمجھیں گے تو صبر کرکے اللہ کی طرف رجوع کریں گے، اسی سے مدد طلب کی جائے گی، اسی کو مشکل کشا سمجھا جائے گا۔ اور مسئلے کو حل کرنے کی کوشش اپنی مدد آپ کے تحت کی جائے گی۔ اور اگر آزمائش جانیں گے تو پھر اللہ سے گلے شکوے ہوں گے۔ نہ کوئی دعا ہو گی، نہ کسی سے دعا کی درخواست ہو گی۔ نہ ہی اپنے مسائل خود حل کرنے کی طرف خیال جائے گا۔ اب ہم کراچی سے دور بیٹھے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کے دلوں کا حال کیسے جان سکتے ہیں کہ آیا وہ اسے امتحان سمجھ رہے ہیں یا آزمائش یا پھر اللہ کی طرف سے آیا ہوا کوئی عذاب یا اسکی کوئی ہلکی سی علامت۔ یہ تو رب جانے کہ کیا ہے۔ اور بندے جانیں کہ وہ کیا سوچتے ہیں۔ پچھلے ایک ہفتے میں ہزاروں افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ گرمی کی شدت کچھ اس قسم کی ہے کہ شاید برسوں پہلے کبھی ہوئی ہو تو ہو۔ گرم ہوائیں گھوم پھر کر کراچی کے اندر ہی بسیرا کر رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کراچی کے ارد گرد کسی نے اس طرح کا گھیرا ڈال دیا ہے کہ ہوا کو باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں مل رہا۔ جس کی وجہ سے وہاں حبس انتہا کا ہوگیا ہے۔ ہوا میں نمی کی وجہ سے بھی حبس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ایک طرف گرمی کی یہ صورت حال ہے تو

دوسری طرف کافی عرصہ سے کراچی میں پانی کی قلت میں بھی اضافہ ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی ہے کہ ساحلِ سمندر کے کنارے رہتے ہوئے بھی کراچی کے لوگ پانی کو کیوں ترس رہے ہیں۔کیا سمندر کے پانی کو پینے کے پانی میں تبدیل کرنا کوئی ناممکن کی حد تک مشکل کام ہے۔اس میں تو شک ہی نہیں کہ حکومتِ وقت ہی نہیں چاہتی۔ لیکن آخر کو کراچی میں ماشاءاللہ کافی امیر کبیر لوگ بھی بستے ہیں اور صاحبِ دل بھی ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو اسی سمندر کے پانی کو پینے کے پانی میں تبدیل کرنے کے تین چار سسٹم ہی لگا دیں تو میرے خیال میں پورے کراچی کو پینے کا پانی بآسانی مل سکتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سسٹم تو سمندر کے کنارے یا سمندر کے قریبی علاقوں میں لگیں گے تو اس علاقے سے دور رہنے والوں کو پانی کس طرح مہیا کیا جائے گا تو جہاں اتنا خرچہ کیا جا سکتا ہے وہاں پانی کے پائپ بھی بچھائے جا سکتے ہیں۔ سمندر کے پانی کو پینے کے پانی میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے، کسی بھی کیمیا دان یا طبیعات والا بھی بتا سکتا ہے۔جو طریقہ بھی استعمال کیا جائے گا اسکی بنیاد تو سمندر کے کھارے پانی سے بخارات بنا کر اس کو استعمال کرنے کی بات ہے۔اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔دوسرا طریقہ شاید پانی کو وسیع پیمانے پر فلٹریشن کے طریقے سے بھی صاف پانی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر کچھ

اس طرح کا نظام بنایا جائے کہ سمندر کے پانی کو پائپوں کے ذریعے اس نظام تک لا کر اس کو ابالا جائے اور اتنا ابالا جائے کہ وہ ابل ابل کر تین چوتھائی رہ جائے۔ پھر اس پانی کو نتھار کر پینے کے قابل پانی اکٹھا کرکے پائپوں کے ذریعے گھر گھر پہنچایا جائے۔ یہ تو صرف میرے جیسے اناڑی کے خیالات ہیں لیکن اگر سائنسدان چاہیں تو کیا کچھ نہیں کر سکے۔ ویسے انٹرنیٹ سے بھی سمندر کے کھارے پانی کو وسیع پیمانے پر صاف کرنے کے بہت سے طریقے مل جائیں گے۔

اس کے بعد بات آتی ہے کراچی الیکٹرک کمپنی کی طرف سے بجلی لوڈ شیڈنگ کی۔ تو اسکا کہنا تو بجا ہے کہ وہ لوگ بجلی کا بل نہیں دیتے الٹا بجلی چوری کرتے ہیں تو ان کو حکومت کی طرف سے بجلی دینے کا کوئی حق نہیں بنتا۔ سوال یہ ہے کہ کراچی الیکٹرک کمپنی کو تو پرائیویٹائز کر دیا گیا ہے۔ وہ اب حکومتی ادارہ نہیں رہا۔ بلکہ نجی طور پر کچھ افراد اسے چلا رہے ہیں۔ پھر حکومت کا اختیار کیا ہے؟ اگر کمپنی اپنے شہریوں کو بجلی مہیا نہیں کر سکتی تو پھر اسکو چاہیے کہ حکومت کو واپس کردے لیکن مفت میں۔ کیونکہ جو پیسے اس نے حکومت کو دیے تھے یہ کمپنی خریدنے کے بدلے، وہ تو پورے کر چکی ہے۔ بلکہ اس سے شاید کافی زیادہ ہی کما چکی ہو گی۔ کیا کمپنی کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوں گے کہ وہ سولر سسٹم سے یا ہوائی چکیوں سے بجلی پیدا کر سکے۔ اگر حکومت پنجاب کی طرح جس نے بہاولپور میں سولر پارک تعمیر کیا ہے اور اس سے شاید سو

میگا واٹ بجلی پیدا کی جائے گی، حکومت سندھ یا کراچی الیکٹرک کمپنی والے کراچی میں اس طرح کا پارک بنالیں، جو کہ ناممکن ہر گزی نہیں ہے۔ کراچی میں ویسے بھی وسیع پیمانے پر خالی زمین موجود ہے، جو فی الحال کسی بھی مد میں استعمال نہیں کی جارہی تو سو میگا واٹ کیا دو تین سو میگا واٹ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور پورے کراچی کو بغیر کسی رکاوٹ کے بجلی مہیا کی جاسکتی ہے۔ اس طرح کے پارک بنانے پر صرف ایک بار کا خرچہ ہو گا، پھر تو اللہ پاک نے پاکستان پر وہ کرم کیا ہوا ہے کہ سورج کی روشنی تقریباً ہر وقت موجود رہتی ہے۔ شمسی توانائی کے ساتھ ساتھ کراچی میں ہوا بھی ہمہ وقت چلتی رہتی ہے۔ سمندر کے کنارے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں ہوائی چکیاں لگائی جاسکتی ہیں اور ان سے بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پچاس ساٹھ میگا واٹ بجلی ان سے بھی حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔

موجودہ صورت حال میں بجلی پیدا کرنے کے لیے کم از کم یہ دونوں طریقے از حد ضروری ہیں۔ اور ان کو ہنگامی بنیادوں پر اگر شروع کیا جائے تو دو ماہ سے زیادہ وقت نہیں لگے گا اور بجلی کی پیداوار بھی شروع ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر تھر کے کوئلے سے بھی بجلی کی پیداوار کو مزدی بڑھایا جائے تو جہاں ۲۰۱۸ کا ٹارگٹ دیا گیا ہے کہ اس وقت تک بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم ہو جائے گی، چھ ماہ کے اندر اندر بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کی جا سکتی ہے۔ جہاں جہاں

گھروں کی چھتیں ملی ہوئی ہیں اور پچاس ساٹھ گھر ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں، حکومت ان گھروں کے اور شمسی پینل رکھ دے اور انکا سسٹم کہیں ایک جگہ جوڑ دے جہاں ان پینل سے حاصل ہونے والی بجلی سٹور ہو۔ اور میرے خیال میں ان گھروں کی وجہ سے پیدا ہونے والی بجلی سو گھروں تک کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنا کوئی مشکل نہیں، لیکن شاید سب سے بڑا مسلہ یہ ہے کہ شمسی توانائی کے پینلز کے لیے زمین کہاں سے آئے گی، کہ یہاں تو لوگوں نے زمینوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ وہ کیوں اپنی جائیداد عوام الناس کے مفاد کے لیے مہیا کریں گے۔ اسکے ہوائی چکیوں کے لیے بھی ایماندارانہ نظام قائم کرنا آسان نہیں۔ کیونکہ ہر محکمہ میں کرپشن کی بھرمار ہے۔ لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اگر حکومت چاہے، جس طرح راولپنڈی میٹرو بس چلادی، کتنی رکاوٹیں آئیں، عدالتوں تک لوگ گئے، سٹے آرڈر لیے گئے، لیکن جب حکومت کرنے پر آئی تو سب رکاوٹیں دور ہو گئیں۔ صرف بارش کی وجہ سے یہ میٹرو بس کی سروس تین سے چار ماہ لیٹ ہو گئی، ورنہ کوئی رکاوٹ رکاوٹ نہ رہی۔ اسی طرح اگر حکومت چاہے تو پاکستان سے چھ ماہ کے اندر اندر لوڈ شیڈنگ ختم ہو سکتی ہے۔ کالا باغ ڈیم نہ بھی بنے صرف بجلی پیدا کرنے کی بات کر رہا ہوں، نہ کہ سیلابی صورتحال سے نمٹنے کی یا پانی) ذخیرہ کرنے کی) تو بھی اس عرصہ میں بیس ہزار میگا واٹ تو کیا پچیس ہزار میگاواٹ بجلی بنائی جا سکتی ہے۔

سمندر کے کنارے پر رہتے ہوئے جب کراچی شہر کے باسی پیاسے مریں تو افسوس کا مقام ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا تھا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کا جواب دہ قیامت کے دن اللہ کے دربار میں وہ ہوں گے۔ اور جناب عابد شیر علی صاحب پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی گرمی سے مر گیا تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ جنابِ عالی ! آپ کراچی سمیت پورے پاکستان کے عوام کو بجلی مہیا کردیں، پیاس ختم کرنے کے لیے صاف شفاف پانی مہیا کردیں، پھر اگر وہ مریں تو بے شک ان کا اپنا قصور ہوگا۔ آپ کا گریبان قیامت کے دن کوئی نہیں پکڑے گا۔ لیکن یہ بجلی پیدا کیسے ہو، پانی کو صاف شفاف کیسے بنایا جائے، کیونکہ اس کام کے لیے چاہیں اربوں روپے، جو صرف میٹرو اور موٹر وے کے لیے موجود ہیں، اس طرح کے کسی کام کے لیے بھی نہیں۔۔۔۔۔۔

شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔۔۔

"اور تمھیں کیا معلوم، شب قدر کیا ہے؟" سورۃ القدر کا ایک سوال۔۔ جس کا جواب یہ دیا گیا کہ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یہ تو ایک جواب تھا۔ دوسرا جواب یہ تھا کہ اس رات میں قرآن پاک کو نازل کیا گیا۔ لیکن سوال پھر یہی ہے کہ شب قدر کیا ہے؟ ہزار مہینوں سے بہتر ہے تو کس حوالے سے۔ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جو کسی اور رات میں یا ان ہزار مہینوں میں نہیں۔ کیا صرف قرآن پاک کا نزول ہی اسے خاص بناگیا ہے؟ یا پھر اس میں حضرت جبرائیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک فوج لے کر اللہ کے حکم سے دنیا میں مختلف احکامات لے کر اترتے ہیں یا پھر اس لیے کہ یہ رات صبح تک سلامتی کی رات ہے؟ دیکھیں قارئین کرام، اللہ پاک کا انداز بیان۔ ایک چھوٹا ایک مختصر سی صورت میں بظاہر تو تین مختلف عوامل بتائے گئے ہیں جن کی بنا پر شب قدر کو ہزار مہینوں پر افضیلت دی گئی۔ اگر قرآن کی نزول کی بات کی جائے تو اس سورت سے یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ رات ماہِ رمضان میں ہی پائی جاتی ہے۔ لیکن قرآن ہی کی ایک اور آیت (نمبر ۱۸۵، سورۃ البقرہ) کہ " رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں اس قرآن کو نازل کیا گیا۔۔۔" اس بات کی گواہی ہے کہ قرآن کا نزول جس رات میں ہوا، وہ بابرکت رات ماہِ رمضان میں ہی پائی جاتی ہے۔

اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے ایک مردِ مجاہد و عابد کا واقعہ سنایا۔ کہ وہ وہ شخص ہزار ماہ دن کو جہاد کرتا اور رات کو اللہ کی عبادت میں مصروف رہتا۔ تو صحابہ کرامؓ کو حسرت ہوئی کہ کاش ان کی عمریں بھی طویل ہوتیں کہ وہ بھی اللہ کی عبادت اس طرح خشوع و خضوع سے کرتے۔ اور دن کو اسی طرح اللہ کی راہ میں تلوار کے جوہر دکھاتے۔ لیکن کم عمری کی وجہ سے وہ کہاں سابقہ امتوں کے ان افراد کے ہم پلہ ہو سکتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرما کر اس امت پر ایک عظیم احسان فرمایا۔ اور اس میں فرما دیا کہ ایک رات تمام سال میں ایک ماہِ رمضان میں ایسی ہے جو اس طرح کے ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ صحابہ کرام تو عاشق تھے اس طرح کی عبادتوں کے، جہاد کے۔ انھوں نے جی جان سے لبیک کہا اور ہوش میں رہ کر بے خود ہو گئے۔

شب قدر ہے کیا؟ قدر سے تقدیر بھی مشتق ہے۔ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس رات کو مسلمان اپنی تقدیر بنا سکتے ہیں۔ اپنے گناہوں کو مٹا سکتے ہیں۔ اپنی نیکیوں کو بڑھا سکتے ہیں۔ جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں، پل صراط سے بجلی کی مانند گزرنے کے لیے حل نکال سکتے ہیں۔ جہنم سے نجات پا سکتے ہیں۔ اپنے والدین کی، اپنے اہل و عیال کی مغفرت کرا سکتے ہیں۔ یہ قبولیت کی رات ہے۔

اس میں کی گئی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ خلوصِ دل سے دعا مانگی جائے، جس میں کوئی ریا نہ ہو، کوئی دغا نہ ہو۔ دعا مانگتے ہوئے سامنے صرف خدا ہو، کوئی دوسرا نہ ہو۔ دل میں خیال یار کا ہو تو یار بھی صرف خدا ہو۔ دنیا داری کو پیٹھ پیچھے چھوڑ کر جب دعا کی جائے گی، آنکھوں سے آنسو بہتے ہوں گے، سسکیاں، آہیں ہونٹوں سے نکلتی ہوں گی اور اٹھتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہوں گے تو ایسے میں کی گئی دعا عرش کو کیوں نہ ہلائے گی۔ جب عرش ہلے گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ پاک اس دعا کو رد کر دے۔ ناممکن۔۔۔

یہ رات ملے گی کیسے؟ بس دس راتیں ہی تو کالی کرنی ہیں۔ کوئی مشکل نہیں۔ ہم کئی کئی راتیں گناہ کی خاطر جاگ جاتے ہیں، چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبائر۔ تو صرف دس راتیں کیا ہم اس شب قدر کی تلاش میں نہیں جاگ سکتے۔ یاد رہے کہ یہ جاگنا صرف بستر پر کروٹیں بدلنے کا نام ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان راتوں میں قرآن کی تلاوت کو دماغ میں بٹھانا ہے، دل کی نگاہ سے اس کو دیکھنا ہے اور زبان سے اس کو پڑھنا ہے اور اس طرح پڑھنا ہے کہ اقرار باللسان و تصدیق باالقلب والی بات بن جائے۔ عبادت کرنی ہے تو اس طرح کہ پیشانی سجدے کر کرکے محراب کا نشان واضح کر دے۔ رکوع میں پڑے پڑے کمر میں خم آجائے۔ قیام میں ہوں تو پاؤں میں ورم آجائے۔ جو بیٹھے قعدہ میں تو آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گریں اور دامن کو اس قدر تر کر دیں کہ جب نچوڑا جائے تو فرشتے وضو کریں۔ پھر جو دعا

کے لیے بارگاہِ ربِ کائنات میں ہاتھ اٹھیں تو ہونٹ ساکن ہوں اور دل سے دعا نکل رہی ہو اور آنکھوں کے آنسوؤں کے رستے فضائے محیط کو چیرتی ہوئی عرشِ بریں تک پہنچے اور وہاں سے صدا آئے۔۔۔ لبیک یا عبدی، لبیک۔۔۔ می حاضر ہوں، میرے بندے، میں حاضر ہوں۔

کتنے سادہ لوگ ہیں جو بڑوں نے بتایا، اس کو آمنا و صدقنا کہہ دیا۔ کبھی خود سے تحقیق نہیں کی۔ جب انھیں کہا گیا کہ بھائی شب قدر رمضان کی ۲۷ تاریخ کو نہیں آتی بلکہ رمضان کے آخری عشرے کی کوئی سی بھی طاق رات ہو سکتی ہے۔ لیکن جو ان کے دماغ میں بیٹھ گیا، سو بیٹھ گیا۔ رسول پاک ﷺ کے واضح احکامات کے باوجود لوگوں کی اکثریت ۲۷ ویں رمضان کو جاگ کر اللہ کی عبادت کرتی ہے۔ ویسے تو ہر رات کو ہی اللہ کی عبادت کرنی چاہیے کہ ہمیں اللہ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور عبادت کا مقصد معرفت الٰہی حاصل کرنا ہے۔ ورنہ تو بقولِ اقبال ۔۔ ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں۔۔

جیسا کہ حدیث قدسی میں اللہ تعالٰی فرماتا ہے: ترجمہ: میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا تاکہ میری پہچان ہو۔ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد اور اس کی عبادات کا مغز اللہ کی پہچان ہے' جس نے اس مقصد سے روگردانی کی بے شک وہ بھٹک گیا۔ نہ دین ہی اس

کا ہوا نہ دنیا۔ مرنے کے بعد قبر میں انسان سے پہلا سوال یہ پوچھا جائے گا'''' بتا تیرا رب کون ہے؟ جس نے اپنے ربّ کی پہچان ہی حاصل نہ کی ہو گی وہ اس سوال کا کیا جواب دے پائے گا۔ اور رب کی پہچان کا سب سے اولین طریقہ اس کی عبادت کرنا ہے۔

رمضان کے روزوں کے بارے میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اسکی جزا دوں گا۔۔ ایک دوسری جگہ اسطرح فرمایا گیا ہے کہ میں ہی اسکی جزا ہوں۔ جب رمضان کے روزے کی یہ فضیلت ہے تو اس ماہِ مبارک میں بدنی عبادت یعنی رکوع و سجود کی کیا جزا ہو گی۔ اور پھر جب رب خود فرماتا ہے کہ ایک رات میں نے اسی بنا دی جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے تو اس رات میں رب کی بارگاہ میں رکوع و سجود میں پڑے رہنے کا ثواب بھی شاید ہزار درجے زیادہ ہو۔ جب ہمیں یہ نہیں معلوم کہ شب قدر کون سی رات ہے تو کیا یہ زیادہ بہتر نہیں کہ بجائے اک رات کے رمضان کے آخری عشرے کی ہر رات کو عبادت کی جائے نہ کہ صرف ستائیسویں رات کو یا ہر طاق رات کو۔ جس طرح دنیا میں وقت کے فرق کی وجہ سے تاریخ آگے پیچھے ہوتی ہے، اسی طرح آج سعودیہ میں اگر انیسواں روزہ ہے تو پاکستان میں اٹھارواں ہو گا (یہ مثال دی ہے)۔ تو کیا ہی بہتر ہو کہ ہر رات کو اسی طرح عبات کی جائے جس طرح عبادت کا حق ہے۔اس رات کا تعین یقینا اسی لیے نہیں کیا گیا کہ بندہ پورے خشوع و خضوع سے، تمام دنیا کو پس پشت ڈال

کر، پوری مستی کے عالم میں یعنی عالمِ جذب میں ڈوب کر کچھ اس طرح رب کی عبادت کرے کہ اللہ خود فرشتوں سے کہے دیکھو اسے کہتے ہیں عشق۔۔ پھر جب عشق کی معراج نصیب ہو تو بندہ پکار اٹھے کہ واقعی شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

عید بھی جنت کی کمائی ہے

اس بچے نے بڑی حسرت سے دکان میں ٹنگے ہوئے عید کے لباس کو دیکھا۔ پھر ایک آہ بھر کر آگے بڑھ گیا۔اس نے اپنی کمر پر کاغذ، پلاسٹک کی اشیاء اکٹھی کرنے والا ایک بڑا تھیلا سا اٹھایا ہوا تھا۔ میں چند دن پہلے بازار سے گزر رہا تھا کہ اس بچے پر اس وقت میری نظر پڑی جب وہ حسرت بھری نگاہوں سے دکان کے باہر کھڑا ونڈو شاپنگ کر رہا تھا۔اور پھر جب اس نے نظریں جھکا کر آہ بھری اور آگے بڑھا تو یقین مانیے کہ میرے دل پر بھی گویا ایک چھری چلی۔ مجھے اپنے بچوں کا خیال آیا۔اگر ان کو عید پر نیا لباس نہ دیا جائے تو وہ پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ تو یہ اور اس طرح کے ہزاروں بچے بھی تو کسی کی اولاد ہوں گے۔ کیا ان کا حق نہیں کہ وہ بھی اس مبارک انعام میں سے اپنا حصہ وصول کر سکیں۔یقیناً ہے۔ لیکن ہم بے حس لوگ، صرف اپنے آپ میں مگن رہنے والے ، اور اپنے بارے میں ہی سوچنے والے، کب ان پر نگاہِ خیر ڈالتے ہیں۔

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ ختم ہو چکا ہو گا، جب آپ اس تحریر کو پڑھ رہے ہوں گے۔ رمضان کا مقدس ماہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ جس طرح ہم بھوک پیاس اللہ کی رضا کے لیے برداشت کرتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کو بھی خیال رکھنا

چاہیے جن کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں۔ ان کو بھی رمضان کے مہینے میں اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے۔ حدیثِ پاک ﷺ میں ہے۔ " خدا کی قسم وہ شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جو خود تو پیٹ بھر کر سوئے اور اسکا پڑوسی بھوکا ہو۔ " یہ بات تین دفعہ دہرائی۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کا دیگر عوام کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے۔ یعنی ایمان کی ایک شرط قرار دی گئی ہے کہ ہمسائے کے حقوق کا خیال رکھنا گویا واجب ہے۔ پھر قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔ " اور والدین کے ساتھ احسان کرو، اور قرابت داروں کے ساتھ، اور یتیموں کے ساتھ، اور مساکین کے ساتھ اور مسافروں کے ساتھ۔۔۔۔۔الاخیر۔۔۔" میرے نقطہ نگاہ سے مساکین میں ہر وہ شخص شامل ہے جو حاجت مند ہے۔ بے شک حاجت روا اللہ کی پاک ذات ہے۔ لیکن وہ ان مساکین کی حاجت روائی کے لیے ہم انسانوں میں سے ہی کسی نہ کسی کو وسیلہ بناتی ہے۔ تو کیوں نہ وہ وسیلہ آپ خود بنیں۔ اور نہایت آسان ہے۔ آپ دل میں صرف اس بات کی نیت رکھیں کہ آپ اپنے دل کو لوگوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رکھیں گے، تو اللہ پاک خود ہی آپ کے پاس اپنے مہمان بھیجیں گے یا پھر آپ کو ان کی راہ دکھائیں گے۔

یہ بات کرنے کا مقصد آپ کی توجہ اس طرف لانا ہے کہ عید کی آمد آمد ہے۔ مذکورہ بالا بچے کی طرح بہت سے بچے آپ کو گلیوں میں پھٹے پرانوں کپڑوں میں گھومتے پھرتے نظر آئیں گے جو آپ کے بچوں کو حسرت کی نگاہوں سے، آنکھوں میں

مچلتے آنسوؤں سے دیکھتے ہوں گے۔ ان کے لیے اگر اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تو ایک عدد کپڑوں کا جوڑا ہی خرید کر دے دیں۔ اپنے بچوں کے لیے آپ نے ہزاروں روپے کا جوڑے خریدیں ہوں گے، تو ان کے لیے کیا آٹھ سو، ہزار کا ایک جوڑا نہیں خرید سکتے۔ ہر محلے میں کچھ نہ کچھ گھر تو ایسے لازمی ہوتے ہیں جو اس طرح کے کئی جوڑے اس طرح کے معصوم بچوں کو خرید کر دے سکتے ہیں۔ نہ صرف کپڑے خرید کر دیں، بلکہ اگر اور زیادہ نیکی کریں تو ان کے گھروں میں زیادہ نہ سہی، ایک وقت کا کھانا ہی بھیج دیں۔ مٹھائی بھیج دیں کہ وہ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔جب ہر اِس طرح کے گھر سے نیکی کا یہ کام ہو گا تو میرے خیال میں اگر ہر بچے کو نہیں بھی تو ساٹھ ستر فیصد بچوں کو عید کے انعام میں سے اپنا انعام مل جائے گا۔اور نیکی تو کبھی رائیگاں نہیں جاتی، زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر آپ کے سامنے کسی دوسری صورت میں سامنے آتی ہے۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھیں کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔

رمضان میں ہم نے اللہ کی بے بہا نعمتیں، رحمتیں سمیٹی ہوتی ہیں، لیکن ان پر اس وقت پانی بہا دیا جاتا ہے جب عید کا دن آتا ہے۔ پہلے تو نمازِ فجر کی ادائیگی ہی مشکل ہو جاتی ہے کہ چاند رات کی خوشی میں بازاروں میں، چوباروں میں ہلہ گلہ کیا ہوتا ہے۔ شریعت کا ہر قانون پاؤں کے نیچے روندا ہوتا ہے۔ ملعون شیطان رمضان کے دنوں کی قید کا غصہ اس ایک چاند رات میں نکال دیتا

ہے۔ مخلوط محفلیں جمتی ہیں۔ تو یہ سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ ساری نیکیاں جو کمائی ہوتی ہیں وہ کھوہ کھاتے چلی جاتی ہیں۔ بے شک نیکیاں ضائع تو نہیں ہوتیں، لیکن چاند رات کو صغیرہ، کبیرہ جتنے گناہ سرزد ہوتے ہیں وہ رمضان کے انتیس تیس دنوں پر حاوی ہوجاتے ہیں۔جب کہ اللہ پاک نے یہ عید کا دن ہمیں ہماری رمضان المبارک میں کی گئی محنت کے صلے میں انعام کے طور پر عطا کیا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس دن روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ اور اس انعام کو چیتھڑوں میں بانٹ کر اس کی بندر بانٹ کر دیتے ہیں۔اپنی اپنی خوشی میں مگن ہو کر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمسائیوں کو دو دن سے کھانا تک نصیب نہیں ہوا، چہ جائیکہ عید کیا ہو گی۔

ہمیں ہر گز نہیں بھولنا چاہیے کہ رسول پاک ﷺ عید کی نماز کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ بچے نظر آئے جو کھیل رہے تھے۔ ایک بچہ ایک طرف کھڑا پرانے میلے سے کپڑے پہنے حسرت سے ان بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ پاس پہنچے۔ اس بچے سے پوچھا کہ وہ کیوں الگ کھڑا ہے؟ ان کے ساتھ کیوں نہیں کھیل رہا۔ اور اس نے نئے کپڑے کیوں نہیں پہنے ہوئے؟ وہ بچہ رو دیا۔ اور کہنے لگا کہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں، اسلیے وہ نئے کپڑے نہیں پہن سکتا۔ رسولِ پاک ﷺ جو کہ رحمۃ للعالمین ہیں، اس بچے کے آنسو صاف کیے۔ اور اسے کہا کہ کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ تمھارا باپ محمد ﷺ ہو اور ماں عائشہؓ ہوں۔ بچے کو اور

کیا چاہیے تھا۔ جھٹ سے حامی بھر لی۔ اسے لے کر گھر آ گئے۔ حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ اس کو نہلاؤ۔ نئے کپڑے پہناؤ۔ جب حضرت عائشہؓ نے یہ کام سرانجام دے دیے تو رسول پاک ﷺ اس بچے کو اپنے کندھے مبارک پر سوار کرکے مسجد کی جانب چل دیے۔ خوشی اس بچے کے چہرے سے ایسے پھوٹ رہی تھی جیسے چودھویں کا چاند چمک رہا ہو۔ تو قارئین کرام۔ ہم پورے سال میں ایک دن عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر عشق رسول کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو کیا عید کے دن ہم رسول پاک ﷺ کی پیروی اس طریقے سے نہیں کر سکتے؟

بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔۔۔

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

واقعی مدہوشی ہی ہوتی ہے جو انسان کو خدا بنا دیتی ہے نہ کہ یاد دلاتی ہے۔ اگر یہ مدہوشی نہ ہوتی تو انسان بتوں کو سجدہ کیوں کرتا۔ انسان درختوں، حیوانوں کو اپنا خدا کیوں مانتا۔ یہ گنیش بمعنی ہاتھی، یا بجرنگی یعنی دو دماغ والا بندر یا پھر کالا پتھر انسان کے سجدے کے لائق کیوں ہوتا۔ یہ مدہوشی ہی تو ہے جو انسان کو انسانیت کی معراج عرش سے پاتال میں کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیتی ہے۔ اگر یہ مدہوشی نہ ہوتی تو انسان انسان کو سجدہ کیوں کرتا۔ کبھی یہ انسان فرعون نمرود کے روپ میں خدائی دعویدار ٹھہرا تو کبھی مردو ملعون مرزا قادیانی کے روپ میں مجدد سے مہدی اور پھر نبوت کا دعویدار ہوا۔ اور پھر یہاں تک بھی ایک قول کے مطابق خدائی دعویٰ بھی کر بیٹھا تھا۔ یہ مدہوشی ہی تھی جس نے اشرف المخلوقات کو ذلالت کے گہرے گڑھے میں گرا دیا۔ جب اللہ پاک قرآن پاک میں فرماتے ہیں کہ " ان کے دلوں پر مہر ہے اور ان کے کانوں پر مہر ہے اور انکی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔" کچھ ہی آیات آگے فرماتے ہیں۔۔ " وہ اندھے بہرے گونگے ہیں اور وہ

ہدایت کی طرف) نہیں لوٹیں گے "۔جب کسی انسان کے ساتھ یہ سب کچھ ہو تو وہ) کیسے عالم ہوش میں ہو سکتا ہے۔یقینا وہ مدہوش ہی ہو گا, اور اس مدہوشی میں کوئی خود کو یاد دلائے گا کہ وہ بھی خدا کو ماننے والا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا شعر سے واضح ہے۔ یا پھر وہ مذکورہ بالا مذموم حرکات کرے گا اور ثابت کرے گا وہ عقل و خرد سے بیگانہ ہے۔

یہ سب باتیں لکھنے کی وجہ جو چیز بنی وہ گزشتہ دنوں ایک چھوٹی سی کوئی چار پانچ منٹ کی ایک مختصر سی ویڈیو بنی۔ جس میں ایک ظاہر حالت میں مسلمان شخص کھڑا ہے اور مختلف لوگ آ رہے ہیں اور اسکے پاؤں کے قریب سجدہ کرتے ہیں۔ وہ شخص جب تک ان کی پیٹھ پر تھپکی نہیں دیتا, تب تک وہ اسی طرح سجدے میں پڑے ہوتے ہیں۔ پھر وہ شخص خود ایک طرف رخ کرکے سجدہ کرتا ہے اور اس وقت جو لوگ اسکے سامنے کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی اسکے ساتھ سجدہ کرتے ہیں۔ اب خدا جانتا ہے یا وہ خود کہ وہ کس کو سجدہ کر رہا تھا۔ اس ویڈیو میں کچھ لوگ اور بھی نظر آ رہے ہیں جو ایک طرف ہو کر کھڑے ہیں۔ لیکن جس طرح سجدہ کرنے والے لوگ سجدہ کرنے کے بعد اس طرف جا کر کھڑے ہوتے ہیں جہاں پہلے سے لوگ کھڑے ہیں تو یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ لوگ بھی سجدہ کرکے ہی وہاں جا کر کھڑے ہوئے ہوں گے۔ استغفر اللہ۔ اللہ پاک قرآن پاک میں فرماتے ہیں۔" اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسلیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری ہی عبادت کریں"۔ اب یہ عبادت

کس قسم کی ہے، کیا صرف نماز کا نام ہے؟ نہیں۔ بلکہ ایک حدیث کے مطابق اللہ پاک نے فرشتوں کو پیدا کیا۔ ان فرشتوں میں سے جو پہلے دن سے اللہ کا ذکر حالت قیام میں کر رہے ہیں وہ تا قیامت اسی حالت میں ذکر کرتے رہیں گے۔ جو حالت رکوع میں ہیں، جو حالت سجدہ میں ہیں، قعدہ میں ہیں، تا قیامت انہی حالتوں میں اللہ کی عبادت یا ذکر میں مصروف رہیں گے۔ تو یہ عبادت سجدہ کی بھی ہو سکتی ہے، قیام کی بھی اور رکوع کی بھی۔ تو جب سجدہ صرف خدا کے لیے ہے تو اے نادان انسان! پھر کیوں اس انسان نما شیطان کو سجدہ کرتے ہو۔ اس کی آخرت تو گئی پل صراط سے نیچے بھڑکنے والی آگ کے سب سے نچلے طبقے میں، تم کیوں اپنی آخرت تباہ کرتے ہو۔

اسکی نجات بھی صرف اسلیے ممکن ہے کہ اگر موت سے پہلے، عالمِ نزع سے پہلے وہ اللہ سے توبہ کر لے، اور اپنے کو سجدہ کروانے والوں کو بھی توبہ کروائے اور ان کی توبہ قبول بھی کروائے، تو شاید۔۔ ورنہ اس کی توبہ شاید قبول نہ ہو گی۔ کیونکہ ایک کثیر تعداد کو اس نے شرک میں مبتلا تو کرا دیا۔ اگر وہ خود تو توبہ کر لیتا ہے لیکن اپنے پیرو کاروں تک یہ پیغام نہیں پہنچاتا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ ظلمِ عظیم یعنی شرک تھا (بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ القرآن) تو قیامت کے دن ان پیروکاروں کے گناہ شایداسکے گلے کا طوق بن جائیں گے۔ یہ تو میں نے صرف ایک ویڈیو کی بات کی ہے۔ ورنہ انٹرنیٹ کی دنیا

میں بہت سی ایسی ویڈیوز مل جائیں گی، جس میں جاہل لوگ (دین اسلام کی تعلیمات سے جاہل) اپنے اس نام نہاد مرشد پر کٹ مرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ اگر ان کے خلاف کوئی بات کی جائے۔ کوئی بیس سال پہلے بری امام کے مزار پر جانا ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ ان کے مزار کی طرف رخ کر کے سجدہ کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ میرے ایک بڑے کزن تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تو صریح شرک ہے۔ کیونکہ سجدہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات کو جائز ہے۔ میری یہ بات وہاں ایک بندے نے سن لی۔ وہ تو جیسے میری جان لینے کے درپے ہو گیا۔ کہنے لگا اگر بندے کو سجدہ جائز نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم کیوں دیتے؟ جاہل کی دلیل دیکھیں۔ میں نے کہا کہ پہلی بات وہ اللہ کا حکم تھا اور صرف ایک بار کے لیے اور اُس وقت کے لیے تھا۔ دوسری بات وہ سجدہ، سجدۂ عبادت نہیں تھا، بلکہ سجدہ تعظیمی تھا۔ اگر سجدہ تعظیمی نہ ہوتا تو شیطان ہرگز انکار نہ کرتا۔ کیونکہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے انسان کا اشرف المخلوقات ہونا ثابت کر دیا تھا، فرشتوں پر بھی اور جنات پر بھی۔ تو شیطان جو کہ جنوں میں سے تھا، وہ یہ بات جان گیا تھا کہ یہ انسان کو اس کی عظمت کی خاطر اللہ کے حکم سے سجدہ کرنا ہے۔ تو بابا نے یہ بات تو سن لی کہ یہ اللہ کا حکم تھا اور جو میں نے آگے کہا، اس کو دونوں کانوں کے بیچ میں جگہ نہ دی۔ بندوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ سب مل کر کہنے لگے کہ ہمارے بڑے بوڑھے پڑھے لکھے تھے۔ وہ بھی اسی طرح کرتے تھے۔ پھر اس طرح اگر ہم انکے

مزار کو سجدہ نہ کریں تو ہماری مرادیں پوری نہیں ہوتیں۔ میں نے کہا کہ تم لوگ بھی مشرکین مکہ جیسی بات کرتے ہو۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ان کے بڑے ان لات منات عزیٰ کو سجدہ کرتے آئے ہیں، تو وہ کیوں نہ کریں۔ بس پھر کیا تھا، اگر میرا کزن مجھے نہ کھینچتا تو آج میں یہ تحریر شاید شاید نہ لکھ رہا ہوتا۔

شرک کتنی بری چیز ہے، کتنا عظیم ظلم ہے کہ اللہ پاک سورہ انعام میں اٹھارہ انبیاء کرام کا ذکر کرتے ہیں ۔فرماتے ہیں۔

جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو (شرک کے) ظلم سے مخلوط نہیں کیا ان کے " امن (اور جمعیت خاطر) ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلے میں عطا کی تھی۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک تمہارا پروردگار دانا اور خبردار ہے۔اور ہم نے ان کو اسحاق اور یعقوب بخشے۔ (اور) سب کو ہدایت دی۔ اور پہلے نوح کو بھی ہدایت دی تھی اور ان کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلا دیا کرتے ہیں۔اور زکریا اور یحیٰی اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی۔ یہ سب نیکوکار تھے۔اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی۔ اور ان سب کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔اور بعض بعض کو ان کے باپ دادا اور اولاد

اور بھائیوں میں سے بھی۔ اور ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔ یہ خدا کی ہدایت ہے اس پر اپنے بندوں میں سے جسے چاہے چلائے۔ اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل وہ کرتے تھے سب ضائع ہو جاتے۔ " (آیت ۸۲ تا ۸۸)۔ اگر وہ لوگ شرک کرتے۔۔۔ کون لوگ؟ اس کی تشریح اگلی آیت نمبر ۸۹ میں ہے۔ ارشاد ہوا۔

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم (شریعت) اور نبوت عطا فرمائی تھی۔ اگر" یہ (کفار) ان باتوں سے انکار کریں تو ہم نے ان پر (ایمان لانے کے لئے) ایسے لوگ مقرر کردیئے ہیں کہ وہ ان سے کبھی انکار کرنے والے نہیں۔" یعنی یہ لوگ انبیاء کرام میں سے تھے۔ جب اللہ پاک انبیاء کے بارے میں یہ فرماتے ہیں تو ایک عام اللہ کا بندہ جب شرک کرے گا تو اسکی مغفرت کیسے ہو گی۔ کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو فرمایا۔ "اے بیٹے۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔" اور ظلم کیا چیز ہے؟ ظلم بری چیز ہے۔ ظلم کے معنی زیادتی کے ہیں۔ ناانصافی بھی ظلم ہے۔ جو کام انصاف کے خلاف ہو اور جس میں کسی کے ساتھ زیادتی کی گئی وہ ظلم ہے۔ ظلم زبان سے بھی کیا جاسکتا ہے، ہاتھ سے بھی اور کسی طرح بھی۔ یعنی جب آپ اللہ کو مانتے ہوئے بھی اس کی ذات میں کسی کو شریک ٹھہرائیں تو یہ ظلم ہے۔ یہ آپ اپنے ساتھ ظلم کرتے ہیں کیونکہ اپنے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ جہنم کی آگ کو دعوت دے رہے

ہیں اور روز بروز دے رہے ہیں، یعنی زیادتی میں بڑھتے جاتے ہیں۔ اور جو شرک کرتے ہیں مندرجہ بالا آیت کے مطابق ان کے سب اعمال (ظاہر ہے نیک اعمال کی بات ہو رہی ہے) ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور جو شخص شرک کرتا ہے اللہ پاک اس پر بہشت کو حرام کر دیتے ہیں اور اسکا ٹھکانہ دوزخ میں کر دیتے ہیں اور اس طرح کا ظالموں کا پھر کوئی مددگار نہیں ہوتا (یعنی قیامت میں کوئی مدد نہیں ملے گی)۔۔ سورۃ المائدہ۔ آیت ۷۲۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کی ایک مخصوص دعا ایسی ہوتی ہے جس کو درجۂ قبولیت حاصل ہوتا ہے اور ہر نبی نے ایسی دعا دنیا کے اندر ہی کر لی ہے لیکن میں نے وہ دعا ابھی تک نہیں کی وہ دعا میں نے اپنی امت کی شفاعت کے لیے چھوڑ رکھی ہے۔ لیکن یہ دعا کس کے حق میں قبول ہو گی؟ پڑھیے:

(فھی نائلۃ ان شاء اللہ من مات من امتی لایشرک باللہ شئیا (صحیح مسلم

تو وہ دعا اللہ تعالیٰ کے حکم سے میری امت میں سے ہر اس شخص کو پہنچ سکتی ہے جس کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرایا۔

اللہ پاک ہمیں ہر قسم کے شرک سے محفوظ فرمائے، آمین، ثمہ آمین۔

کیا ہم آزادی منانے کا حق رکھتے ہیں؟

یومِ آزادی کی آمد آمد ہے۔ جشنِ آزادی کی تیاریاں ہر بڑے شہر میں عروج پر ہیں تو ایسے میں چھوٹے شہر بھی پیچھے نہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں پر چراغاں کیا جارہا ہے۔

بازاروں میں آزادی کے نغمے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ سکولوں میں بچوں کو سخت گرمی کے موسم میں وطن کی محبت کا درس دیا جارہا ہے۔ موسم گرما کی تعطیلات میں کے پی کے حکومت کے دل میں وطن کی محبت کا جن جاگ چکا ہے اور یکم اگست سے سکولوں کو گویا زبردستی کھلوا کر بچوں کو بلایا گیا ہے۔ جشنِ آزادی کی تیاریاں شروع کرائی گئی ہیں۔ بچوں کو نہ تو اس طرح کی سہولیات میسر کی گئی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو گرمی کی تپش سے بھی بچا سکیں اور اپنی توانائی بھی بحال کر سکیں۔ یہ ہوتی ہے آزادی، ہر چیز سے آزاد۔

بازاروں میں وطنِ عزیز کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح کچھ جھنڈے بڑے ہیں جو سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں لہرائے جاتے ہیں۔ کچھ جھنڈے بلکہ جھنڈیاں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، پرچیوں کی صورت میں دھاگے سے باندھ کر ایک لڑی کی صورت میں پروئی ہوتی ہیں۔ اور کچھ جھنڈے چھوٹے بڑے بیجوں کی صورت

میں بھی فروخت ہو رہے ہیں۔ پھر چودہ اگست کی رات گزرتے ہی پندرہ اگست کو ہم شاید کچھ زیادہ ہی آزاد ہو جاتے ہیں۔ جیسے عید کے لیے چاند رات کو شیطان جہنم کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور پھر اس رات جو گناہ سرزد ہوتے ہیں وہ پورے رمضان کا کفارہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی کیسے گناہوں سے بچا رہا۔ اسی طرح چودہ اگست کی رات گزرتے ہی اگلے دن پندرہ اگست کو ہماری ساری آزادی سڑکوں پر، گلیوں میں، ندی نالوں میں رلتی، بہتی نظر آتی ہے۔ جتنی جھنڈیاں لڑیوں کی صورت میں ہم نے اپنے گھروں میں، گلیوں، چوباروں میں سجائی ہوتی ہیں، ان کی اکثریت ہم پاؤں تلے روند کر گزر جاتے ہیں، اور یہ پروا نہیں ہوتی ہے کہ یہ ہمارے پاک وطن کا پیارا جھنڈا ہے۔اس کا احترام کریں گے تو دل میں خود بخود وطن کی عزت جاگے گی، وطن کی محبت جاگے گی۔ اس کے خلاف کوئی کام کرنے سے پہلے ہزار بار سوچیں گے۔ لیکن ہماری اس سوچ پر افسوس جو ہم نہیں سوچتے۔

ہم پاکستانی صرف کاغذی آزادی مناتے ہیں۔ ہمیں تقریریں کرنے کا فن بھی خوب آتا ہے اور دوسروں کو گول گول گھمانے کا بھی۔اس ہنر میں بھی ہم طاق ہیں کہ اپنے بھائی کا خون کیسے نچوڑا جائے، کیسے اس کو گلیوں میں رسوا کی جائے۔ ہمیں اس چیز کی آزادی واقعی میسر ہے کہ ہمیں کوئی بھی پوچھنے والا نہیں۔ قانون کے رکھوالے جو خود قانون شکن بن جائیں تو پھر ان کی آزادی کون چھین سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ اکثریت ہر گز بری نہیں۔ وہ وطنِ عزیز کی آزادی

کو سمجھتے ہیں کہ کس طرح یہ آزادی حاصل کرنے کے لیے دل سے ، دماغ سے جدو جہد کی گئی۔ پھر اس آزادی کی خاطر کتنی قربانیاں دی گئیں۔ ہزاروں ماؤں کی گودیں اجڑیں، ہزاروں خواتین کے سر کے تاج بے سر کے رہ گئے۔ لاکھوں بچے یتیم ویسیر ہو گئے۔ ہزاروں افراد لٹے پٹے اپنے گھروں کو چھوڑ کر پاکستان کی جانب ہجرت کر کے آئے اور آج بھی وہ اپنے گھر کو ترس رہے ہیں۔ لیکن لے کے رہیں گے آزادی، بن چھین کے رہیں گے آزادی، آج بھی یہ نعرہ ہمارے جسم میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ ہمیں کس طرح کی آزادی میسر ہے۔ کہیں بموں کے دھماکوں میں سینکڑوں ، ہزاروں افراد جان بحق ہو جاتے ہیں۔ دہشت گرد کسی بھی گنجان آباد علاقے میں گھس کر بندوق پستول ہاتھ میں لیے چاروں طرف فائرنگ کرتے ہوئے آزادی سے فرار ہو جاتے ہیں۔ بچے، بوڑھے، خواتین کوئی بھی اپنی طرف آئی ہوئی اندھی گولی کو روک نہیں پاتا۔ ابھی ان کے اہل و عیال کے آنسو خشک بھی نہیں ہوئے ہوتے کہ اللہ کی طرف سے طوفانِ نوح کا ایک حصہ سیلاب کی صورت میں ہمارے دیہاتوں ، شہروں کو ملیا میٹ کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ کہیں ساتھ میں بہت سے ذی روح یعنی جانور اور انسان بھی بہہ جاتے ہیں تو کہیں ان کے گزر بسر کا سامان ان سے بہت دور، سینکڑوں میل دور کسی اور کے کام آ رہا ہوتا ہے۔ اس وقت بھی یہی صورت حال ہے۔ دہشت گردی کے طوفان سے تو اللہ کے فضل و کرم سے ہماری پاک آرمی اور رینجرز کے

جوان کافی حد تک بٹے ہوئے ہیں۔ جو معدودے چند غدار رہ گئے ہیں، وطن دشمن ایجنٹوں کو پناہ دیے ہوئے ہیں، ان شاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب انکے گلے میں بھی پھانسی کا پھندا ہو گا۔ یعقوب میمن کی طرح وہ ہر گز بے گناہ پھانسی پر نہیں لٹکائے جائیں گے، بلکہ ان کو بہت سی ماؤں کو، بہنوں کو، بیٹیوں کو قیامت کے دن جواب دینا ہو گا جب وہ اللہ کی عدالت میں سر جھکائے داغِ ندامت لیے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت ان کی ندامت کسی کام نہ آئے گی۔ سیلاب کو بند باندھنے کے لیے ہمیں اللہ پاک کی طرف ہر امتحان کے بعد کافی وقت دیا جاتا ہے کہ اسکی تیاری کر لیں، پھر بھی یہ امتحان ممکن ہے، لیکن ہم اللہ کے اشارے کو ہر گز نہیں سمجھتے۔ بس یہ خیال کر لیتے ہیں کہ اس سال آگیا ہے یہ سیلاب، اب اگلے سالوں میں دس پندرہ سالوں تک نہیں آئے گا۔ نہ تو نیا ڈیم بنتا ہے نہ کوئی بیراج، نہ کوئی اور انتظام کے سیلاب شہروں، دیہاتوں کا رخ نہ کر سکے۔ کیوں کہ ہم آزاد قوم ہیں، اور آزادی سے سوچتے ہیں۔ کچھ زیادہ آزادی نہیں ہو گئی ہماری سوچوں میں؟

آزادی منانے کے لیے ذہنی، جسمانی، روحانی آزادی کے ساتھ ساتھ اخلاقی، سیاسی، معاشی آزادی بھی ضروری ہے۔ لیکن کیا ہم سب اس قسم کی کسی بھی آزادی کا نعرہ لگا سکتے ہیں؟ میرے خیال میں تو ہر گز نہیں۔ ہمارے پاس ذہنی آزادی میسر نہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہم انگریزوں کے غلام تھے، اور ان کے بعد ہم

جاگیرداروں، ساہوکاروں اور غداروں کے غلام رہے اور ہیں۔ آزادی کے بعد جتنے عام انتخابات ہوئے، شاید ہی ہم نے کسی بھی حلقے سے کسی ایسے فرد کا انتخاب کیا ہو، جو ثقہ ہو۔ ثقہ فقہ کی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب وہ شخص جو پورے کا پورے اسلام میں داخل ہو۔ یعنی جھوٹ نہ بولتا ہو، کسی کو دھوکا نہ دیتا ہو، امانت میں خیانت نہ کرتا ہو، کسی کا حق نہ مارتا ہو۔ اسلام کے ارکان کو پورا پورا ادا کرتا ہو وغیرہ وغیرہ۔ ہم اندھی تقلید کرنے والے ہرگز یہ نہیں سوچتے کہ پارٹی ٹکٹ کے تحت ان کے حلقے سے انتخاب میں کھڑا ہونے والا فرد پارٹی کی پالیسی کے تحت ہی چلے گا۔ اسکی اپنی کوئی مرضی نہیں ہو گی۔ اور پاکستان کے رواج کے مطابق پارٹی منشور انتخابات سے پہلے کچھ اور ہوتا ہے اور انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پارٹی کے منشور میں ایک سو اسی ڈگری کا فرق پڑ جاتا ہے۔ منشور میں جتنی ایمانداری کا چرچا ہوتا ہے، اس کے بعد مخالف پارٹیاں پھر شور شرابا کرتی رہتی ہیں کہ کہاں گئے وہ بدعنوان عناصر کو گلیوں میں گھسیٹنے کے نعرے۔ تو ہم ذہنی طور پر ہر بار اس پارٹی کو ہی ووٹ دیتے ہیں کہ شاید اس بار سدھر جائے۔ اگر بفرضِ محال دوسری پارٹی کو بھی ووٹ دے دیں تو بھی یہ علم ضرور ہوتا ہے کہ اس امیدوار کی انتخاب سے پہلے پانچوں گھی میں ہی تھیں، اور انتخاب جیتنے کے بعد سر بھی کڑاہی میں ہو جائے گا۔ ہم ہمیشہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ کی حدیث کے مطابق مؤمن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔

ہم روحانی طور پر بھی آزاد نہیں۔ کہ ہم اللہ کے احکامات اور اسکے نبی پاک ﷺ کی سنتوں پر اسکی روح کے مطابق عمل پیرا ہونے سے قاصر ہیں۔ اگرچہ عادتاً ہم نماز بھی پڑھ لیتے ہیں لیکن بے حیائی سے پھر بھی نہیں رکتے۔ رمضان المبارک کے روزے بھی رکھ لیتے ہیں لیکن ہمسایہ ہمارا پھر بھی بھوکا ہی سوتا ہے۔ حج بھی کر لیتے ہیں لیکن غریبوں، مسکینوں، یتیموں کے مال پر اسی طرح قبضہ کیا ہوتا ہے۔ ہمیں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا دعویٰ ضرور ہے کہ جہاں کہیں شانِ مصطفیٰ ﷺ میں معمولی سی بھی گستاخی ہوتی ہیں وہاں ہزاروں عاشقانِ رسول ﷺ نکل آتے ہیں اور پھر جو نعرۂ رسالت کے پردے جو وطن کی املاک کا نقصان ہوتا ہے، افراد کے رزق کو پاؤں تلے روندا جاتا ہے، اس سے ہمیں یہ احساس ہمہ وقت رہتا ہے کہ ہم آزاد ہیں۔ اگر ان لوگوں کو، یعنی دعویٰ عشق کرنے والوں کو کہا جائے کہ حقوق العباد کے بارے میں بھی اسی نبی کریم ﷺ نے کچھ احکامات بھی دیے ہیں جن کے عشق میں آج سرخرو ہونے نکلے ہو، ان کے بارے میں بھی کچھ سوچو تو پھر کہتے ہیں کہ پہلے عشق کو تو نبھا لیں، پھر ان افراد کا بھی سوچ لیں گے۔ یا پھر آئیں بائیں شائیں کرکے رہ جاتے ہیں۔ اگر ہم روحانی طور آزاد ہونا چاہیں، قرآن کو سمجھ کر پڑھنا چاہیں اور اسکی تعلیمات پر عمل کرنے کا سوچیں، رسول پاک ﷺ کے احکامات کو اپنی زندگی کے لیے مشعلِ راہ بنانا چاہیں تو نام نہاد پیر، اور مولوی جنھیں شریعت کی بس الف با کا ہی علم ہے (اس الف

باکے پیچھے کس دنیاکے کون کون سے راز عیاں ہیں، نہیں جانتے) ہمیں اس صراطِ مستقیم سے کوسوں دور بھگالے جاتے ہیں، اور ہم روحانی طور پر غلام کے غلام ہی رہ جاتے ہیں۔

معاشی طور پر ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے غلام ہیں۔ ہمارے گھر کے باتھ روم کے بجٹ سے لے کر ملک کے بڑے بڑے پراجیکٹ کے بجٹ تک یہ دو ادارے امریکہ درپردہ اسرائیل) کی ہدایات پر بناتے ہیں۔اور پھر وقتاً فوقتاً پورے سال میں ان کی) طرف سے ہدایات بھی ملتی ہیں اور دھمکیاں بھی۔ اب تو صرف یہی انتظار ہے کہ کب ان اربابانِ اختیار کی طرف سے ہوا، آگ، پانی (جو کہ اللہ کی طرف سے وافر مقدار میں میسر ہے) اور سورج کی روشنی پر ٹیکس لگتا ہے۔ کب ہمارے سونے پر، جاگنے پر، چلنے پر ٹیکس لگتا ہے۔ اگرچہ بالواسطہ طور پر لگ تو چکا ہے۔

تو میرے عزیز ہم وطنو! سوچیے کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد کیا ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم آزادی کا جشن اس طرح منا سکیں جیسا کہ آزاد قوموں کا حق ہے ؟

****

اردو زبان کو اول درجے کی زبان بنائیں

سپریم کورٹ کے ایک معزز جج محترم جواد ایس خواجہ نے گذشتہ ماہ میں پاکستان میں اردو کے نفاذ سے متعلق فیصلہ دیا۔ فیصلہ کا آنا تھا کہ امی ابو کے بہت ہی لاڈلے قسم کے عوام کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگ گئے۔ کیونکہ ان کو یہ خوف پیدا ہو گیا تھا اور جائز ہوا تھا کہ اگر اردو زبان پاکستان میں بچے کے کان میں اذان دینے کے بعد سے اسکا جنازہ پڑھنے سے پہلے تک مکمل طور پر نافذ کر دی گئ تو انکا تیا پانچا ہو جائے گا۔ کیونکہ ان کو اپنی انگریزی پر ناز ہے، اور یہ انگریزی ان کے آقا کی زبان ہے۔ اور زہینی آقا کب چاہتا ہے کہ ان کے ذہنی، زبانی غلام کسی بھی لحاظ سے ان سے آزادی حاصل کر سکیں۔ لیکن وہ کیا ہے کہ وقت ضرور بدلتا ہے، اور بدلہ لیتا ہے، چاہے صورتِ حال کوئی بھی ہو۔ بس اسی طرح ہوا۔ سپریم کورٹ نے حکم صادر کر دیا کہ تین ماہ کے اندر اندر پورے پاکستان میں اردو کے نفاذ کے لیے کام شروع کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ جو بولے وہی کنڈی کھولے۔ تو جواد ایس خواجہ صاحب نے بھی سب سے پہلا کام یہی کیا کہ انھوں نے چیف جسٹس کی سیٹ سنبھالتے ہی اردو میں حلف لیا۔ اس کے بعد آفس کے باہر اپنا نام بھی اردو میں لکھوایا۔

کسی نہ کسی کو تو آغاز کرنا پڑتا ہے۔ تو جواد صاحب ابتدا کر دی۔ اب اس کام کو اوج ثریا تک ہم نے پہنچانا ہے۔ اس عوام نے پہنچانا ہے۔ اس پیارے وطن کی آبادی کا ۵۶ فیصد حصہ پڑھا لکھا ہے۔ اور پڑھے لکھے ہونے کی تعریف ۱۹۸۸ کی مردم شماری میں یہ کی گئی ہے کہ وہ شخص جو اخبار پڑھ سکتا ہو اور کسی بھی زبان میں سادہ اور آسان خط لکھ سکتا ہو۔ اس تعریف سے ہٹ کر بہت سے ایسے افراد بھی اخبار پڑھ سکتے ہیں جو لکھنا نہیں جانتے۔ اخبار پڑھ کر باقاعدہ سمجھتے بھی ہیں۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ اب اللہ کرے کہ خیر و عافیت سے پاکستان میں اردو باقاعدہ عملی طور پر نافذ ہو جائے۔ ہر کام چاہے وہ لکھنے کا ہو، یا پڑھنے کا ہو یا تقریر جھاڑنے کا ہو یا جوشِ خطابت ہو، اردو ہی اردو نظر آئے تو ان لوگوں کو بھی فائدہ ہوگا جو صرف اخبار پڑھ سکتے ہیں۔ پہلے تو کوئی سرکاری خط ان کے نام آتا تھا تو وہ بے چارے میرے جیسے کسی جاہل کے پاس جاتے تھے کہ پڑھ کر اور پھر ترجمہ کر کے سنائے۔ اور جو ترجمہ میں سناتا تھا وہ پچاس فیصد اس خط کا ترجمہ ہوتا تھا اور پچاس فیصد میرا اپنا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ان کا مقصد اس ترجمے سے حل نہیں ہوتا تھا۔ اب فائدہ ہوگا کہ وہ لوگ خود کسی بھی تحریر کو جو ان کی موجودگی میں لکھی جائے گی، یا جن پر انھوں نے دستخط کرنا ہوگا، آسانی سے پڑھ لیں گے۔ ان کو آسانی سے نہ سہی، تھوڑی دقت سے ہی، کم از کم سمجھ تو آئے گی۔

مجھے فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں اور پاکستان کی قومی زبان اردو روانی سے بولتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ لہجہ نستعلیق نہیں بنا سکتا کہ مادری زبان کچھ اور ہے، جوانی کسی اور زبان والوں کے ساتھ گزاری، عملی زندگی میں قدم رکھا تو انگریزی پلے پڑی۔ لیکن پھر بھی الحمدللہ دقیق اردو نہ سہی، سلیس اردو سے کام چلا لیتا ہوں۔ اب جب کہ پاکستان میں اردو کا ان شاءاللہ عملی طور پر نفاذ ہونے جا رہا ہے تو مجھے اپنی ذہنی استطاعت پر اتنا بھروسہ ہے کہ جو دقیق و ثقیل قسم کی اصطلاحات مختلف مضامین کے حوالے سے تحریر کی جائیں گی، پہلی بار میں نہی تو دوسری، تیسری مرتبہ جب نظر سے گزریں گی تو ان شاء اللہ دماغ میں بیٹھ جائیں گی اور سمجھ بھی آئے گی۔ اب بے شک قانونی، سائنسی، تکنیکی اصطلاحات میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں لیکن جلد یا بدیر وہ ہمارے قابو میں ہوں گی اور ہم دھڑلے سے اپنی اردو دانی کا رعب آکسفورڈ سے پڑھنے والوں پر ڈال سکیں گے۔ نہ صرف میرے جیسے موجودہ جوانی ڈھلکے جوان بلکہ ہمارے بچے بھی بہت آسانی سے اردو میں مہارت حاصل کرکے زندگی کے نصابی میدان میں کامیابیاں سمیٹیں گے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی کیمبرج یا آکسفورڈ سے پڑھنے والا اردو میں منعقد کیے گئے کسی امتحان میں ان سے آگے بڑھ سکیں۔

ایک پریشانی جو ابھی تک اردو کے مخالفین کو گھیرے ہوئے ہے کہ پھر ان سکولوں کا کیا بنے گا جو ایک ایک ماہ کی ایک کلاس کی ہزاروں روپے فیس لیتے ہیں اور

بچوں کو انگریزی میں مسکرا کر ڈانٹتے ہیں اور بچہ سمجھ رہا ہوتا کہ ٹیچر نے اسے شاباش دی ہے۔ان سکولوں کا کیا بنے گا جس کا سارا نصاب ہی انگریزی میں ہے۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے اساتذہ کو اردو پڑھانے کی مشق کرائی جائے، ان کی تربیت کی جائے جو زیادہ نہیں تو ایک ماہ کے عرصہ میں آسانی سے دی جا سکتی ہے۔جہاں تک نصاب کا تعلق ہے اس میں اصطلاحات کا ترجمہ کرنا ہی مشکل ہے۔ جہاں تک میرا ناقص علم ہے مقتدرہ قومی زبان کے ادارے نے ، جس کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس نے صرف پیسہ کھایا ہے، کیا کچھ بھی نہیں، اردو زبان کے نفاذ کے لیے بھرپور تیاری کر لی تھی۔ ۱۹۸۸ میں یہ ادارہ پاکستان میں موجود ہر قانون، اصول و ضوابط کا اردو ترجمہ کر چکا تھا۔ تین، چار اردو لغات بھی وہ تیار کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ ہزاروں کی تعداد میں مختلف تکنیکی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کر چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط لیکن میرے علم میں یہ بات کافی عرصہ پہلے آئی تھی اور اب یاد آئی ہے تو لکھ دیا۔ اللہ کرے یہ بات درست ہو۔ اگر سچ ہے تو پھر اردو کے نفاذ کا گویا اسی فیصد کام تو مکمل ہے۔ صرف ان لغات کی نقول تیار کرنی ہیں اور تمام صوبوں کو بھیج دیں۔ وفاق کو بھیج دیں کہ سب اپنے اپنے دائرہ اختیار میں اس کو پھیلا دیں اور ساتھ ساتھ میں وہ قوانین واصول و ضوابط بھی بھیج دیں جو ترجمہ ہو چکے

ہیں۔کیا مضائقہ ہے اگر یہ سب ہو جائے۔ لیکن اگر مقتدرہ قومی زبان کے بارے میں پیسہ کھانے والی بات درست ہے تو پھر سپریم کورٹ سے تین ماہ کا وقت کم ہے۔ کیونکہ تین ماہ میں تو صرف چھوٹے موٹے کام ہی ہو سکتے ہیں۔ قوانین کے تراجم، جرائم سے متعلق قوانین کو اردو میں ڈھالنا بھی ایک کام ہی ہے اور کافی محنت طلب کام ہے۔ لیکن ہمت مرداں مددِ خدا کے مصداق کوئی بھی چیز دنیا میں ناممکن نہیں۔کامیابی حاصل کرنے کے لیے بس ایک قدم بڑھانا ضروری ہے، اور پھر قدم بہ قدم ہر گام پر منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔سب کچھ ممکن ہے، بس ہمت اور حوصلے کی بات ہے، لگن کی بات ہے۔

جناب جواد خواجہ صاحب نے اردو میں چیف جسٹس کا حلف اٹھا کر آغاز تو کر دیا ہے، لیکن وہ ایک بات مشہور ہے کہ جو بندہ نیک ہوتا ہے اس کی طبعی عمر اتنی ہی کم ہوتی ہے کہ اسکی نیکیاں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح جناب چیف جسٹس بھی ۲۳ دنوں کے لیے کرسئی قاضی القضاء کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں۔ مجھے انجانا سا خوف محسوس ہوتا ہے کہ ان ۲۳ دنوں میں تو اربابانِ اختیار خوب شد و مد سے اردو کے نفاذ کے لیے ظاہری طور پر کام کرتے نظر آئیں لیکن اُدھر کرسی گئی، اِدھر اردو گئی نہ ہو جائے۔ کیونکہ انگریزی کو آقا کی زبان کی سمجھنے والے کب چاہیں گے کہ عوام کی سمجھ میں وہ کچھ آجائے جو وہ نہیں چاہتے۔ لفظوں کے ہیر پھیر سے واضح معنی اخذ کیے جائیں کس کو گوارا ہے؟ کم

از کم گوروں کو تو نہیں۔ آیئے سب مل کر قدم بڑھائیں اور اردو قومی زبان بن کر دنیا میں پہلے درجے پر پہنچ جائے۔ جب کہ ایک غیر سرکاری نتائج کے مطابق اردو پہلے سے ہی دنیا کی اول درجے کی زبان ہے۔ بچے بچے کی زبان پر کلمہ طیبہ کے بعد اردو جاری ہو، یا پھر عربی کہ میرے نبی ﷺ کی زبان ہے۔

قائد کا فرمان۔ اردو سرکاری زبان

قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو اپنے ایک خطاب میں فرمایا تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔ لیکن قسمت سے کون لڑ سکتا ہے سوائے دعا کے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ تب تک ۱۹۳۷ء انڈیا ایکٹ ضروری ترامیم کے ساتھ پاکستان کا گویا آئین تھا۔ اب قائدِ اعظم کا فرمان کوئی قرآنی آیت تو تھی نہیں کہ اُدھر زبان سے نکلی ،اِدھر اس پر عمل ہو گیا۔ اگرچہ ہم پھر بھی نہ کرتے اگر چہ وہ قرآن کا حکم بھی ہوتا کیونکہ اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے مؤمن ہونا ضروری ہے، اور ہم صرف مسلمان ہیں۔ مؤمن اور مسلمان میں فرق صرف اتنا ہے کہ مؤمن اللہ کی مانتا ہے اور مسلمان اللہ کو مانتا ہے۔ یہ تو ایک ثانوی بات بیچ میں آ گئی۔ بات ہو رہی تھی قائد کے فرمان کی۔ تو ہوا یوں کہ پھر ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قراردادِ مقاصد کی منظوری دی گئی لیکن اردو کے سرکاری طور پر نفاذ کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء کا آئین، پھر ۱۹۶۳ء آئین۔ بے شک اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا، لیکن ہنوز کام کاج سب کے سب انگریزی میں ہی سرزد ہو رہے تھے۔ کیونکہ حکمرانی، اصل حکمرانی ان لوگوں کی تھی جو انگریزوں سے زمین، جائیداد، جاگیر بطورِ انعام یا بطورِ خلعتِ فاخرہ حاصل کر چکے تھے، یا پھر انڈین سول

سروسز کے پروردہ تھے۔ تو وہ کیسے اپنے زمینی آقا کی شان میں گستاخی کر سکتے تھے۔
وقت گا گزرتا گیا۔ ۱۹۷۳ء کا آئین منظور ہوا۔ اس میں ایک شق رکھی گئی، شق نمبر ۲۵۱ ۔ کہ پندرہ سال کے اندر اندر اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا اور اسکے لیے متعلقہ انتظامات کیے جائیں گے ۔ لیکن آئین کی بالادستی کو کوئی تسلیم کرے تو بات بنے۔ اردو کو سرکاری زبان بننا تھا نہ بنی۔ ۱۹۸۸ء میں پندرہ سال پورنے ہونے تھے جو آج تک نہ ہوسکے۔ اگر تب سے اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوتی تو اوکاڑہ کے نواحی گاؤں نہرانوالی کا رہنے والا نوجوان نوید آصف جس نے لاہور بورڈ میں دسویں کے امتحان میں نمبر حاصل کرکے دوسری پوزیشن لی، اپنا میڈل وصول کرنے سے پہلے یا بعد میں ۹۱۹ ہال میں موجود کرسیوں کے درمیان خالی سیڑھیوں پر ہر گز نہ بیٹھتا بلکہ وہ بھی فخر سے کسی کرسی پر کسی آکسفورڈ کے حمایت یافتہ سکول سے پڑھے ہوئے طالب علم کے ساتھ بیٹھا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا ہوتا۔ اور کیا ممکن تھا کہ اگلے دس سال بعد وہ اسی اوکاڑہ ضلع کا اسسٹنٹ کمشنر ہو۔
جی جناب عالی ! یہ عین ممکن ہے کہ اگر اس پاک وطن میں اردو اسکی روح کے مطابق نافذ ہوجاتی ہے تو شاید ہی کوئی آکسفورڈ، کیمبرج میں پڑھنے والا

نوجوان پاکستان کے کسی بھی گورنمنٹ سکول میں پڑھنے والے سے آگے نکل سکے۔ ہمارے اس اردو پڑھنے والے نوجوان کے پاس علم ہے، حالات وواقعات سے مکمل آگاہی رکھتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے پوری واقفیت ہوتی ہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، کہاں کونسی ایجاد کس کے خلاف یا حق میں ہو رہی ہے، کس ملک کی سیاست کس کروٹ بیٹھ رہی ہے۔ کونسا ملک اپنی خارجہ یا داخلہ پالیسی بدلتے وقت کے مطابق تبدیل کر رہا ہے۔ یہ سب ہمارے اس اردو میڈیم میں پڑھنے والے نوجوان کے دل و دماغ میں بھرپور جزئیات کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ لیکن ہائے رے موئی انگریزی کی وجہ سے وہ مقابلہ کے امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا۔ وہ جیسے تیسے کرکے چودھویں یا سولہویں تو کر لیتا ہے لیکن انگریزی میں اتنا لائق نہیں ہوتا کہ اپنا مافی الضمیر فرفر بیان کر سکے۔ آپ اردو نافذ کریں اور پھر پاکستان کے جوانوں کی کریم کو آگے بڑھتا دیکھیں۔ ان کے آگے آنے کی وجہ سے پھر پاکستان کو بھی ترقی کرتا دیکھیں۔

مذہب کے بعد یہ زبان ہی ہوتی ہے جو کسی وطن کے افراد کو یکجا کرتی ہے۔ ان میں اتحاد و یگانگت پیدا کرتی ہے۔ مذہب کی بنیاد پر تو تمام انسانیت یکجا ہوتی ہے لیکن ایک ملک میں زبان یہ کام بہ احسن طور پر سرانجام دیتی ہے۔ دنیا کے دو سو پچاس کے قریب ممالک میں سے تقریباً ایک سو بیالیس ممالک کی قومی زبان ہی انکی سرکاری زبان ہے۔ ان ممالک کو اپنے کسی حصے میں بھی

سرکاری خط وکتابت کی ترجمہ کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ کیونکہ ہر فرد چاہے وہ اپنے دارالحکومت سے ہزاروں میل دور ہے، بہ آسانی سمجھ لیتا ہے۔پاکستان واسلام دشمن ملک اسرائیل کو جب آباد کیا گیا تو وہ بھی مذہب کی بنیاد پر آباد ہوا۔ لیکن مکین چونکہ مختلف ممالک سے آئے ہوئے تھے، تو ان کی زبان بھی مختلف تھی۔وہاں آپس میں رابطے کا مسلہ پیدا ہو گیا۔ اسکا حل انھوں نے یہ نکالا کہ عبرانی زبان کو اسرائیل کی سرکاری و قومی زبان قرار دیا گیا۔ اور صدیوں بعد اسرائیل کو اسکی زبان واپس ملی۔ شاید تاریخ میں بھی یہ پہلی بار ہوا کہ والدین نے ،.بزرگوں نے اپنے بچوں سے عبرانی زبان سیکھی کہ بچوں کو سکول کی سطح سے عبرانی پڑھائی جانے لگی۔ ہم اردو کیوں نہیں لکھ اور پڑھ سکتے، سرکاری طور پر؟

اکثر ایک سوال پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان میں طلباء اپنی تعلیم کو ادھورا کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ جسکا جواب زیادہ تر یہی دیا جاتا ہے کہ غربت کی وجہ سے۔ لیکن یہ جواب درست نہیں ہے۔ ورلڈ بینک کے ایک سروے کے مطابق پاکستان کے بیالیس فیصد طلباء انگریزی کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے بعد تیس فیصد غربت اور اٹھارہ فیصد مناسب طور پر رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے۔ چاہے وہ تعلیم کی کوئی بھی سطح ہو۔ پرائمری، دسویں یا کالج کی سطح پر۔ مجھے غالب یقین ہے کہ ذریعہ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے ایک تو یہ تعلیم درمیان

میں چھوڑ دینا بہت کم ہو جائے گا۔ کم از کم وہ بیالیس فیصد تعداد تو نہیں چھوڑے گی۔ دوسرا پاکستان میں خواندگی کا تناسب چھپن فیصد ہے، جس میں اردو میں پڑھنے والے شامل ہیں، کم از کم بھی آرام سے ۷۵ فیصد سے بڑھ جائے گا۔

اردو کے نفاذ سے کسی کو بھی کوئی مسلہ نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ لوگ جو انگریزی میں بات کرنا فخر سمجھتے ہیں، اردو کی ٹانگیں توڑنا اپنا غرور جانتے ہیں، وہ اس بات پر بھی فخر کریں گے کہ پاکستان بھی گونگا نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہو گی کہ پارلیمنٹ میں موجود ہمارے نمائندے جنکی اکثریت صرف اردو ہی پڑھنا لکھنا جانتی ہے، کسی نہ کسی مقام پر ان کو مجبوراً انگریزی میں بات کرنا پڑ جاتی ہے تو انکے لیے بہت مشکل پیش آتی ہے، وہ بھی بہ آسانی اپنا مدعا بیان کر سکیں گے۔ بلکہ بہت ہی بہتر طور پر مخالف کو دباؤ میں لے سکیں گے۔ بشرطیکہ وہ بھی پاکستانی نہ ہو۔ امریکہ سے مذاکرات ہو رہے ہیں، روس سے بات چیت ہو رہی ہے، یا چین سے باہمی تعاون کے مذاکرات ہوں، بہت بہترین طریقے سے اور بھرپور اعتماد سے اپنا کیس پیش کر سکیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔

اللہ اللہ ہے۔۔

اللہ خدائے وحدہٗ لا شریک کا اسمِ ذات ہے۔ دراصل لفظ اللہ دینِ اسلام کی بنیاد ہے۔ کیونکہ یہ ایک جامع لفظ ہے۔ اس لفظ اور جس ہستی کا یہ نام ہے اس پر یقین کامل ہی اسلام میں داخل ہونے کا درست اور صحیح راستہ ہے۔ لفظ اللہ ایسا جامع ہے کہ اگر اس کو مختلف حصے کرکے دیکھا جائے تو بھی مفہوم وہی نکلتا ہے جس کا معنی معبود ہے۔ اور یہ اس لفظ کا معجزہ ہے۔ اللہ سے اگر حرف "الف" جدا کر دیا جائے تو باقی "للہ" رہ جاتا ہے۔ جس کا معنی بنتا ہے اللہ کے لیے یا اللہ کی قسم۔ اگر حرف "ل" بھی ہٹا دیں تو "لہٗ" رہ جاتا ہے۔ جس کا معنی اس کے لیے۔ ظاہر ہے "اس کے لیے" اشارہ اس ذات کی طرف ہوگا جو کہ ہمہ وقت ہر جا موجود ہو۔ اور اللہ کے سوا کوئی اور ذات ہمہ گیر اور ہمہ وقت موجود نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر لہٗ سے ل بھی ہٹا دیا جائے تو حرف "ہٗ" باقی رہ جاتا ہے۔ جس کا ایک معنی وہ بھی ہے۔ اب حرف لہٗ کی طرح ہٗ بھی اللہ کی ذات کے لیے ہر وقت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر صرف لفظ اللہ میں اتنا کچھ پنہاں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ہستی کی ہو گی۔ اللہ کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا دنیا کا ایک ناممکن ترین کام ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات پاک ایسی ہے کہ اگر دنیا کے تمام درخت قلم، تمام سمندر سیاہی اور درختوں کے پتے صفحات بن جائیں، لکھنے والی عمر کروڑوں سال ہو تو بھی اللہ کے بارے

میں جو لکھا جائے گا وہ اسکا عشرِ عشیر بھی نہیں ہو گا جو کہ حقیقت میں اللہ ہے۔

دنیا کا کوئی سا بھی مذہب ہو، سب کا اللہ کے بارے میں عقیدہ مشترک ہے۔ سب کی آواز ایک ہے کہ اس کائنات کا خالق کوئی ایسی ہستی ہے جو کہ ہر وقت موجود ہے اور اس کائنات کا نظام ایک خاص نظم و ضبط سے چلا رہی ہے۔ اسلام کے علاوہ بے شک باقی مذاہب اللہ کو بطور اللہ کے نہیں مانتے لیکن پھر وبھی وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اتنی بڑی کائنات خود بخود وجود میں نہیں آ سکتی۔ انکا بنانے والا کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ دنیا میں ایک چھوٹا سا کارخانہ بنا انسانوں کے نہیں چل سکتا۔ بے شک آٹومیٹک ہو، مشینیں کام کرتی ہوں، لیکن ان مشینوں کو بھی تو بنانے والا کوئی ہے۔ ان کو کنٹرول کرنے والا بھی تو کوئی ہے۔ کمپیوٹر میں پروگرامنگ کی جاتی ہے، وہ بھی انسان ہی کرتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی ہے جس کی باقاعدہ پروگرامنگ کی گئی ہے اور وہ اسی پروگرامنگ کے تحت عمل کرتا ہے۔ اس قدر پیچیدہ پروگرام کس نے بنایا؟ سائنسدانوں نے اپنی زندگیاں لگا دیں یہ جاننے کے لیے کہ انسان ہے کیا لیکن ابھی تک شاید بیس فیصد بھی نہیں جان سکے۔ وہ حیران ہیں کہ کس طرح ڈی این اے کے تحت سارا کام ہوتا ہے۔ اور ڈین این اے کوئی لمبا چوڑا حصہ نہیں ہے بلکہ اگر اس کو انسانی جسم کا ایٹم کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ کیا یہ ڈی این اے خود بخود بن گیا۔ نہیں

بلکہ انسانی جسم کا یہ کمپیوٹر پروگرام اللہ کی ذات نے تخلیق کیا ہے۔ تب ہی تو انسان اتنا پیچیدہ ہے۔ اس انسان کو، کائنات کو بنانے والی ہستی کو مختلف زبانوں میں اور مختلف مذاہب میں مختلف نام دیے گئے ہیں۔ ہندی میں بھگوان (اگرچہ اب بھگوان بھی ان کا جدا ہو چکا ہے کہ دنیا کی ہر چیز چاہے وہ گائے ہو، بندر ہو سانپ ہو، ہاتھی ہو، شیر ہو، پتھر ہو، ستارے، چاند، سورج، سب کے سب ان کے بھگوان ہیں)۔ انگریزی میں گاڈ (God)، فارسی میں خدا وغیرہ ہیں۔ معنی بظاہر سب کا ایک ہی بنتا ہے یعنی اللہ۔ اللہ کے بارے میں واضح بات اس وقت کی جاسکتی ہے جب اسکی حقیقت معلوم ہو۔ اور حقیقت کیا ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ پھر بھی اگر کم سے کم الفاظ میں ہم اللہ کو جاننے کی کوشش کریں تو پہلی چیز جو ہمیں اللہ تک لے کر جائے گی وہ الوہیت ہے یعنی خدائی کا تصور۔ وسیع کائنات جس کے آغاز اور انجام کا خیال کرنے سے ہمارا ذہن تھک جاتا ہے جو نامعلوم زمانہ سے چلی آرہی ہے۔ جس میں بیحد و بے حساب مخلوق پیدا ہوئی اور پیدا ہوئے چلی آرہی ہے۔ جس میں ایسے ایسے حیرت انگیز کرشمے ہو رہے ہیں کہ ان کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس طرح کی کائنات میں خدائی کا دعویٰ صرف وہی کر سکتا ہے جو لامحدود ہو، ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ کسی کا محتاج نہ ہو۔ قادر مطلق ہو۔ حکیم اور دانا ہو۔ علیم و خبیر ہو۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہ ہو۔ وہ سب پر غالب ہو اور کوئی اسکے حکم

سے سرتابی نہ کرسکے۔ بے حساب قوتوں کا مالک ہو۔ کائنات کی ساری چیزوں کو اس سے زندگی اور زندگی کا سامان بہم پہنچے۔ عیب، نقص اور کمزوری کی تمام صفات سے پاک ہو اور کوئی بھی اسکے کاموں میں دخل نہ دے سکے۔ یہ تمام صفات صرف ایک ذات واحد میں جمع ہونا ضروری ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ دو ہستیاں برابر کی صفات رکھ سکیں۔ کیونکہ سب پر غالب اور سب پر حاکم تو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ صفات تقسیم ہو کر بہت سے خداؤں میں بٹ جائیں، جس طرح ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ کیونکہ اگر ایک حاکم ہو، دوسرا عالم، تیسرا رازق ہو تو ہر ایک دوسرے کا محتاج ہو جائے گا۔ اور ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیں گے تو یہ کائنات یک لخت فنا ہو جائے۔ جیسا کہ اللہ پاک قرآن پاک "سورہ الانبیاء، آیت ۲۲" میں ارشاد فرماتا ہے: اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین اور آسمان" دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ بس پاک ہے اللہ جو عرش کا مالک ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ "بنا رہے ہیں۔

کیونکہ اس طرح ممکن نہیں تھا کہ سب آزاد اور خود مختار خدا ہمیشہ ہر معاملے میں ایک دوسرے کے ارادے سے موافقت کرکے اتنی وسیع کائنات کے نظم و نسق کو آپس میں یکسانیت اور تناسب و توازن کے ساتھ چلا سکتے۔ بلکہ ان کے منصوبوں اور ارادوں میں قدم قدم پر تصادم ہوتا۔ ہر ایک اپنی خدائی دوسرے خداؤں کی

موافقت کے بغیر چلتی نہ دیکھ کر یہ کوشش کرتا کہ کسی نہ کسی طرح وہ ساری کائنات کا مالک بن جائے۔

خدا کے اس کامل اور صحیح تصور کو مد نظر رکھ کر جب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عالم کی ساری موجودات میں سے ایک بھی ان صفات سے متصف نہیں ہے۔ وہی تمام صفات میں یکتا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں محتاج ہیں، محکوم ہیں، بنتی بگڑتی ہیں، مرتی جیتی ہیں۔ کسی کو ایک حال پر قیام نہیں۔ کسی ایک کو بالاتر قانون کے خلاف بال برابر حرکت کرنے کا اختیار نہیں۔ان کے حالات خود گواہی دیتے ہیں کہ ان میں سے کوئی خدا نہیں۔بلکہ کسی چیز میں خدائی کی ادنی جھلک بھی نہیں۔ کسی کا خدائی میں ذرہ برابر دخل نہیں ہے۔کائنات کی ساری چیزوں سے خدائی چھین لینے کے بعد ہمیں یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ پھر ایک ہی ہستی ایسی ہے جو سب سے بالاتر ہے۔ صرف وہی تمام خدائی صفات رکھتی ہے اور اسکے سوا کوئی اللہ نہیں۔

اسی لیے تو اسلام کے تمام عقائد اور تمام عملی نظام میں سب سے پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے یعنی اللہ پر ایمان۔" سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ اسلام سے متعلق انہیں کوئی ایسی پکی بات بتادیں کہ پھر انہیں اسکے متعلق کسی سے کچھ دریافت کرنے

کی ضرورت باقی نہ رہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ اس بات کا اقرار کر کہ میں ایمان "لایا اللہ پر اور پھر اس پر قائم ہو جا۔

ایمان باللہ کے علاوہ باقی جتنے عقائد و اعمال ہیں، سب اسی ایک کے تابع ہیں۔ فرشتوں پر ایمان اسلیے ہے کہ وہ اللہ کے فرشتے ہیں اور اسکے حکم سے ہر وقت اسکی عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ کوئی حالت قیام میں ہے، کوئی رکوع کر رہا ہے، کوئی سجدے میں ہے، کوئی تشہد میں بیٹھا ہوا ہے تو تا قیامت انکی یہ حالت رہے گی اور اسی حالت میں وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہیں گے۔ کتابوں پر ایمان اس لیے ہے کہ وہ اللہ تعالی کی نازل کی ہوئی ہیں اور ان میں اللہ کے ہی احکامات درج ہیں۔ رسولوں پر ایمان اس لیے کہ وہ اللہ پاک نے ہی اپنے بندوں کی رہنمائی و ہدایت کے لیے بھیجے ہیں۔ یوم آخرت پر ایمان اس لیے ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔ اسی طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد وغیرہ اسلیے فرائض میں شامل ہیں کہ اللہ نے ان کو مقرر کیا ہے۔ غرض ہر وہ چیز جو اسلام میں داخل ہے خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل، اسکی بنیاد ایمان باللہ پر قائم ہے۔ اس ایک چیز کو الگ کر دیجئے پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخرت۔ نہ رسول پیروی کے مستحق ٹھہرتے ہیں اور انکی لائی ہوئی کتابیں۔ نہ فرائض اور عبادات میں کوئی معنی باقی رہ جاتے ہیں اور نہ حقوق و واجبات میں۔ گویا اس ایک مرکز کے ہٹتے ہی یہ سارے کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بلکہ سے سے

اسلام ہی کسی چیز کا نام باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلام کے معنی سلامتی کے اور جب کوئی چیز ہی سلامت نہی رہی تو اسلام کہاں رہا۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کا اعتراف انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اور یہ اس عہد و پیان کا نتیجہ ہے جو روزِ اول کو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا۔

"اور جب تمھارے رب نے آدم کی پشت سے اس کی نسل کو پیدا کیا اور ان کو انہی پر گواہ کیا اور کہا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ ہم گواہ ہیں۔ " (سورۃ الاعراف۔ ۱۷۲)

یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی خارجی اثرات سے انسان کا یہ جذبۂ فطرت دب جاتا رہا ہے اور پھر وحی الٰہی کے ذریعہ سے بار بار انسان کے اس دبے ہوئے جذبے کو ابھارا گیا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک جتنے بھی انبیاء کرام آئے، ان سب نے ہی توحید کا پرچار کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

" جب اللہ کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے کی طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا (کہ خدا کی سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ (حٰم السجدہ۔ ۱۴

انبیاء سے بڑھ کر خود خالق کائنات کی گواہی ہے جو اس چیز کی شہادت دے رہا ہے کہ پورے عالم میں اس کی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جو خدائی کی ذات

سے متصف اور خدائی کے اقتدار کی مالک ہو۔ اسکے بعد فرشتے جو کائنات کے انتظامی اہل کار ہیں۔ وہ اپنے ذاتی علم کی بناپر شہادت دے رہے ہیں کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کی طرف زمین وآسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رجوع کرتے ہوں۔ اسکے بعد مخلوقات میں سے جن لوگوں کو بھی حقائق کا تھوڑا یا بہت علم حاصل ہو، ان سب کی آغاز دنیا سے آج تک یہ متفقہ شہادت رہی ہے کہ ایک ہی خدا اس اس پوری کائنات کا مالک ہے۔ اللہ پاک خود فرماتے ہیں۔

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اسکے سوا کوئی خدا نہیں اور فرشتے اور " سب اہلِ علم بھی ثابت قدمی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست اور حکمت والے کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ (آل عمران۔ ۱۸ "

حب الوطنی

ہر شخص اپنے اپنے انداز میں وطن سے محبت کرتا ہے۔ کبھی یہ تعمیری صورت اور کبھی تخریب کاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حب الوطنی ہوتی کیا ہے اور یہ کیسے وجود میں آتی ہے؟ حب الوطنی سے مراد اپنے ملک کی چاہت، اپنے وطن سے پیار، دل سے محبت کا اظہار کرنا ہے۔ یہ ایک پیدائشی فطرت ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے۔ یہ ایک خواہش ہے۔ اور اسکا اظہار تمام ممکنہ طریقوں سے ملک و قوم کی بے لوث خدمت کرنا ہے۔ حب الوطنی کے جذبے کے تحت ہم اپنے ملک کو دوسرے ممالک پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی جبلت ہے، جو ہمارے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ یہ ایک اعلیٰ و برتر احساس ہے جس کے تحت ہم سانس لیتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں۔ حب الوطنی کا جذبہ صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ حیوان بھی اس جذبے سے مبرا نہیں۔ وہ بھی اپنے مسکن سے محبت کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی کوئی دوسرا جانور چاہے انکی نسل سے ہو یا کوئی دوسری نسل ہو، ان کے مسکن کی طرف اس نیت سے بڑھتا ہے کہ اس پر قبضہ کر لے تو پہلا جانور کمزور ہوتے ہوئے بھی اپنی طاقت و استطاعت کے مطابق مزاحمت ضرور کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ احتجاج کرتا ہوا وہ مسکن چھوڑے یا جان سے جائے وہ بعد کی بات ہے۔

یہ راہِ عشق ہے، مقتل سے ہو کے جاتی ہے

سو اس سفر میں کوئی دل میں ڈر نہیں لاتا۔۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی چاہے جو طریقہ بھی اختیار کرے، کسی نہ کسی طور حب الوطنی کا جذبہ ضرور رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات درست ہے بھی اور نہیں بھی۔ بد قسمتی سے تاریخ میں کچھ غدار اور وطن دشمن تاریخ میں ایسے بھی گزرے ہیں جو بہت زیادہ بدنام ہوئے۔ ذلت ان کے حصے میں آئی اور اپنے ہم وطنوں کے درمیان آج بھی انتہائی پیچ اور گھٹیا سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں اگر ہم میر جعفر، میر صادق کا نام لیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر وطن کی خاطر جان دینے والا ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے تو غدارِ وطن بھی بھی اسی طرح دلوں میں بدنام رہتا ہے۔ جب میر جعفر کی پینشن لگی تو اسکی اولاد کو پینشن دینے کی خاطر جب بلایا جاتا تو سرکاری ہرکارہ آواز لگاتا تھا کہ میر جعفر غدار کی اولاد حاضر ہو۔ اور وہ شرم کے مارے سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے وطن کی خاطر تکالیف جھیلیں، وطن کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کیا لیکن اپنی زندگی میں وطن پر آنچ بھی نہ آنے دی۔ ان ہی عظیم لوگوں میں میر جعفر و میر صادق کے سپہ سالار ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ جیسے قابلِ فخر سپوت شامل ہیں، جنھیں آج بھی دنیا اچھے الفاظ میں یاد کرتی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے، جنھوں نے مشکلات کو تو قبول کیا لیکن وطن کی خاطر مخمل کے بستروں پر سونا گوارا نہ کیا۔

حب الوطنی قومی اتحاد اور سالمیت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہ وطن سے محبت کا احساس ہی ہوتا ہے جو ہمیں اس بات پر ابھارتا ہے کہ ہم اپنے وطن کی ترقی و خوشحالی کے لیے کام کریں۔ یہ وطن کی محبت ہی ہے جو ہماری زندگی میں وطن کے فائدے کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کے لیے ایک طاقتور جذبے کو بیدار کرتی ہے۔اگر کسی ملک کے عوام محب وطن ہیں س تو وہ آپس میں اتحاد سے رہنا پسند کرتے ہیں۔انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اتحاد ان کے وطن کی بہتری کے لیے ہے۔ اور انہیں اس بہتری کا شدت سے احاس ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کی مختلف اکائیوں سے ، مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایسے کسی بھی نظریے کو قبول نہیں کرتے ۔ وہ ان کے ملک کی سالمیت یا قومیت کے خلاف کسی بھی غیر ملک کے پروپیگنڈہ سے کسی بھی طور متاثر نہیں ہوتے۔ درحقیقت حب الوطنی ایک عظیم طاقت ہے جو کہ عوام کو آپس میں ایک قوم کے طور پر متحد رکھتی ہے۔

حب الوطنی کا جذبہ اپنے ملک و قوم کے لیے محنت پر اکساتا ہے۔ یہ محب وطن لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی ترقی کے لیے مل جل کر کام کریں۔ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں لگن سے کام کریں تو ان کا قومی فرض ادا ہوتا ہے۔ مزدور محنت کش ملک کی مختلف صنعتوں میں

مصنوعات تیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔زیادہ محنت کرکے اور زیادہ وقت لگا کر وہ زیادہ مقدار میں مصنوعات تیار کر سکتے ہیں۔اس سے نہ صرف ان کی اپنی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ قومی پیداوار بھی بڑھتی ہے۔کسان اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اجناس کی پیداوار کو زیادہ کرنے کا ہر ممکنہ جائز طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو کاروبار سے منسلک ہیں وہ ذخیرہ اندوزی یا ناجائز طریقے اختیار کیے بغیر ایماندارانہ طریقے سے اشیاء کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ طلباء محنت ولگن سے علم حاصل کرتے ہیں اور اساتذہ اپنی ممکنہ لیاقت واستعداد کے مطابق درس وتدریس کے کام میں مصروف رہتے ہیں۔المختصر مختلف پیشوں اور تجارت سے منسلکہ لوگ معاشرے کے دوسرے افراد اور ملک کے فائدے کے لیے اتنی ہی محنت سے کام کرتے ہیں جتنا کہ اپنے فائدے کے لیے ۔حب الوطنی کا جذبہ انہیں بڑی حد تک انہیں اپنے کام کے ساتھ بے لوث وبے غرض کر دیتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ وہ رقم اور پیسہ کمانے کے لیے کام کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ملک کو خوشحال اور مضبوط بناتے ہیں۔ دنیا کی عظیم قومیں مثلاً چینی، جاپانی امریکی وغیرہ سب محب وطن قومیں ہیں۔ چین جو کسی زمانے میں افیونی قوم کے حوالے سے دنیا میں پہچانا جاتا تھا،آج دنیا کی سپر پاورز کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہے۔ بلکہ کئی معاملات میں تو دنیا کی تمام قوموں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ صنعتی میدان میں ہر دوسری

تیسری چیز یا تو چین کی بنی ہوتی ہے یا پھر اس پر میڈ ان جاپان کی مہر لگی ہوتی ہے۔ یہ وہی جاپان ہے جس پر دوسری جنگِ عظیم میں ایک نہیں بلکہ دو ایٹم بم گرائے گئے۔ ایک تہائی آبادی کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ متاثرہ زمین گھاس تک اگانے کے قابل نہ رہی چہ جائیکہ کہ وہاں پر اجناس یا کوئی سبزی اگائی جا سکتی۔ لیکن اسی جاپان کے باقی ماندہ لوگوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ ملک کو ترقی دینا ہے اور اس قدر آگے بڑھانا ہے کہ اس ملک جس نے اسے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، صنعتی میدان میں تیا پانچہ کر دے اور اس نے یہ کر دکھایا۔ یہ سب ترقی یافتہ قومیں اتنی زیادہ ترقی کرنے کے قابل صرف اس لیے ہوئیں کہ ان میں جزبۂ حب الوطنی بدرجۂ اتم موجود تھا۔

حب الوطنی کا جذبہ ایک قوم کو متحد رہ کر اور بہادری سے بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔ یہ جذبہ ملک کو درپیش خطرات کی موجودگی میں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار کرتا ہے۔ نوجوان مسلح افواج یا رضاکاروں کی جماعت میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ اور یہ کام بڑی تعداد میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ہوتا ہے۔ اچھا کمانے والے اور امیر لوگ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق قومی یا دفاعی فنڈ میں امدادی رقوم جمع کراتے ہیں۔ اگر حکومت جنگ کے خطرے کے پیش نظر عوام پر کچھ نئے ٹیکس لاگو کرتی ہے تو عوام ان کی ادائیگی کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ جب حقیقتاً جنگ شروع ہو جاتی ہے تو تمام مسلح عوام مسلح

افواج کی جنگ کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ ہر قسم کا تعاون کرتے ہیں۔ یہی عوام ان کی ایک جگہ سے دوسرے جگہ حرکات و سکنات میں ، خوراک اور جنگ سے متعلقہ سامان کو ایک جگہ سے دوسرے جگہ پہچانے میں تمام ممکنہ سہولیات مہیا کرتے ہیں۔ (جاری ہے)

آسائشوں نے زیست کو مشکل بنادیا

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اقبال کا یہ شعر اور میرا آج کا موضوع بظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں لیکن در حقیقت ایک ہی ہیں۔ اس مردِ مومن کی وفات 1938 میں ہوئی جب نہ مشینیں تھیں اور نہ ان سے حاصل ہونے والی آسائشیں۔ بظاہر تو زندگی کی گاڑی صرف گاڑیوں کی اور بجلی کی مرہونِ منت تھی باقی سب اسی طرح تھا۔ لیکن مرد قلندر اقبال کی پیش گوئی ہماری آج کی زندگی میں موجود آسائشوں کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ کیا کچھ میسر نہیں ہمارے پاس۔ کہاں سفر کے لیے گھوڑے، اونٹ استعمال کیے جاتے تھے اور اب کہاں سینکڑوں میلوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ کہاں تو ہم کسی کی تیمارداری کرنے یا کسی کے ساتھ تعزیت کرنے کے لیے وقت نہ ہونے کے باوجود خود چل کر جاتے تھے اور اس کی بہترین طریقے سے دلجوئی کرتے تھے۔ لیکن آج اس موبائل اور ٹیلیفون کی وجہ سے وقت ہوتے ہوئے بھی گھر سے ہی اس کا حال احوال پوچھ لیتے ہیں اور تسلی کے دو منافقانہ بول لیتے ہیں کہ دل میں یہی ہوتا ہے کہ نہ بیمار ہوتا یا نہ مرتا، نہ ہمیں یہ کال کرنی پڑتی۔ عام زندگی میں حال احوال پوچھنا تو بہت دور کی بات ٹھہری۔

ٹیلی وژن نے بھی ہماری زندگی میں جو سہولیات پیدا کی ہیں کہ ہم گھر بیٹھے دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے واقف ہوتے رہتے ہیں لیکن انتہائی افسوس ہوتا ہے جب ہمیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے ہمسائے میں کوئی کتنے دنوں سے بھوکا ہے۔ اس کے گھر میں کوئی پریشانی، کوئی مسلہ تو نہیں ہے۔ جب کہ اللہ کے رسول ﷺ نے تو ہمسائے کے حقوق کے بارے میں اتنی بار خیال رکھنے کا کہا حتیٰ کہ صحابہ کو یہ شک ہونے لگا مبادا کہیں وراثت میں بھی ہمسائے کا نام نہ شامل ہو جائے۔ اور ہمیں موبائل، ٹیلی وژن، میڈیا نے اتنا تن آسان بنا دیا ہے کہ حق ہمسائیگی تو دور کی بات ہمیں ہمارے بغل میں بیٹھے ہوئے فرد سے بھی لاتعلقی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آج کل کی جو آسائشیں ہمیں میسر ہیں ان سے ہماری زندگی میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہمیں وہ کام جن کو کرنے میں دن، مہینے لگ جاتے تھے اب دنوں، گھنٹوں میں ہو جاتے ہیں۔ جہاں ہمیں سمندر پار اپنے دوست، رشتہ داروں سے سلام دعا کرنے میں یا ان کو کوئی چیز پہنچانے میں مختلف تجاویز زیر غور لائی جاتی تھیں، آج سیکنڈز میں ہر چیز ان کی پہنچ میں ہوتی ہے بس ایک کلک کی دیر ہوتی ہے۔ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے، لیکن آج کس کو سفر میں کامیابی ملتی ہے کہ وہ پشاور سے کراچی تک کا سفر بنا رکے گھنٹوں میں طے

کرلیتا ہے۔ جب کہ پہلے جب کوئی اونٹ، گھوڑوں پر سفر کرتا تھا تو ہر آٹھ دس میل کے بعد کہیں نہ کہیں رکتا تھا۔ کوئی نہ کوئی مل جاتا تھا اور اسکے رکنے کی وجہ سے اس کے علم میں اضافہ ہی ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی سے کسی موضوع پر بات چیت ہوتی تھی۔ اس کے سفر کے حوالے سے اس کو کچھ اشارے مل جاتے تھے، کوئی ہدایات مل جاتی تھیں، یوں اس کا سفر بخیر و خوبی بھی طے ہو جاتا تھا اور ساتھ میں کامیابی بھی اس کے قدم چومتی تھی۔ آج مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ ہم اپنوں سے دور ہیں، کوئی ہماری کسی مشکل میں ہمارا ساتھ نہیں دیتا اگر دیتا بھی ہے تو صرف اتنا کہ چند لمحے بیٹھ کر ہمیں طفل تسلی دے گا، اور جب کچھ جانی، مالی مدد کی ضرورت پیش آئے گی تو ایک نہ ہزار سکھ کے مصداق کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لے گا۔

ہماری صحت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔ پہلے اگر پانی میں کوئی مسلہ ہوتا تھا تو پانی کو ابال کر پیتے تھے۔ آج جگہ جگہ منرل واٹر موجود ہے۔ جس میں منرل نام کو نہیں۔ بظاہر وہ پانی صاف تو ہوتا ہے لیکن نمکیات کے ہمارے جسم میں نہ جانے سے ہمارا جسم ڈھلکتا جارہا ہے۔ پہلے لکڑیوں پر کھانا پکتا تھا، مٹی کی ہانڈی ہوتی تھی، اور لکڑی کا چمچ ہوتا تھا۔ ان چیزوں سے پکے ہوئے کھانے کا اپنا ایک منفرد ذائقہ ہوتا تھا۔ جو مرضی ہوتی تھی پکاتے تھے، کھاتے تھے۔ خالص دیسی گھی، مکھن، ملائی وغیرہ۔ لیکن صحت کا شاذو نادر ہی

کوئی مسئلہ پیش آتا تھا۔ اب کبھی تو کھانا پکاتے ہوئے لوہے کے پگھلنے کا مسئلہ، پانی کی پلاسٹک کی بوتل کا مسئلہ، اوون میں نقصان دہ شعاعوں کا مسئلہ۔ سب کے سب صحت کے لیے حد درجے نقصان دہ۔ اوپر سے فاسٹ فوڈ نے بظاہر تو کھانے کا وقت بھی کم کر دیا ہے، لیکن ساتھ میں بے وقت بھی کر دیا ہے۔ جب جی چاہا، کسی ریسٹورنٹ میں گھس گئے، برگر، سینڈوچ وغیرہ کھا لیا۔ نہ وقت کھانے کا، نہ ہضم کرنے کا۔ سونے پہ سہاگہ گھر میں پکانے کی بجائے ہوٹل میں کھانے کو بھی ترجیح دی جانے لگی ہے جہاں صفائی کی حالت ناقص، پکانے میں کوئی احتیاط نہیں، پکنے والی چیز کتنی پرانی ہے، یعنی وقتِ استعمال کے بعد بھی استعمال ہو رہی ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ایسے میں بدپرہیزی، بد ہضمی نہ ہو اور بیماریاں ہمارے جسم کو نہ چاٹیں تو کیا کریں۔

ان آسائشوں نے ہماری زندگی کو حقیقتاً اجیرن کر کے رکھ دیا ہے۔ کہاں انسان کی اوسط زندگی سینکڑوں سال اور کہاں ستر اسی سال وہ بھی بیماریوں اور مسائل سے پُر۔ ہمیں اپنی زندگی کو پھر سے سکون بخش بنانے کیلیے، صحت مند بنانے کے لیے رشتہ داروں سے لے کر عام مسافر تک کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہمیں وقت نکالنا ہو گا۔ نہیں تو ہماری زندگی بس اتنی ہی رہ جائے گی جس میں ہمیں یہ تو علم ہو گا کہ کب جاگے ہیں اور کب سوئے ہیں، لیکن کیا کچھ کرتے رہیں سارا دن، کچھ بھی علم نہیں ہو گا کہ لگی بندھی روٹین بند آنکھوں سے بھی مکمل ہو

جاتی ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

حب الوطنی ۔2

حب الوطنی کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ کچھ منفی پہلو بھی موجود ہیں جن سے اجتناب ہی کرنا چاہیے تاکہ قومی اتحاد میں ایک باعزت مقام حاصل ہو سکے اور پھر اس مقام کو قائم بھی رکھا جا سکے۔ جب حب الوطنی کا جذبہ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو پھر نتیجہ تنگ نظری، دھوکہ، فریب اور ناجائز ذرائع و اختیارات کی صورت میں نکلتا ہے۔اور نتیجہ قومی و بین الاقوامی امور سے متعلقہ کاموں میں تعصباتی سوچ اور رویے کو جنم دیتا ہے۔ اس قسم کی حب الوطنی کا جذبہ جب لوگوں کی رگوں میں سرایت کر جاتا ہے تو پھر اس کو صرف یہی احساس رہتا ہے کہ کوئی اس کے ملک کو، اسکی املاک کو، اسکے عوام کو نقصان نہ پہنچائے۔اس کے لیے وہ انتہا تک جانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ قانون بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ خدائی فوجدار بن کر غداروں کا خاتمہ کرنے کا فرض اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ لیکن نقصان اسے ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق جو شخص کسی ایک انسان کو قتل کرے گا (میدانِ جنگ کے علاوہ) وہ شخص شاری انسانیت کا قاتل ہے۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قتل کرنے والا کسی ڈاکو کو، کسی غدار کو یا کسی بھی ایسے شخص کو مار دیتا ہے جو کسی نہ کسی لحاظ سے انسانیت، مذہب یا ملک کو نقصان پہنچاتا ہے تو یہ ثواب کا کام ہے۔ ہاں یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ

جو شخص اللہ، اسکے پیارے رسول ﷺ یا قرآن پاک کی شان میں گستاخی کرے اور حکومتِ وقت اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی نہ کرے تو پھر شاید عوام کو توہین مذہب کا قانون ہاتھ میں لیناپڑے، لیکن اس کے لیے بھی علمائے کرام، فقہا کرام سے اجازت لینی لازمی ہے۔ البتہ دوسرے قسم کے لوگوں کے لیے قانون ہاتھ میں لیتے وقت وہ یہ ضرور ذہن میں رکھے کہ قانون بھی تو ملک کا ہی ہوتا ہے۔ اب اگر وہ خود قانون کی خلاف ورزی کرے تو درحقیقت خدا کی نافرمانی ہوئی، کیونکہ اسی خدا کا حکم ہے کہ جو تم پر حاکم بنایا جائے، اس کی تابعداری کرو ماسوائے اس کے جب وہ شرک کا حکم دے یا اسلام کے منافی کام کا کہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب وہ قانون اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو پھر محب وطن ہونے کا دعویدار کیسے ہوتا ہے؟ کیونکہ وطن سے محبت کرنے والے تو وطن کی ہر بات کو عزیز رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی ہر جائز و ناجائز بات کو محبوب رکھتا ہے۔

یہ انتہائی مناسب ہو گا کہ ہماری قومی پالیسی اس طرح کی بنائی جائے جو عوام کے دل و دماغ میں جہاں تک ممکن ہو جذبہ حب الوطنی بیدار کرے۔ ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے یہ ایک انتہائی سود مند بات ہو گی کہ طالب علم معاشرے میں حب الوطنی کے جذبے کے ابھارا جائے۔ انہیں اس کی قدر و قیمت کے بارے میں سکھایا اور پڑھایا جائے۔ ان کے تعلیمی نصاب میں جذبۂ حب الوطنی اور اسکی

خواہش کے متعلق مواد کو شامل کیا جانا چاہیے۔ جو انہیں حقیقی طور پر محب وطن شہری بنا سکے۔ ہماری تاریخ میں حب الوطنی کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں جو کہ ان طلباء کو اچھی طرح ذہن نشین کرانی چاہییں۔ انہیں ہمارے اسلاف کے عظیم الشان ماضی کے متعلق پڑھایا جائے۔ اور جدید دور میں ان کی ذمہ داریوں کے متعلق انہیں بہرہ مند کیا جائے۔تاریخ، ثقافت، روایات اور ہماری قوم کے مستقبل کے مقاصد سے متعلق کتابیں اگر موجود ہیں تو ان سے استفادہ کیا جائے اور اگر نہیں ہیں تو پھر تحریر کرائی جائیں اور ان کو پھیلایا جائے۔ حب الوطنی کے جذبے کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے ہمارے پاس اب بہترین ذرائع موجود ہیں۔ اطلاعات و نشریات کے ذرائع، ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، اور خاص طور پر انٹرنیٹ وغیرہ اس سلسلے میں اہم کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ لوگوں میں معاشرتی اور قومی فرائض کو اجاگر کرنے اور ان کے شعور کو جگانے کے لیے ان ذرائع کا استعمال نہایت ضروری ہے۔جب ان ذرائع کو استعمال کیا جائے گا جو کہ آج کل ہمارے اذہان پر آکٹوپس کے پنجے کی طرح چھائے ہوئے ہیں، تو ہمارے لاشعور بلکہ تحت الشعور کو بھی جھنجھوڑنے کا کام ہو گا۔ جس کی وجہ سے ہم ہر کام اس طریقے سے انجام دیں گے کہ جس میں ملک کا مفاد ہو گااور نقصان پہنچانے کا معمولی سا شائبہ بھی ہمارے ذہن کے کسی کونے میں سر نہیں ابھارے گا۔

حب الوطنی کے صرف اس جذبے کی قدر کی جا سکتی ہے جو سچا اور مثبت ہو۔ اس جذبے کو دل میں رکھتے ہوئے ہمیں بین الاقوامی امور اور نظریات کو سامنے رکھنا رکھنا چاہیے۔ تا کہ یہ بین الاقوامی قوانین کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ مختلف قومیں ہوش مندی سے کام لینے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں۔ حب الوطنی بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے کہ قومیت کو سامنے رکھتے ہوئے لوگوں میں زبردستی اس جذبے کو ابھارا جائے اور لوگوں سے زبردستی ملک وملت کی عزت کرائی جائے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو بجائے حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہونے کے لوگوں میں ایک ضد اور انا پرستی پیدا ہو جائے گی۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ نہ ملک رہتا ہے اور نہ جذبہ حب الوطنی۔

جدا ہو دیں سیاست سے۔۔

بہت دور رس نظر تھی اقبال کی۔ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا لیکن اقبال کی یہ پیش گوئی یقینا صرف پاکستان کے لیے ہی تھی۔ وطن عزیز کی آزادی سے لے کر کسی نے بھی اسلام کے اصولوں کے سامنے رکھتے ہوئے سیاست نہیں کی۔ سادہ سی بات ہے کہ اگر کوئی سیاست دان بھی قرآن و حدیث کی رو سے سیاست کو لے کر چلتا تو پھر اسکے لیے دو ہی آپشن تھے یا وہ پاکستان چھوڑ دیتا یا پھر دنیا۔ کیونکہ اسلام کی میں جھوٹ بولنے کی گنجائش نہیں ماسوائے جہاد کے، وہ بھی جب جیت یقینی ہو اور اللہ سے امید بھی ہو۔ اسلام میں ہر حال میں وعدہ پورا کرنے کا حکم ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ ”اے ایمان والو! اپنے وعدوں کو پورا کرو۔ بے شک تم سے ہر وعدے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ دولت کے ارتکاز کو ہلاکت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی جب دولت چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے تو پھر ملک کی معاشی حالت اس قدر دگرگوں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جیسے جیسے دولت اکٹھی کرنے کی لالچ بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے اسے خرچ کرنے کی استطاعت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اپنی ذات پر بھی مال خرچ کرنے کے بارے میں سو بار سوچا جاتا ہے۔ تو پھر دوسرے لوگوں کے لیے جیب سے مال کیسے نکلے گا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ تھوڑے سے پیسوں کے لیے

قتل و غارت شروع ہو جاتی ہے۔

اقبال کے اس مصرعے میں کہ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' بہت کچھ پنہاں ہے۔ سیاست کو صرف ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ جس نے جس طرف مفاد دیکھا اسی طرف پلٹ گیا۔ موجودہ حکومت شاید پاکستان کے تریسٹھ سال میں واحد حکومت ہے جو اس وقت ہر بڑی سیاسی جماعت کو ساتھ لے کر چلی ہے۔ چاہے یہ سنگت مہینوں کی ہو یا سالوں کی۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر سیاسی جماعت کا کوئی نہ کوئی مفاد ہو گا تو ہی حکومت کا ساتھ دیا ہو گا۔

اس سیاست کے بے لگام گھوڑے کو جب مزید بے قابو کر دیا جاتا ہے تو حالات وہ رخ اختیار کر جاتے ہیں جو کچھ عرصہ پہلے کراچی میں نظر آرہے تھے۔ ان دنوں میں ایک ایس۔ایم۔ایس آیا تھا کہ کراچی کا وہ کونسا علاقہ ہے جس کا نام آج کل زبان زد عام ہے؟ جواب تھا گولی مار۔ چھ ماہ میں پہلے تک شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو جب کم از کم دو، تین اموات نہ ہوئی ہوں۔ حکومت کے نمائندے کہتے ہیں اور سرِعام کہتے ہیں کہ انھیں معلوم ہے کہ اس دہشت گردی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ اور کراچی کی مقامی لیکن مشہور پارٹی کے لیڈران کا بھی یہی کہنا ہوتا ہے۔ اور باقاعدہ میڈیا کے سامنے، پریس کانفرنس میں کہا جاتا ہے۔

میڈیا والوں پر بھی تھوڑا سا افسوس ہوتا ہے کہ یوں تو وہ ہر بات اگلوانے کے ماہر ہیں۔ لیکن یہاں کوئی بھی جرات کرکے یہ سوال نہیں پوچھتا کہ اسکا نام بتائیں اور پھر جب معلوم ہے تو اسکے خلاف باقاعدہ طور پر ثبوت پیش کیے جائیں۔ لیکن نہیں۔ کیونکہ ان میڈیا والوں کو بھی اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ یہ سوال کرکے انھوں نے بھی ان گمشدہ افراد میں شامل ہو جانا ہے جنھوں نے کبھی برآمد نہیں ہونا۔

بات نکلی تھی جھوٹ اور وعدوں سے۔ قائدا عظم کے علاوہ شاید ہی کوئی سیاستدان ایسا گزرا ہو جس نے سچ کے اور اصولوں کے جھنڈے گاڑے ہوں۔ لیکن کیا کریں مجبوری ہے۔ اگر جھوٹ نہیں بولیں گے تو اس سیاسی معاشرہ میں انکا زندہ رہنا نا ممکن ہو جائے گا۔ کیونکہ ایسے ماحول میں سچ بولنے والے کا دل کالا ہو جاتا ہے۔ سچ بولنے والے کا حال عمران خان جیسا ہو جاتا ہے۔ یہ حضرت 1995 سے الیکشن میں حصہ لیتا آیا ہے لیکن سوائے اپنی سیٹ کے کبھی کوئی اور سیٹ نہیں جیت سکا۔ اگرچہ عمران خان کا جلسہ ہمیشہ سب سے بڑا ہوتا ہے لیکن لوگ صرف اپنے کرکٹ کے ہیرو کے دیدار کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ یا ایک دوسری بات بھی ہو سکتی ہے کہ الیکشن کے نتائج بہت پہلے سے ہی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت رکھے ہوئے ہوتے ہیں، ورنہ اتنے لوگوں کے مجمع میں سے کیا چالیس فیصد بھی عمران خان کے حق میں ووٹ نہ ڈالیں گے۔ لیک پھر 2013 کے الیکشن میں عمران

خان کی پارٹی نے پاکستان کی تیسری بڑی پارٹی کا اعزاز حاصل کر لیا۔ اس کی وجہ کیا تھی وہی، سیاست کو دین سے جدا کیا گیا۔ پاکستان کے بڑے برے نام جو ہر لحاظ سے بڑے تھے، عمران خان کے ساتھ شامل ہوا۔ جھوٹ کے وہ طومار باندے کہ صرف اللہ معاف کر سکتا ہے، بندے نہیں۔

پھر بات آتی ہے وعدوں وعید کی۔ تین حضرات ان حضرات کا تکیہ کلام ہیں۔ گا، گے، گی۔ ان الفاظ کا تعلق آنے والے کل سے ہوتا ہے اور کل کبھی نہیں آتا۔ جب کل کبھی نہیں آتا تو وعدہ کیسے پورا ہو؟ وعدہ پورا کرنے والوں کا حال این اے۔55 کے مشہور امیدوار کی طرح ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ سکولوں کے جال بچھائیں گے۔ انھوں نے سکولوں اور کالجوں کا جال بچھا دیا لیکن صنف نازک کے۔ راولپنڈی میں سینکڑوں سکولوں اور کالجوں کا افتتاح ہوا۔ وعدہ پورا ہوا۔ لیکن کیسا وعدہ۔ آج نہ سکول ہیں نہ ہی۔۔۔۔۔کے لیڈر۔ ریلوے کی وزارت ملی۔ وعدہ کیا کہ پاکستان ریلوے کو دنیا میں ایک نمونہ بنا دیں گے۔ انھوں نے بنایا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے کسی نہ کسی ایکسپریس کا افتتاح ہوتا۔ بہترین خوبصورت انجن اور نئی بوگیوں سے مزین نئی ٹرین عازم سفر ہوتی۔ وہ تو بعد میں پتہ چلا کہ پرانے انجنوں پر نیا رنگ کرکے انجن نیا کر دیتے اور بوگیوں کو ویلڈ وغیرہ کرا کر، سیٹ کور نئے چڑھا کر بوگی نئی بنا دیتے۔ آج وہ وعدہ ایسا پورا ہوا کہ ورلڈ ریکارڈ قائم ہونے لگے۔ پشاور سے اگر بہت کم بھی ٹرین

چلتی تھی تو 24 گھنٹوں میں 2 ٹرینیں تو لازمی نکلتی تھیں۔ لیکن وہ دن بھی اس ملک کی عوام کو دیکھنا پڑا کہ پشاور سے 36 گھنٹوں میں کوئی ٹرین بھی نہیں چلی۔اس کے بعد الیاس بلور آئے تو ریلوے بیٹھ گئی۔ اور اب جو صورت حال ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ کہنے کو تو کسی نے اگر تھوڑا لمبا سفر کرنا ہے جیسے راولپنڈی سے کراچی یا لاہور سے حیدرآباد تو اس کو ٹکٹ کرانے کے لیے کم از کم پندرہ دن پہلے جانا پڑتا ہے۔ ورنہ ٹکٹ نہیں ملتی۔ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ ریلوے خسارے میں ہے۔ ویسے سب پاکستانی ایک بات تو لازمی جانتے ہیں کہ جو ریلوے لائن پاکستان بنتے وقت تھی، اس کی لمبائی میں شاید ہی ایک کلومیٹر کا اضافہ آج تک ہوا ہو۔ بلکہ الٹا کچھ سٹیشن ختم بھی کر دیے گئے ہیں یا ان کو وقتی طور پر بند کر دیا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کی اکثریت اسلام کی تعلیمات سے اتنی ہی دور ہے جتنا ایک کمرے میں عام بیٹھے ہوئے انسان کی پہنچ سیکچن میں رکھا ہوا پانی کا گلاس۔جب تک وہ انسان اٹھ کر کچن تک نہیں جائے گا، پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں نہیں آسکے گا۔اسلام کی تعلیمات کو صرف پڑھنا ہی کافی نہیں کہ پھر نہ تو کوئی سورۃ اخلاص پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی آیت الکرسی۔ان تعلیمات پر عمل بھی فرض ہے۔ اور پھر خاص طور پر سیاستدانوں کا تو فرض بنتا ہے کہ سیاست کی الف بے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے لے کر حضرت علی رضی اللہ

عنہ کی خلافت تک کی حالات زندگی پڑھیں۔ انھوں نے کس نہج پر خلافت کی کرسی کو سنبھالے رکھا۔ کس کس طرح اپنی رعیت کو سکھ پہنچایا۔ کون کون سے عوامی فلاح کے منصوبے شروع کیے اور ان کو پایہ تکمیل تک پہنچا۔ حدیث پاک میں ہے کہ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم سے تمہاری رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ تب ہی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی مر گیا تو ان کو خوف ہے کہ اسکی پوچھ گچھ بھی ان سے ہو گی۔ اور آج کے حکمران کہتے ہیں کہ کیا ہوا۔ حادثہ تو ہوتا رہتا ہے۔

اگر اسلام کے اصولوں کے مطابق سیاست کی جائے، انفرادی سوچ کی بجائے اجتماعی مفادات میں کام کیا جائے پہلے رعایا اور اسکے بعد اپنی اولاد کی فکر کی جائے، انصاف کو انصاف کے ترازو میں تولا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان کا معاشرہ دنیا کا بہترین معاشرہ نہ ہو۔ لیکن اگر ایسا ہو جائے تو پھر امریکہ ہمیں امداد کیسے دے گا؟ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف قرضہ کیسے دیں گے؟ یہاں نام نہاد این جی اوز اور کیسے اپنا دھندہ چلائیں گی جن کی آڑ میں مسلم دشمن قوتیں اپنا جاسوس بھیجتی رہتی ہیں۔امداد سے یاد آیا کہ، ایک رپورٹ سرسری نظر سے گزری ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان جس رفتار سے قرضے لے رہا ہے اگر یہ قائم رہی تو تین چار سال میں پاکستان کو شاید اپنے اثاثے بیچنے پڑیں۔ اور دشمن نے جس اثاثے کو سب سے پہلے خریدنا ہے وہ

پاکستان کی ایٹمی طاقت ہے۔ خدارا، اے حکمرانو، غور کرو۔ اللہ کی رسی بہت دراز ہے، ڈھیلی ہے لیکن جس دن کھینچ گئی، اس دن صرف اللہ ہوگا اور آپ۔ کوئی بتائے کہ ہم بتائیں کیا۔ کیونکہ ہم گونگے ہیں۔

اگلی بار ووٹ کس کو دیں؟

آج بیٹھے بیٹھے معلوم نہیں کیوں ۲۰۱۳ کے الیکشن یاد آ گئے اور اس کے ساتھ اخبارات کی وہ خبریں جو بہت زیادہ دلچسپ تھیں۔ ابھی الیکن نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ امیدواران کے کاغذات جمع ہوتے تھے۔ اخبارات میں بھی اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی ریٹرننگ افسران اور امیدواران کے درمیان گفتگو بہت خوب شائع ہوئی اور نشر ہوئی۔ جو امیدوار نہیں تھے لیکن ذی شعور تھے، صحیح معنوں میں محب وطن تھے، انھوں نے ان سوالات پر اس طرح اعتراض کیے کہ ان سوالات کا فائدہ؟ میرے ایک دوست نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کیا پاکستان کے آئین میں منافق ہی ایم۔ پی۔ اے یا ایم۔ این اے بن سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ خدا کو خوف کرے، وہ کیسے یہ سند دے سکتا ہے کہ کون کیا ہے؟ اس نے کہا منافق کی چار نشانیاں فرمائی گئی ہیں کہ جب بات کرے جھوٹ بولے۔ امانت میں خیانت کرے۔ جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب بات کرے تو بیہودہ گئی کرے۔اس کی بات مجھے لاجواب کر گئی۔ آج صبح اس کا فون آیا حال احوال پوچھنے کے لیے تو مجھے اس کی باتیں یاد آ گئیں۔

ان الیکشنز میں ریٹرننگ آفیسرز نے امیدواروں سے قرآن پاک کی آیات، مختلف سورتیں، دعائے قنوت وغیرہ پوچھیں، کسی نے جواب میں سنا دیں، کوئی اٹک گیا۔

اور پھر یہ بھی پوچھا گیا کہ دو شادیاں کیوں کیں؟ بیٹا اچھا لگتا ہے یا بیٹی، گرمی کا موسم پسند ہے یا سردی کا؟ کیا ان سوالات سے انکی کاغذات کی صحت پر کچھ اثر پڑنا چاہیے تھا؟ کیا ان سوالات کی بنا پر انکے کاغذات مسترد کیے جا سکتے تھے؟ نہیں، کیونکہ آئین کے آرٹیکل 62 میں اس حوالے سے ذکر تو ضرور ہے لیکن اس طرح نہیں کہ اس بات کو بنیاد بنایا جائے۔ البتہ جس بات کو یا جن شقوں کو بنیاد بنایا جا سکتا تھا، ان پر شاید ہی کسی ریٹرننگ آفیسر نے توجہ دی ہو۔ ان شرائط کے مطابق:۔

ہ) وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم رکھتا ہو، اور اسلام کے منشور کردہ فرائض کا پابند ہو، نیز کبیرہ گناہ سے اجتناب کرتا ہو۔

و) وہ سمجھدار ہو، پارسا ہو، ایماندار اور امین ہو، اور کسی عدالت کا فیصلہ اس کے برعکس نہ ہو۔

چلیں یہ تو درست کہ ان سے پوچھ لیا کہ فلاں نماز میں کتنی رکعت ہوتی ہیں یا نماز جنازہ سنائیں۔۔ درست۔ لیکن یہ جو لکھا ہے کہ اسلام کے منشور کردہ فرائض کا پابند ہو۔۔ کیا کسی نے کسی امیدوار سے یہ پوچھا کہ وہ پانچ وقت کا نمازی ہے؟ اس نے پچھلے دس سالوں میں کتنے روزے نہیں رکھے؟ فرائض ہیں نا۔۔ کیا کسی سے بھی یہ پوچھا گیا کہ اس نے اپنی حلال کمائی میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ سالانہ دی ہے؟ کیا اس نے حج فرض ہوتے ہی یعنی صاحبِ استطاعت ہوتے ہی

حج کا فریضہ ادا کیا ہے؟ نہیں۔ یہ سوالات کسی سے بھی نہیں پوچھے گئے۔

اسی شق میں مزید لکھا ہے کہ گناہِ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو۔ کیا کسی نے یہ سوال کیا کہ وہ شراب کیوں پیتا ہے؟ وہ غیبت کیوں کرتا ہے؟ وہ جھوٹ کیوں بولتا ہے؟ شراب کو احادیث میں ام الخبائث کہا گیا۔ غیبت کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر کہا گیا۔ جھوٹ کو تمام برائیوں کی جڑ کہا گیا۔ کیا یہ گناہِ کبیرہ نہیں ہیں؟ کیا ریٹرننگ آفیسران کو نہیں معلوم کہ کون سا امیدوار کس حد تک خطا وار ہے۔ اگر کوئی امیدوار کہے کہ اس نے تو کبھی جھوٹ نہیں بولا، اس نے کبھی غیبت نہیں کی تو اسکو اسکے کسی بھی ٹیلیوژن پروگرام کی ریکارڈنگ دکھا دی جائے۔ جس میں وہ جھوٹ بھی بول رہا ہوگا اور غیبت بھی کر رہا ہوگا۔ دوسری شادی کیوں کی، بیٹی یا بیٹا۔۔ یہ نہیں بلکہ ان بنیادوں پر ریٹرننگ آفیسران کاغذات مسترد بھی کرتے تو ثواب بھی کماتے اور اگر عدالت میں بھی جانا پڑتا تو دھڑلے سے جا سکتے تھے۔

آل پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ کے کاغذات جس حلقہ سے منظور ہوئے وہاں کے ریٹرننگ افسران نے وجہ یہ بتائی کہ چونکہ ابھی انھیں سزا نہیں ہوئی اسلیے کاغذات مسترد کرنے کی وجہ کوئی نہیں بنتی۔ یعنی کہ شق (و) میں جو ایماندار اور امین کا ذکر ہے وہ بے کار ہے۔ امین ہوتا ہے امانت دار۔ اور ڈاکٹر عافیہ

اس قوم کی بیٹی، اس قوم کی امانت تھی۔ اور اسکو امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔

افغانستان میں اسلامی حکومت تھی۔ صرف ایک ٹیلیفون کال پر اپنے اڈے بھی امریکہ کو دے دیے اور کھلی راہ داری بھی کہ جہاں سے چاہو حملہ کرو، جہاں سے چاہو اسلحہ لے جاؤ۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف ایک غیر مسلم قوم کا ساتھ دیا۔ کیا یہی ایمانداری ہوتی ہے؟ پھر اسی شق میں "اور کسی عدالت کا فیصلہ اس کے برعکس نہ ہو" کا جو ذکر ہے تو صرف ایک بات ہی کافی ہے کہ جناب کا بنایا ہوا این آر او کا قانون کالعدم قرار دیا گیا تو کیا عدالت کا فیصلہ اسکے برعکس نہ ہوا؟ کیا یہ بنیاد کافی نہیں تھی جناب کے کاغذات مسترد کرنے کے لیے۔

انھوں نے سربراہ آل پاکستان مسلم لیگ کے کاغذات مسترد نہیں کیے، اس وقت کی ق لیگ جو کہ انکے ساتھ تھی، جس کے بل بوتے پر وہ ملک کے صدر تھے، کے امیدواران کے کاغذات بھی مسترد نہیں ہوئے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ ریٹرننگ آفیسرز 10 اکتوبر کے اقدام کو غلط ہرگز تصور نہیں کرتے۔ ایک جمہوری حکومت کا دھڑن تختہ کیا گیا۔ آئین پاکستان کو معطل کرکے اپنے کچھ وضع کردہ قوانین پورے ملک میں نافذ کر دیے۔ وہ بھی ٹھیک تھا۔ انھوں نے دو بار ملک میں ایمرجینسی نافذ کی (جو کہ ہرگز نہیں تھی) وہ بھی درست اقدام تھا۔ انھوں نے سپریم کورٹ کے ججز کو ایک عرصے تک بنا کسی قانونی وجہ کے انکے بیوی بچوں سمیت نظر بند

کیے رکھا، وہ بھی صحیح تھا۔ انھوں نے لال مسجد میں سینکڑوں معصوم بچیوں اور طالبعلموں کو شہید کروایا اور ان معصوموں پر بھاری مقدار میں اسلحہ رکھنے کا الزام لگایا۔ وہ بھی درست اقدام تھا۔ واہ چترال کے ریٹرننگ آفیسران واہ۔ آپ کو آپ کی اعلیٰ خدمات کی بدولت تمغہ حسن کارکردگی دینے کو جی چاہتا ہے۔

کیا مختلف شہروں کے ریٹرننگ افسران کو اپنے علاقے کے سیاستدانوں اور دوسرے امیدواروں کا علم نہیں تھا کہ کون کتنا باکردار ہے اور کون کتنا داغدار ہے؟ کون پہلے کیا تھا، کتنے پانی میں تھا اور اب کتنے سمندر میں ہے؟ کون کس جرم میں سزا یافتہ ہے اور کون ضمانت پر رہا ہوا ہوا ہے؟ کس نے کس دورِ حکومت میں رہتے ہوئے کیا کچھ کتنا کمایا؟ کیا یہ باتیں کافی نہیں تھیں کاغذات مسترد کرنے کے لیے۔ لیکن مجال ہے کہ ان باتوں کو کسی نے بھی بنیاد بنایا ہو کاغذات کو واپس کرنے کے لیے۔ (بیشک میرا یہ (آرٹیکل دیر سے ہے، لیکن ریٹرننگ افسران کے علاوہ عام عوام کے لیے بھی ہے۔

ریٹرننگ افسران نے تو کارنامے انجام دے دیے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے انکی اور امیدواروں کے درمیان ہونے والی باہمی موشگافیوں کو بہت اچھے طریقے سے کور کیا۔ لیکن عام عوام کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ کاش یہ سادہ

عوام بہت سی باتوں سنجیدہ طور پر لے ، اور پھر ان پر غور کرے اور سمجھے کہ اگلے الیکشن میں انھوں نے ووٹ کس کو دینے ہیں؟ کیا ان کو جو آرٹیکل 62، 63 پر پورا 2018 اترتے ہیں یا ان کو جو امریکہ ،.برطانیہ ، اسرائیل، بھارت کی شرائط پر۔یا پھر ان لوگوں کو جو منافق کی چاروں علامتوں پر صد فیصد پورا اترتے ہیں؟

ویسے تو لگتا ہے کہ ووٹ اس کو ہی ملیں گے جس نے پاکستان کے لیے ہسپتال بنائے اور ان میں مفت علاج فراہم کیا۔ ان کو پینے کا صاف پانی مہیا کیا۔ سکول بنا کر ان میں تعلیم مفت فراہم کی اور ساتھ میں نصابِ تعلیم میں ہماری اسلامی تاریخ اور پاکستان کی تاریخ کے نامور شخصیات کے حوالے سے تحریریں شامل کی گئیں۔ عوام کو انصاف ان کی دہلیز پر دنوں میں فراہم کیا گیا۔ اگر کسی پر ظلم ہوا تو اس سے پہلے کہ وہ خود کو آگ لگائے، اس کو وہیں پر ظالم کے سامنے انصاف دیا گیا اور ظالم کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ اگر کوئی کسی جرم میں گرفتار ہوا تو کسی بھی سیاستدان نے اس کی ضمانت نہیں کروائی کہ انھوں نے انصاف کا وعدہ کیا ہوا تھا۔یقیناً ہماری عوام ووٹ ان کو ہی دے گی۔ نہ کہ ان کو جنھوں نے میٹرو تو بنا دی شب بھر میں لیکن مزدور پھر بھی گھروں میں تین وقت کا کھانا پیٹ بھر کر نہ خود کھا سکا اور نہ ہی اپنے اہل و عیال کو کھلا سکا۔جنھوں نے اورنج بس سروس اور بلٹ ٹرین بنانے کے لیے ہیلتھ اور

ایجوکیشن کے فنڈ اُدھر بھجوا دیے کہ صحت کا کیا ہے آنی جانی چیز ہے، لیکن اگر آج اورنج بس اور ٹرین نہ چلی تو پھر کبھی نہیں چلے گی کہ کیا پتہ اگلی باری ملتی بھی ہے یا نہیں۔ عوام جی، سوچ سمجھ کر۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ۔
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا

مجھے اپنی عمر تو یاد نہیں شاید آٹھ سال یا دس سال لیکن اسی کی دہائی کے ابتدائی سال تھے۔ جب میں نے ایک جاسوسی ناول زرد لفافہ پڑھا۔ اس سے پہلے میں سسپنس ڈائجسٹ کا ذائقہ چکھ چکا تھا۔ خیر زرد لفافہ ناول اگرچہ یہی کوئی سو صفحات کا تھا لیکن اس کے بعد جو چسکا جاسوسی ناولوں کا لگا تو ایسا لگا کہ آج چالیس کی حد پار ہو گئی ہے لیکن شاید ہی کوئی ناول ایسا ہو جس کو سلور فش یا کتابی کیڑے کی طرح نہ چاٹا ہو۔ انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا یا شوکی سیریز سے پھر چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ خود تو خرید نہیں سکتا تھا کہ والد مرحوم نصابی کتابوں کے علاوہ اور کسی کتاب کی طرف نگاہ ڈالنے کی اجازت تک نہیں دیتے تھے چہ جائیکہ جاسوسی ناول۔ اس کا حل یہ نکالا کہ اس وقت کے جو یار دوست ناولوں کے شوقین تھے اور ان کا جیب خرچ اتنا تھا کہ بازار سے ناول خرید سکتے تھے، انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مارکیٹ میں جمشید، کامران مرزا یا شوکی سیریز کا ہر آنے والا ناول خردیں۔ مزے کی بات ہے کہ انھوں نے بھی یہ ناول پڑھ کر ہی حامی بھری تھی۔

غیر نصابی کتابوں کو بھی شوق چرایا۔ لیکن ناولوں نے کچھ ایسا من میں بسیرا

کر لیا تھا کہ شاید غالب کا یہ مصرعہ کہ چھٹتی نہیں ہے یہ کافر منہ کو لگی ہوئی، مجھ پر سو فیصد لاگو ہوتا تھا۔ اس حد تک ناولوں کا شوق چڑھ گیا تھا کہ سکول میں ٹیچر سبق پڑھا رہے ہوتے تھے اور میں کتاب کے اندر ناول رکھ کر پڑھا کرتا تھا۔ کئی بار ٹیچر نے ناول قبضہ کرکے نقصان بھی دیا، کئی بار مرغا بھی بنا، ہاتھوں پر بید سے مار بھی کھائی، لیکن کیا مجال کہ منہ کا ذائقہ بدلا ہو۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ دسویں کے امتحانات شروع ہونے میں دس بارہ دن رہتے تھے۔ سارے کلاس فیلوز، سارے ساتھی اپنی نصابی کتابوں کو چاٹ رہے تھے، رٹے پہ رٹا لگا رہے تھے اور کچھ بوٹیاں بنانے میں مصروف تھے۔ جب کہ مابدولت ان دنوں میں بھی دن میں کم از کم دو سے تین ناول نہ پڑھ لیں ریاضی کے سوالات سمجھ ہی نہیں آتے تھے۔ جغرافیہ کی یہ صورت حال تھی کہ چین پاکستان کے مغرب میں نظر آتا تھا اور پاکستان کے جنوب میں واقع بحر ہند میں افغانستان دکھائی دیتا تھا۔ پہلے پرچے سے کوئی چار دن پہلے والد صاحب کو شک سا پڑھا کہ اتنا پڑھاکو تو نہیں ہے کہ ہر وقت کمرے میں گھسا رہتا ہے۔ انھوں نے کمرے کی تلاشی لینی شروع کی تو بستر کی پیٹی کے پیچھے سے کوئی تیس کے قریب جمشید، کامران مرزا اور شوکی نکلے۔ اس وقت آپ کے اس لکھاری کو اللہ نے بچایا ورنہ آج میں یہ تحریر نہ لکھ رہا ہوتا۔

سچ کہوں تو وہ ناول نہیں تھے بلکہ ایک اکیڈمی تھے۔ انھوں نے مجھے ذاتی

طور پر بہت کچھ سکھایا۔ زندگی میں جینا سکھایا۔ پریشانی میں، تکلیف میں انکا مقابلہ کرنا سکھایا۔ کسی بھی مشکل میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھنا بلکہ اس کا حل کیسے ڈھونڈھنا ہے، یہ سکھایا۔ اردو کے حوالے سے جس لیول کا بھی امتحان دیا، کبھی فیل نہیں ہوا۔ کیونکہ مجھے یقین ہوتا تھا کہ میں نے اردو میں جو بھی مضمون لکھا ہے، کسی شعر کی تشریح لکھی ہے تو خوب لکھی۔ محاورات و ضرب الامثال کا استعمال بھی موقع محل کے مطابق خوب سے خوب تر کیا ہے۔ پھر روزمرہ کی بات چیت میں جو کسی حد تک حاضر جوابی سیکھی یا کسی کی بات کو گھما پھرا کر اسے چکر پر چکر دیے، یہ بھی فاروق اور آفتاب یا مکھن نے سکھایا۔ اپنے وطن سے محبت کا جذبہ بڑھتا گیا اور تناور درخت بنا۔ سب سے بڑھ کر اللہ سے، اسکے رسول پاک ﷺ عشق کا سبق پڑھا اور پھر چھٹی نہ ملی کہ مکتب عشق میں داخلہ مل چکا تھا۔ یہ سب اگر کمال تھا، یہ سب حسن جمال تھا تو واقعی اشتیاق احمد لازوال تھا۔ یہ سب کچھ صرف میں نے ہی نہیں حاصل کیا بلکہ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے لاکھوں افراد اس مرحلہ سے گزرے ہوں گے۔ جھوٹ نہیں بولنا، بڑوں کی عزت کرنی ہے، بے شک اسلام ہمیں یہ درس دیتا ہے، لیکن دل جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، تو اشتیاق احمد دل سے لکھتے تھے اور قاری دل سے پڑھتے تھے۔ تو دل والے جب دل والوں سے ملتے ہیں تو متاثر ہوئے بنا نہیں رہتے۔ اور اشتیاق احمد نے لاکھوں افراد کو متاثر کیا۔

محترم اشتیاق احمد صرف ایک جاسوسی ناول نگار ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے عبداللہ فارانی کے نام سے بھی بہت سی اسلامی کتابیں لکھیں۔ سیرت النبی ﷺ قدم بہ قدم، سیرت صحابہ قدم بہ قدم، سیرت صحابیات قدم بہ قدم اور ڈھیروں اسلامی کتابیں ان کے قلم سے قلم بند ہوئیں۔ تحریک ختم نبوت ﷺ کے داعی تھے۔ گستاخ رسول ﷺ قادیانوں کے خلاف جب جب، جہاں جہاں ان کو موقع ملا انھوں نے قلمی، زبانی جہاد کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک کو اگر کچھ بھی پسند نہ آئے، جو انھوں نے آقائے نامدار احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان بلند کی، ان کی حرمت کا دفاع کیا، یہ اللہ کے دربار میں ضرور قابلِ قبول ہوگا۔ اسلامی کتابیں لکھنے کا انداز بھی اتنا منفرد اور سہل تھا کہ اگر پانچویں کلاس کا بچہ بھی پڑھے تو بہت آسانی سے سمجھ لے گا۔ ناول تو تھے ہی بچوں کے لیے۔ لیکن یہی بچے ان کے ناول پڑھتے پڑھتے پوری ایک نسل پروان چڑھ گئے۔ انھوں نے ۱۹۷۳ء میں لکھنا شروع کیا تھا اور آج بیالیس سال ہو گئے ہیں، تو ایک نسل جوان تو کیا ادھیڑ عمری میں پہنچ گئی۔ میں نے عمران سیریز پڑھیں، ہر مصنف کی پڑھیں لیکن سب میں منفرد ابنِ صفی مرحوم ہی تھے کہ انکا ہر ناول ایک دوسرے سے جدا ہوتا تھا۔ مظہر کلیم صاحب نے ابنِ صفی کے بعد عمران سیریز کو آگے بڑھایا چار سو کے لگ بھگ ناول لکھے لیکن کبھی کبھی کسی ناول میں احساس ہوتا تھا کہ یہ تو پہلے ہی کسی ناول میں ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی بوریت ہو جاتی تھی۔ پھر ظہیر احمد آئے جن کا ہر تیسرا ناول یہ احساس دلاتا ہے کہ پورا ناول

ہی پہلے پڑھا ہوا ہے، تو سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

اس کے بالعکس محترم اشتیاق احمد کا ہر ناول ایک دوسرے سے ہمیشہ مختلف ہوتا تھا۔ کبھی بھی کسی ناول میں یہ احساس نہیں ہوا کہ پہلے پڑھا ہوا ہے۔ انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا یا شوکی سیریز کے علیحدہ علیحدہ ناول ہوں یا انکے مشترکہ خاص نمبر، ہر ایک کی ایک جداگانہ حیثیت ہوتی تھی۔ واقعی میں اللہ نے اشتیاق احمد صاحب کو خداداد صلاحیت بخشی تھی۔ کافی لمبے عرصے تک وہ ہر ماہ چار ناول لکھتے رہے۔ انکی زندگی میں کافی نشیب و فراز آئے۔ کبھی پبلشرز کی طرف سے تو کبھی تقسیم کار کی جانب سے۔ لیکن جب وہ خود دوسروں کو یہ سبق دیتے تھے کہ ہمت نہیں ہارنی بلکہ ہر مشکل کا مقابلہ کرنا ہے تو خود کیسے پیچھے رہتے۔جب وہ چار ناول ہر ماہ لکھتے تھے تو گویا ایک سال کے اڑتالیس ناول۔ مجھے نہیں یقین کہ دنیا کے کسی بھی مصنف نے یا ناول نگار نے اس طرح کے منفرد ناول اتنی تعداد میں لکھے ہوں۔

ان کے ناولوں کی تعداد مشہور تو آٹھ سو ہے۔ جو صرف جاسوسی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ تعداد ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اگر حکومت پاکستان تھوڑی سی ہمت کر لے تو ایک تو محترم اشتیاق احمد کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہو سکتا ہے اور شاید بہت لمبے عرصے تک رہے۔ دوسرا بعد از وفات انہیں ادب کا نوبل

انعام بھی مل سکتا ہے کہ انھوں نے اردو ادب کی اتنی خدمت کی۔ بے شک جاسوسی ناولوں کو ادب میں نہیں گردانا جاتا لیکن بحیثیت مصنف تو ان کی خدمات کا اعتراف کیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے آج تک کوئی بھی کارہائے نمایاں نہیں انجام دیے ان کو تو پرائیڈ آف پرفامنس ایوارڈ مل سکتا تو جنھوں نے ایک پوری نسل کی زندگی سنوار دی، انہیں کیوں نہیں نوازا جا سکتا۔ یہ ہماری طرف سے ان کے لیے کم سے کم خدمت ہو گی۔
کہیں پڑھا تھا کہ جس میدان کا شہسوار ہو وہ اسی میدان کا ہیرو ہوتا ہے اور اسی میدان میں ہی لوگوں کے دل جیت سکتا ہے۔ وہ کھلاڑی کسی دوسرے میں میدان میں ہرگز اپنے جوہر نہیں دکھا سکتا۔ لیکن محترم اشتیاق احمد نے ہر قسم کے ناول لکھ کر یہ ثابت کیا کہ وہ علم کا ایک سمندر ہیں۔ ان کے ناولوں میں جدید سائنس کا استعمال، تاریخ کی باتیں، جنگل کی یا سمندر کے حوالے سے انھوں نے اپنا علم بچوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔ ناولوں کا کونسا شعبہ تھا جو زیرِ قلم نہیں آیا۔ ہاں نہیں آیا تو واہیات نہیں لکھا۔ مرد عورت کو خلوت میں کبھی نہیں لکھا۔ بچوں کی صحیح معنوں میں تربیت میں اپنا کما حقہٗ کردار ادا کیا۔ واقعی انسان اپنے کردار اور کارناموں سے فاتح بنتا ہے نہ کہ میدان اور میدان کے دلداروں سے... اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو کشادہ فرما کر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنائے، ان کو بلا حساب جنت میں

داخل فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین، ثمہ آمین۔

فاتح جو ہر میدان کے تھے وہ تو گزر گئے ؎
دن زندگی کے چار وہ کرکے بسر گئے

ہم پاکستانی ہیں، حکم کریں، وہ تابعدار ہیں

پاک فوج، پاک فضائیہ اور پاک بحریہ میں اگر کوئی سپاہی بھی بھرتی کیا جاتا ہے تو کئی ماہ تک اُس کی تصدیق کا عمل جاری رہتا ہے جو فوج کے اندر موجود ایک خفیہ ادارہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس سے اُس شخص کے کردار کی تصدیق کرائی جاتی ہے۔ اگر اُس سپاہی کے اوپر اُس کی گزشتہ زندگی میں کوئی جعلی ایف آئی آر بھی موجود ہو تو اُس کو پاکستان کی دفاعی افواج میں بھرتی نہیں کیا جاتا۔ پھر جب وہ سپاہی اپنی ٹریننگ مکمل کر کے اپنی متعلقہ یونٹ میں جاتا ہے تو وہ یونٹ اُس کی تعلیمی ڈگری کو اُس کے متعلقہ تعلیمی بورڈ کو تصدیق کے لیے بھجواتی ہے، اگر اس کی ڈگری جعلی ثابت ہو جائے تو اُس کو اسی وقت فوج سے فارغ کر کے گھر بھیج دیا جاتا۔ اس کے علاوہ دہری شہریت کا حامل کوئی شخص تو فوج میں شامل ہونے کا اہل ہی نہیں ہے۔ یہ طریقہ کار ہے فوج میں بھرتی ہونے والے محض ایک سپاہی کے کردار کی تصدیق کا۔ ایک افسر کی فوج میں بھرتی اور اُس کے کردار کی تصدیق اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ اور پھر نوکری کے دوران بھی افسران اور جوانوں پر فوج میں موجود کئی ادارے نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے نظم و ضبط اور وفاداری پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔

اس کی نسبت اب ہمارے اوپر مسلط کیے گئے ان لٹیرے سیاستدانوں کے کردار پر ذرا نگاہ ڈالیں، تو ان کی زندگی بے شمار ایسے جرائم سے بھری ہوتی ہے کہ ان کی حیثیت فوج میں ایک سپاہی بھرتی ہونے لائق بھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے جیلیں بھی کاٹی ہوتی ہیں، ان پر کرپشن کے مقدمات بھی ہوتے ہیں، انہوں نے دہری شہریت بھی رکھی ہوتی ہے، انہوں نے رشوت دے کر جعلی ڈگریاں بھی حاصل کی ہوتی ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی کام اگر فوج کے کسی سپاہی پر ثابت ہو جائے تو اسے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ جب کہ ہمارے اس پاکستان میں کیا جنگل کا قانون نافذ ہے کہ ان سارے جرائم میں ملوث یہ سیاستدان الیکشن کمیشن سے خود کو صادق اور امین ثابت کر کے، عدالتوں سے جعلی ڈگری اور دہری شہریت ثابت ہونے کے باوجود با عزت بری ہو کے، اپنی اوپر کرپشن اور دھاندلی کے الزامات سے دھل کر، پاکستان میں وزیر اور مشیر اور صدر کے عہدے پر فائز ہو جاتے ہیں--- جی ہاں، صدر، جو کہ پاکستان کی مسلح افواج کا سپریم کمانڈر ہوتا ہے، انہی مسلح افواج کا سپریم کمانڈر، جن میں اس صدر جیسے کردار کے حامل شخص کو سپاہی بھی بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔۔۔

اور پھر یہی "صادق اور امین" سیاستدان، اور بریف کیس پر بکنے والے جج، اور دو دو ٹکے کے "ابنِ وارث میر" صحافی، اور خود ساختہ تجزیہ کار، اور بھارت

نواز وزیراعظم یہ سب کے سب مل کر ایک فوجی جرنیل پر "غداری" کا مقدمہ چلاتے ہیں۔ جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے جہاز کو ہائی جیک ہوتے دیکھ کر ایک اٹھائیس فیصد ووٹوں میں سے بیس فیصد ووٹ حاصل کرکے بننے والی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ یا پھر لال مسجد سے بڑھتی دہشت گردی کا خاتمہ کیا تھا۔ بے شک بچیوں کو مارا گیا، طلباء کو مارا گیا، یہ ظلم ضرور ہوا۔ لیکن آج پھر دیکھ لیں، جن مولانا صاحب کو چھوڑا گیا، وہ پھر حکومت کی رٹ کو للکار رہے ہیں۔ آخر کچھ تو ہے ان کے پاس، کوئی تو ہے ان کی پشت پر جن کی شہہ لے کر وہ نعرے لگا رہے ہیں۔ کیا یہی ہمیں اسلام سکھاتا ہے۔

جو کچھ اوپر ذکر ہوا، ایسا صرف پاکستان میں ہی ہو رہا ہے. یہ سب کفر نظام جمہوریت اور دجالی میڈیا ہی کی بدولت ہے۔ ان سیاستدانوں میں وہ بھی شامل ہیں جنھوں نے غریبوں کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کیا ہوتا ہے۔ وہ بھی شامل ہیں جنھوں نے عوام کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہوئے انہیں موت کے گھاٹ اتارا ہوتا ہے۔ وہ بھی ہیں جن کے بچوں نے خود کو خدائی فوجدار سمجھتے ہوئے اپنے باپ کی کرسی کا ناجائز کیا، ہر فائدہ اٹھاتے ہوئے غریبوں کو مسل کے رکھ دیا ہوتا ہے۔ زین قتل کیس کی مثال سامنے ہے۔ جو گواہ تھے وہ مکر گئے کہ ان کو ڈرایا گیا، دھمکایا گیا۔ اور وہ ڈر بھی گئے اور دھمکی میں بھی آ گئے کہ انہیں بھی اپنی زندگی عزیز تھی۔ یہاں تو وہ بھی شامل ہیں جنھوں نے عدالت میں خود حامی بھری

کہ انھوں نے یہ جرم کیا ہے لیکن کوئی بھی کسی قسم کا ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ جب ایک ملزم خود حامی بھر رہا ہے تو کیا پھر بھی کسی ثبوت کی ضرورت رہ جاتی ہے؟
کہتے ہیں کہ چین کے کسی وزیر نے پاکستان کا دورہ کیا۔ واپسی پر جب وہ چین گیا تو میڈیا کے نمائندوں کے ایک سوال کا کہ انھوں نے پاکستان کو کیسا پایا، جواب دیا کہ جو صورتحال پاکستان کی ہے، جس طرح اسے باہر سے بھی اور اندر سے بھی کھایا جا رہا ہے، اگر یہ صورت حال چین کی ہو جائے تو چین پانچ سے دس سالوں کے اندر اندر دنیا کے نقشے سے غائب ہو جائے۔ وہ حیران ہیں کہ پاکستان کس طرح ۱۹۴۷ سے قائم و دائم ہے۔ اس کی اس بات کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ اس پاکستان پر اللہ پاک کی خاص الخاص رحمت ہے۔ پہلے دن سے جب سے ایک قادیانی اس ملک کا وزیرِ خارجہ بنا، تب سے آج تک جب اس وطن پر حکمرانی کرنا اپنا مادر پدر حق سمجھا جاتا ہے، یہ پیارا دیس اللہ کے آسرے پر چل رہا ہے۔ کیا کیا سازشیں اس کے خلاف نہیں ہوئیں، کہاں کہاں اس کو مات نہیں دی گئی، چاہے وہ شملہ معاہدہ ہو، یا معاہدہ تاشقند یا وہ میثاقِ جمہوریت ہو، ہر جگہ ان سیاستدانوں نے اپنا ہی سوچا۔ اللہ کے دوستوں نے جنھیں قرآن میں ولی اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے، بار بار اور کئی بار وقت کے حکمرانوں کو پیغامات پہنچائے کہ فلاں کام نہ کیا جائے، فلاں بات نہ کی جائے۔ لیکن افسوس، صد افسوس ہم نے ان

کی بات نہ مانی۔ قائدِ اعظم کے مخالف ترین محترم شبیر احمد عثمانی نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے کہ رات کو خواب دیکھا کہ رسولِ پاک ﷺ قائدِ اعظم کے کندھے پر ہاتھ مبارک رکھ کر کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ یہ میرا مجاہد ہے۔

مولانا حسرت موہانی ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے لیے ہندوستان بھر کا دورہ کر رہے تھے۔ ریل کے سفر میں ایک صاحب پیر محمد علی راشدی صاحب ملے اور کہا کہ اس دورے سے کیا ملے گا۔ کیونکہ کانگریس اور انگریز دونوں پاکستان کے مخالف ہیں۔ تو مولانا نے جواب دیا کہ پاکستان ان شاء اللہ بن کر رہے گا کہ انہیں خواب میں رسول پاک ﷺ کی زیارت ہوئی اور آپ ﷺ نے مولانا کو قیام پاکستان کی بشارت دی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول پاک ﷺ جب خود ایک عظیم بزرگ کو پاکستان کی بشارت دے رہے ہیں تو پھر پاکستان کو دنیا کی کوئی طاقت بھی ان شاء اللہ مٹا نہیں سکتی۔ وہ وقت دور نہیں جب اس پیارے وطن پر ایسے حکمران آئیں گے جو اسلام کا بول بالا کریں گے۔ یہاں سے ہی دجالی نظام کے خلاف سارا منصوبہ بنے گا۔ دجال اور اسکا سارے نظام کو تہہ تیغ کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ وہ وقت ہر گز دور نہیں جب ہم فخر سے کہہ سکیں گے ہم پاکستانی ہیں اور دنیا کہے گی کہ حکم کریں، وہ تابعدار ہیں۔

ہندوستان کی حکومت اور ہماری باتیں

نریندرا مودی کے بارے میں میں گذشتہ سال انٹرنیٹ پر پڑھا تھا کہ چاہے اسکے خیالات اب جو کچھ بھی ہوں لیکن یہ بہت بڑی بات ہے کہ موجودہ گجرات ریاست میں ایک تیلی کا کاروبار کرنے والے کا بیٹا تھا اور بچپن میں اپنے پتا کا چائے بیچنے میں یا چائے کے سٹال میں ہاتھ بٹاتا تھا۔آج وہ اپنی محنت سے اس عہدہ تک پہنچا۔ بات درست۔ لیکن ہم کیا کریں، مسلمان جو ٹھہرے۔ اللہ کے احکامات کو جانتے ہوئے بھی، مانتے ہوئے بھی عمل نہ کرنے کا جرم کرتے ہیں۔ اسکے رسولِ پاک ﷺ کی سنتوں کو سرآنکھوں پر بٹھاتے ہوئے بھی ان میں اپنے مطلب کی سنتیں اکٹھی کر بیٹھتے ہیں۔ سب باتیں اپنی جگہ، لیکن جب ہم سے کچھ بھی نہیں بن پاتا، اور جب یہ محاورہ سامنے آتا ہے کہ انسان بنائے ، خدا ڈھائے تو پھر ہمیں سو فیصد تو کیا ہزاروں فیصد خدا کی مصلحتوں کا یقین آ جاتا ہے۔

ایک قول جو آج کل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کیا جارہا ہے کہ جب انسان کو پیسہ اور اختیار مل جاتا ہے تو وہ نہیں بدلتا بلکہ اسکی اصلیت سامنے آجاتی ہے۔ تو ایسا کچھ بھی اس نریندرا مودی کے ساتھ بھی ہے۔ اگر تو وہ واقعی کسی تیلی کا بیٹا ہوتا، مشکلات سے گزرا ہوتا، چلیں گزرا ہو گا، لیکن

اسکے ارد گرد کا ماحول اسکے دل و دماغ میں کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ آج جب وہ ہندوستان کا وزیرِ اعظم بن چکا ہے تو اس نے حلف اٹھانے سے پہلے کسی صحافی کے پاکستان کے بارے میں سوال کے جواب میں کہا پاکستان کے بارے میں کیا کہنا، وہ تو ہندوستان کا دشمن نمبر ایک ہے۔ اب کوئی پوچھے کہ کیا نریندرا مودی کو اختیار ملتے ہی وہ بدل گیا ہے یا اسکی اصلیت سامنے آ گئی ہے۔ کوئی بتائے گا کیا؟

ابھی ووٹوں کی گنتی ہو رہی تھی کہ پاکستان سے مودی صاحب کو مبارک سلامت کے پیغامات بھی ملنا شروع ہو گئے تھے۔ اور پھر اسکے اس بیان پر جب یہاں کے کسی وزیر سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہوئی وہ ادھر پاکستان مخالف بیانات داغ رہا ہے اور یہاں سے اسے تہنیتی اور مبارکباد کے پیغامات بھیجے جا رہے ہیں۔ تو وزیرِ موصوف نے جواب دیا کہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں فرق نہیں پڑتا؟ تو جواب ملا کہ یہ تو انکے سیاسی بیانات ہیں کہ ساکھ بھی تو بنانی ہے۔ واہ جناب کیا کہنے۔ ابھی تو مودی صاحب نے حلف بھی نہیں لیا اور ابھی سے انکے یہ تیور ہیں تو بقول طلعت حسین کے جب وہ اختیار پوری طرح اپنے قبضہ میں کر لیں گے تو پھر کیا کچھ کریں گے۔ اور آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ اس نے ہندوستان کو واقعی ہندوؤں کا ملک بنا دیا ہے۔ بلکہ یہاں تک اسکے دور میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں صرف ہندو بس سکتے ہیں چاہے وہ دنیا میں کہیں

بھی رہتے ہوں، ان کے لیے ہندوستان کے دروازے ہر دم کھلے ہیں۔ دوسری طرف نریندرا موودی کے مسلمانوں سے متعلق کیا کچھ اعلانات ہیں، سب جانتے ہیں۔ اخبارات میں سب کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ میں کیا لکھوں۔

ویسے بھی ہمارے موجودہ حکمرانوں کو ہندوستان سے یاریاں لگانے کا بہت ہی زیادہ شوق ہے۔ انکا یقیناً آدھے سے زیادہ کاروبار تو ہندوستان میں ہے، تب ہی یہاں کی زرعی اجناس پہلے برآمد ہو کر ہندوستان جاتی ہے، پھر اُنکی قیمتوں پر پاکستان واپس درآمد کی جاتی ہے۔ یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام بھی کھرے ہو جاتے ہیں۔ یہاں تھر میں لوگ قحط سے مر گئے وہاں سٹوروں میں گندم ہزاروں ٹنوں کے حساب سے خراب ہوئی، لیکن حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اللہ نے بھی ایسا حساب کیا کہ جب وہ قحط زدہ علاقوں میں بانٹ نہ سکے تو بیچ کر دام بھی کھرے نہ کر سکے۔ لیکن ان سے کیا بعید اسی خراب گندم کو اصلی اور تندرست گندم میں ملا کر بیچ ڈالیں۔ بلکہ بیچنا کیا انھوں نے تو ہندوستان سے معاہدہ ہی کرنا ہے کہ یہاں سے انھیں یہ خراب گندم بھیجی جا رہی ہے وہ اپنی اصلی گندم میں ساٹھ اور چالیس کی نسبت سے اس کو ملا کر واپس پاکستان بھیج دیں۔ دونوں پارٹیاں منافع میں رہ جائیں گی۔

نریندرا مودی ہو یا واجپائی یا من موہن سنگھ، سب کوٹلا چانکیہ کے چیلے ہیں

اور اپنی شاگردی کو ثابت کرکے چھوڑتے ہیں۔ انکی نس نس میں یہ سبق سمایا ہوا ہے کہ دشمن کو ہمیشہ دشمن سمجھو، اس سے کبھی بھی سمجھوتہ نہ کرو۔ اگر سمجھوتہ کرنا بھی پڑے تو آخری وار اپنے ہاتھ میں ہی رکھو اور پہلا موقع ملتے ہی وار کرڈالو۔ خود دیکھ لیں، پاکستان کے دنیا میں معرضِ وجود میں آنے سے اب تک ہندوستان نے پاکستان سے کون سا اچھا سلوک کیا ہے۔ پچھلے سڑسٹھ سالوں میں کوئی سیاست دان، کوئی پاکستانی جس کو ہندوستان کی تاریخ پر عبور حاصل ہو، جس کو کرنٹ افیئرز کا اپ ڈیٹ علم ہو، کوئی ایک کام، بات ایسی بتادے جس میں سو فیصد پاکستان کا فائدہ رہا ہو اور ہندوستان کو نقصان ہوا ہو، لیکن ایسا نقصان کہ جس کے بدلے پھر ہندوستان نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے۔ نہیں، میرا خیال تو نہیں کہ کوئی ایک لمحہ بھی ہندوستان نے پاکستان کے حق میں گزارا ہو۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بات میں ہرگز نہیں کررہا۔ کیونکہ انکی اکثریت بھی جیسا ہندو چاہتے تھے کہ وہ شدھی بن جائیں تو آج بنا محنت کے وہ شدھی بن بیٹھے ہیں۔ اگر ہندوستان کا سپر سٹار شارخ خان (کم از کم میرا نہیں، مسلمانوں کا نہیں) کہتا ہے کہ میرے گھر میں گیتا بھی رکھی ہے اور قرآن بھی۔ اسکی اولاد کا جو دل کرے وہ پڑھے تو کیا ایسا شخص مسلمان ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ پاکستانی اداکار محمد علی نے ہندوستان کی کسی فلم میں کوئی کردار ادا

کیا تھا۔ انکے کردار کی ڈیمانڈ کے مطابق کسی مندر میں جا کر وہاں کے بھگوان کو اگر میں غلطی پر ہوں تو کوئی درست کر دے، یا تو ماتھا ٹیکنا تھا یا دایاں ہاتھ مندر کی دہلیز پر لگا کر اپنے ماتھے پر لگانا تھا، یعنی جو بھی تھا، رسم ہندوؤں کی عبادت جیسی ہی تھی۔ تو محمد علی صاحب وہ کردار ادا کرکے جب پاکستان واپس آئے۔۔ فلم لوگوں نے دیکھی تو یہ منظر دیکھتے ہی ان پر گویا فتوؤں کی بارش شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہا گیا کہ انہیں تجدید ایمان کرنا ہوگا کہ ایسی حرکت کرنے سے وہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں۔ تو جب صرف ایک بار اس طرح کرنے سے محمد علی صاحب پر کفر کا فتویٰ لگ سکتا ہے تو پھر وہاں کے ان اداکاروں کے بارے میں کوئی کیا کہے گا جو ہر فلم میں اس طرح کا ایک سین تو لازمی کرتے ہیں، اوپر سے بیان بھی دیتے ہیں کہ انکی اولاد کی مرضی جو مذہب چاہے اختیار کریں۔

سیاہ فام باراک اوباما (حسین کا نام لگانا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پیارے نام کی توہین ہے) کے صدر بننے پر امریکہ کے کالوں میں خوشیوں کی ایک لہر نہیں بلکہ پورے سمندر کی لہریں ٹھاٹھیں مارنا شروع ہو گئی تھیں، لیکن آج چار سال پورے ہونے کے بعد کیا کوئی سیاہ فام (ماسوائے انکے جو حکومت میں ہیں یا حکومت کی مجبوری ہیں) یہ کہہ سکتا ہے انکی بہبود کے لیے یا فلاح کے لیے اوباما نے کوئی کردار ادا کیا ہے۔ قطعاً ناممکن۔ کیونکہ اصل حکومت تو

وہاں انگریزوں کی ہی نہیں بلکہ یہودیوں کی ہے۔ اور یہودی تو یہ چاہتے ہی نہیں کہ انگریز سیاہ فام ترقی کریں یا امریکی حکومت کوئی ایسا قانون پاس کرے جس کی بنیاد پر وہاں کے مسلمانوں کو کوئی بھی بہترین قسم کے حقوق حاصل ہوں۔ تو پھر نریندرا مودی بھی تو ہندو ہے، اور کوٹلا چانکیہ کا چیلا ہے۔ وہ اپنے گرو کی تعلیمات کو کیسے بھول سکتا ہے۔ وہ مسلمان تو ہر گز نہیں۔ اس نے تو ہمیشہ اپنے ہندو ساتھیوں کا ساتھ دینا ہے۔ اپنے تابڑ توڑ حملوں کے بعد اس نے وزیرِ اعظم پاکستان جناب نواز شریف کو اپنی حلف برداری کی تقریب میں شرکت کی دعوت دے دی اور انھوں نے اس خوش سے قبول کی جیسے حلف برداری کی دعوت نہ ہو سوئٹزلینڈ میں فری میں اکاؤنٹ کھولنے کا کہا گیا ہو۔ واہ رے تیرے کیا کہنے۔ اور نہ صرف یہ دعوت نامہ ہنسی خوشی قبول ہوا بلکہ ہنسی خوشی اس تقریب میں شرکت کی گئی۔ جانے سے پہلے وہ میڈیا کو بیان دے کر گئے کہ نہ صرف تقریب میں شرکت کریں گے بلکہ دو طرفہ معاملات کو بہتر بنانے کے لیے بھی گفتگو کریں گے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ تب سے اب تک یعنی چھبیس مئی ۲۰۱۴ سے لے کر آج تک ہندوستان نے پاکستان کو کس نظر سے دیکھا۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کراس بارڈر فائر کر کے انھوں نے کتنے بے گناہ شہریوں کو شہید کیا۔ کس کس پاکستانی شخصیت کو ذلیل نہیں کیا۔ گلوکار غلام علی کے ساتھ کیا ہوا۔ خورشید قصوری صاحب کی کتاب کی رونمائی کی صورت

حال سب کے سامنے ہے۔ ہمارے کتنے اور گلوکاروں کو وہاں کنسرٹ کرنے سے نہ صرف روکا گیا، بلکہ ان کی تذلیل بھی کی گئی۔ صرف ایک عدنان سمیع خان غدار وطن ہے جس نے پاکستان کے سبز پاسپورٹ کو اپنے سے دور کیا اور ہندوستان کی قومیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ ہندوستان میں وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کو مکمل طور پر آزاد رہنے کی آزادی نہیں ہے تو کسی پاکستانی مسلمان کو کب کھلی آزادی دیں گے۔ اس نے یقیناً پھر پاکستان کا رخ کرنا ہے۔ لیکن ہم پاکستانی ان شاء اللہ اس کو دوبارہ پاکستان میں گھسنے نہیں دیں گے کہ کہیں لوگ اس کو گھس بیٹھیا نہ کہہ بیٹھیں۔

المرکز اسلامی سے سنے پیک تک۔

آٹھ جون ۱۹۸۲ء کو اس وقت کے گورنر سندھ لیفٹننٹ جنرل ایس۔ ایم عباسی نے بلدیہ عظمیٰ کراچی کے علاقہ فیڈرل بی ایریا میں ایک اسلامی، ثقافتی اور تہذیبی مرکز "المرکز اسلامی" کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس مرکز کے قیام کا مقصد یہاں ایک عظیم الشان مرکز قرآن و سنۃ قائم کرنا تھا۔ اس مرکز کے قیام کا خواب اسی کی دہائی میں پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر فیڈرل بی ایریا کے کونسلر اور جماعت اسلامی کے رہنما جناب اخلاق احمد نے دیکھا اور اس خواب کو تعبیر دینے کا فیصلہ اس وقت کے میئر کراچی جناب عبدالستار افغانی اور بلدیہ کونسل نے کیا۔ اس کی تعمیر کی لاگت کا ابتدائی تخمینہ ایک کروڑ اٹھائیس لاکھ روپے لگایا گیا۔ جب کہ جو پلاٹ مختص کیا گیا اس کی قیمت بھی کئی کروڑ روپے تھی۔

اس "المرکز اسلامی" کے حوالے سے جب جناب اخلاق احمد سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا:

اس سینٹر میں سیٹنگ ارینجمنٹ کی گئی وہ سات سو پچاس افراد کی تھی۔ مرد نیچے اور" خواتین اوپر گیلری میں۔ اور جو مختلف ہال تعمیر کیے گئے تھے اس

میں اسلامی ممالک میں جو کلچرل ڈویلپمنٹ ہوئی ہے، اسکے ماڈلز، انکے نقشے، انکے چارٹس، اسکی رپورٹس یہاں رکھی جائیں گی۔ ساتھ میں خیال یہ تھا کہ اس مرکز کو ریسرچ سینٹر کے طور پر بھی استعمال کیا جائے۔ اسکے ایک کونے میں فلیٹس بنانے کی سکیم تھی اور دوسرے کونے میں مسجد۔ یہ پراجیکٹ بن تو گیا تھا لیکن مسجد کا بننا، اور ریسرچرز کے لیے فلیٹس کی تعمیر، یہ کام نہیں ہو پایا۔"

المرکز اسلامی کی بدقسمتی کہیں یا کچھ بھی کہ جب بھی اقتدارِ شہر بھائی لوگوں کے ہاتھ میں آیا، اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں فاروق ستار صاحب کراچی کے میئر بنے۔ لیکن اس مرکز کی تعمیر کی طرف ان کا دھیان ہرگز نہیں گیا۔ یا یوں کہیں کہ کراچی کے دیگر تعمیر و ترقی کے کام تو انکی ترجیحات میں شامل تھے، لیکن اس مرکز کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے تعمیراتی کام کی رفتار سست ہو گئی۔ لیکن پھر بھی اچھی بات یہ تھی کہ چونکہ بجٹ پہلے ہی پاس ہو چکا تھا اسلیے کام البتہ جاری رہا۔ بالآخر ۹۰ کی دہائی میں اسکا تعمیراتی کام مکمل ہوا۔ لیکن ارباب اختیار کی عدم دلچسپی اور توجہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایک خالی عمارت ہی رہا۔ اور لمبے عرصے تک اس عمارت میں مکڑیوں کا بسیرا رہا۔ آخر اس عمارت کی قسمت جاگی اور ۲۰۰۱ء میں نعمت اللہ خان صاحب کراچی کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ شہر کی خوبصورتی کی طرف تو ان کی

توجہ تھی ہی، اس عمارت کو بھی اسکا مقام دلوانے کے لیے انھوں نے دل سے کام کیا۔ تعمیر میں جو کمی بیشی رہ گئی تھی، اس کو مکمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ انھوں نے اس عمارت کو قرآن و سنہ کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس حوالے سے سٹی کونسل نے کئی اہم قراردادوں کی منظوری دی۔ ایک خطیر رقم بھی منظور ہوئی جس کو اس عمارت کی تزین و آرائش کے لیے کام میں لایا گیا۔ بیش قیمت کرسیاں خریدیں گئیں، اے سی پلانٹ لگایا گیا۔

باالآخر اس عمارت کا سنگِ بنیاد جس مقصد کے لیے رکھا گیا تھا وہ خواب پورا ہوا۔ اس کو المرکز اسلامی " کا روپ دیا گیا۔ اس کی گورننگ باڈی میں شہر کے مشہور اہل" دانشوروں کو شامل کیا گیا۔ اس عمارت کے مختلف ہالوں میں ، آڈیٹوریم میں مختلف نوعیت کے اسلامی، تعلیمی اور ثقافتی پروگرام منعقد کیے جانے لگے۔ بہت عمدگی سے اس مرکز کو اسلامی تعلیمات سے آگاہی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ لیکن پھر اس کو کسی بد بخت کی نظر لگ گئی ۔ اگست ۲۰۰۵ میں نعمت اللہ خان کا دورِ نظامت ختم ہوا اور ایم کیو ایم کے مصطفٰی کمال کے سر پر کراچی شہر کی نظامت کا ہما بٹھایا گیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد انھوں نے نجانے کس کے کہنے پر اس عمارت کو بھانڈوں اور میراثیوں کے حوالے کر دیا گیا اور اس مرکز کا نام تبدیل کرکے شانزے آڈیٹوریم رکھ دیا گیا۔ جو بیہودگی اس کے ذریعے عام کی گئی خدا کی پناہ۔ اسے لچر سٹیج ڈراموں اور فحش ناچ گانوں

کا مرکز بنا دیا گیا۔

اپریل ۲۰۱۲ میں کراچی کے ایڈمنسٹریٹر محمد حسین سید نے اہلِ علاقہ کے احتجاج پر اس شانزرے آڈیٹوریم کو سیل کرا دیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد اس سیل کو توڑ کر اسکو مرکز علم و ثقافت بنا دیا گیا۔ اور باہر المرکز اسلامی کی جگہ مرکز علم و ثقافت کا بورڈ آویزاں کیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بات بھی قابلِ برداشت تھی کہ ناچ گانوں سے تو بدرجہا بہتر تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس مرکز علم و ثقافت کو سینما ہال میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ ایک انتہائی افسوس ناک، شرمناک اور دردناک بات تھی۔اہلِ علاقہ کے لوگوں کی پیشانی پر یہ ایک بدنما داغ تھا۔جب یہ "المرکز اسلامی" تھا تو اسکی پیشانی پر کلمہ طیبہ تحریر تھا۔ خدا کے گناہگاروں نے، ظالموں نے اس کلمہ طیبہ کو سفید رنگ سے چھپا کر اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی لایعنی کوشش کی۔افسوس! المرکز اسلامی کو سنےپیکس سینما میں تبدیل کر دیا گیا۔ شہر کے وسط میں واقع سرکاری عمارت میں پاکستان دشمن پڑوسی ملک بھارت کی فحش اور نیم عریاں فلموں کی نمائش کا آغاز کیا گیا۔

یہ ساری باتیں اس فیڈرل بی ایریا کے مکینوں کو معلوم ہیں۔ جو ادھیڑ عمری میں قدم رکھ چکے ہیں وہ اسکو تعمیر ہوتے دیکھ چکے ہیں اس کے عروج و زوال سے

واقف ہیں۔ لیکن باہر کا شاید ہی کوئی فرد اس بات پر یقین کرتا ہو۔ اس کو یہ ساری بات ایک کہانی لگتی ہے۔ ایک فسانہ لگتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسی عمارت کو جس میں قرآن و سنت کا درس ہوتا ہو، جس میں اسلامی تعلیمات کی تعلیم دی جاتی ہو، آج اس میں اسلام کی تعلیمات کے بالکل برعکس فلمیں چل رہی ہوں۔ یہ یقین صرف عوام کو ہی نہیں آتا بلکہ اس عمارت کے در و دیوار میں بنے محرابوں اور چھت پر بنے گنبد بھی سوچ میں مبتلا ہیں کہ یہ کیا ہو گیا کہ اس مملکت خداداد میں ایسا ظلم بھی ہو سکتا ہے کہ مرکز قرآن و سنہ کو سینما گھر میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ سارا ظلم روا رکھنے کے ذمہ دار وہ لوگ جو خود کو بانیانِ پاکستان کی اولاد کہتے ہیں۔ وہ بانیان پاکستان، جنھوں نے پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الااللہ کا نعرہ بلند کرکے پاکستان حاصل کیا تھا۔

میرا سوال یہ ہے کہ بابری مسجد کے گنبدوں کو تو شہید کرنے والے جنونی ہندو تھے۔ لیکن اس المرکز اسلامی کے گنبدوں کی حرمت کو پامال کرنے والے ظالم کون لوگ ہیں؟ کوئی دین سے محبت کرنے والا محب وطن تو یہ کام نہیں کر سکتا۔ پاکستان کے لوگو، خاص طور پر کراچی کی عوام کو کہنا چاہتا ہوں کہ وہ عمارت شانزے آڈیٹوریم ہر گز نہیں تھا۔ شادی لان اور سینما گھر بھی نہیں تھا۔ تاریخ شاہد ہے۔ ریکارڈ نکال کر دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ عمارت "المرکز

اسلامی" کی تھی۔ کراچی کے لوگو! یہ عمارت تم سے پوچھتی ہے کہ گنبد چودہ سو سال سے اسلامی طرزِ تعمیر کی علامت ہے۔ سینما گھروں پر گنبد نہیں ہوتے۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے۔ کیا آپ اس عمارت کی شناخت کی بحالی کے لیے آواز اٹھائیں گے؟

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہوں میں فحاشی پھیلے، وہ دنیا و آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ " (سورۃ النور، آیت۔19)

سردی کے مزے

سردیاں ہوں اور بازاروں میں رش نہ ہو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ہوتا ہے نا رش۔ کوئی رضائی، کمبل کی دکان میں گھس کر ناپ تول کر رہا ہے تو کوئی کوٹ جرسی کی دکان پر کھڑا حسرت بھری نگاہوں سے دکان دار کو دیکھ رہا ہے کہ شاید کوئی سستا سا آئیٹم دکھا دے۔ اور کوئی استاد جی بن کر درخواست نما حکم دیتا ہے کہ بھائی سردیاں آ گئی ہیں، کچھ لکڑیاں، کوئلہ وغیرہ اکٹھا کر لو اور ہم تڑ سے جواب دیتے ہیں کہ بھائی ڈائریکٹ حکم دو۔ یہ کیا ڈپلومیسی شروع کی ہوئی ہے۔ زبان سے حکم اور چادر کے نیچے سے ہاتھ باندھے ہوئے کہ بھائی مان جاؤ، کیونکہ بھابھی جو دیکھ رہی ہوتی ہیں ترچھی نظر سے۔ اب کوئی کہے کہ جب سردیاں شروع ہو گئیں تو ایسے میں اب کوئلہ، لکڑی اکٹھا کرنے کا کیا فائدہ۔ میرے ان الفاظ پر کہ بلاواسطہ حکم مانا جا سکتا ہے، استاد جی انتہائی درجے کی معصوم صورت بنا کر کہتے ہیں، بھائی میں شریف آدمی ہوں اور میری شرافت ظاہر کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ یعنی کہ پھر تو شیخ صاحب یا خان صاحب پرلے درجے کے شریف کے متضاد ہو گئے۔

بالکل اسی طرح جیسے شریف اور اسکا متضاد لفظ ہوتا ہے، سردیاں بھی دو قسم کی

ہوتی ہیں ایک وہ سردی کے موسم میں سردیاں ہوتی ہیں، جن کے لیے پاکستان میں نومبر، دسمبر، جنوری، فروری کے ماہ عام طور پر ہوتے ہیں، اور باقی ملکوں میں انکے موسمی حالات کے مطابق مہینے ہوتے ہیں۔اس سردی میں کبھی کبھی کچھ ملکوں کے کچھ علاقوں میں برفباری بھی ہو جاتی ہے اور کم عقل لوگ بلکہ نوجوان زیادہ کہیں برف کے مجسمے بنا کر اپنی یادیں چھوڑ آتے ہیں۔ اور جو دوسری قسم کی سردی ہوتی ہے وہ مجھے ہوتی ہے یا کسی کو بھی ہو سکتی ہے اور اس میں موسم کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ایسی سردی ہوتی ہے کہ جس بعد شاید ہر کوئی چاہتا ہے کہ گرمی لگے اور پسینہ زور و شور سے نکلے۔ اس سردی میں کوئی برف نہیں گرتی کہ جس پر روح افزاء کو چھڑک کراسکے گولے بنا کر کھایا جائے۔ اس سردی میں تو لحاف، رضائی پر رضائی کی ضرورت پڑتی ہے۔

سردی لگنے کی وجہ کوئی بھی نہیں ہوتی۔ بس سردی ہو جانی چاہیے۔ سردی خود بخود آپ کو گھیر لیتی ہے۔ اور جب آپ گھیراؤ میں آجاتے ہیں تو آپ کا حلیہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔اگر شروعات پاؤں سے کروں تو پھر موٹی موٹی جرابوں کے دو عدد جوڑے ایک دوسرے کے اوپر نیچے پہنے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار تو ہوتے وہ ہی دو جوڑے ہوتے ہیں لیکن دیکھنے والوں کو مختلف لگتے ہیں کہ جلدی میں جوڑے کا ایک حصہ اوپر نیچے ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد پینٹ شلوار بھی بہترین قسم

کے موٹے کپڑے کی اور اوپر سے پاجامہ جو کے شلوار یا پینٹ کے نیچے پہنا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں کبھی گھٹنا کھجایا جا رہا ہے تو کبھی پنڈلیوں کی شامت آئی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ سردی میں گرمی لگنے لگتی ہے یا کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ اگر شرٹ یا قمیض کی طرف آئیں تو اس کے نیچے ایک عدد موٹی سی بازو والی بنیان اور اسکے اوپر بنا بازوؤں کے اونی جرسی، پھر اوپر قمیض یا شرٹ، اسکے اوپر ایک عدد جرسی اور پھر ایک عدد کوٹ یا جیکٹ۔ پھر گلے کے گرد ایک موٹا سا اونی مفلر لپیٹا ہوتا ہے جس نے کانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہوتا ہے اور پھر سر پر وگ کی بجائے ایک عدد انتہائی موٹی ٹوپی پہنی ہوتی ہے۔ جب یہ حلیہ سامنے آتا تو یوں لگتا ہے جیسے بندہ آفس یا کالج، سکول نہیں بلکہ سیاچن جا رہا ہو۔

یہ تو ہوا ایک سردی میں حلیہ۔ جب دوسری قسم کی سردی لگتی ہے تو پھر بندہ یا تو بستر کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اونچی نیچی کراہوں سے گھر والوں کو تنگ کرتے ہوئے لیٹ جاتا ہے اور ایک زور کی آواز لگاتا ہے کہ ہائے میں مرا، کوئی میرے اوپر رضائی ڈال دے۔ رضائی ڈالی جاتی ہے لیکن اسکے دانتوں کے بجنے کی آواز پھر بھی نہیں دبتی۔ ایک اور رضائی، اس پر کمبل ڈالا جاتا ہے۔ لیکن چارپائی ہے کہ زور زور سے ہل رہی ہوتی ہے کہ بندے کے کانپنے میں اتنی شدت ہوتی ہے جیسے 9 ریکٹر سکیل کا زلزلہ آیا ہوا ہو۔ جب سردی کی شدت کم، آوازوں

میں پستی اور کانپنے کی حالت ختم ہوتی ہے تو جو بندہ ان رضائیوں اور کمبل سے منہ باہر نکالتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی اپنا سارا خون کرائے پر دے کر آیا ہو۔ چہرہ پیلا بالکل اس لیموں کی طرح جس کو نچوڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ بال بکھرے ہوئے جیسے برسوں سے کنگھی نہ کی ہو۔ آنکھیں سرخ جیسے کسی نے آنکھوں میں سرخی جما دی ہو۔ پھر تھوڑی دیر بعد یہ سردی لگا بندہ اگر باہر نکلتا ہے تو سخت گرمی میں ایک عدد کمبل لپیٹ کر نکلتا ہے اور دیکھنے والے کہتے ہیں کہ پاگل ہے اوئے۔

ویسے سردی کے موسم کا بھی اپنا ایک مزہ ہے۔ ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق فیشن کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ کوئی پینٹ کوٹ میچنگ پہن رہا ہے، یہ اور بات کہ براؤن سوٹ پر سبز رنگ کی ٹائی لگائی ہوتی ہے اور پاؤں میں جوتے سفید ہوتے ہیں۔ شلوار قمیض والے کوشش کرتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو جیکٹ یا جرسی ملتی جلتی استعمال کر لیں لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ میچنگ تو ہے لیکن ایک طرف کا بازو بغل سے تھوڑا ادھڑا ہوا ہے تو دوسری طرف کی آستین چوہوں نے کاٹ کھائی ہے۔ خیر ہم پر کبھی ایسا بھوت سوار نہیں ہوا کہ میچنگ کرتے پھریں، اسلیے جو سامنے آیا پہن لیا۔

سرد موسم والو ! آپ مالٹے استعمال کرو یا کینو۔ ایک بات ضرور ہے کہ سردی کے

موسم میں جو سورج کی حرارت آپ کو سکون دیتی ہے وہ شاید گیس یا بجلی کے ہیٹر سے نہ مل سکے۔ بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ سردیوں میں کینو مالٹے کھانے سے نزلہ زکام لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن بات یاد رکھنے کی ہے اللہ پاک نے اگر سردیوں میں مالٹے کینو پیدا کیے ہیں تو یقینا فائدہ مندہ ہی ہوں گے کہ اس کی کوئی تخلیق بھی رائیگاں نہیں۔ پھر سردیوں میں گڑ کے ساتھ مونگ پھلی کھانے جو سواد ہے وہ سونے پہ سہاگہ ہے۔ کبھی کبھی بعض گھروں میں کافی بھی پی جاتی ہے، جو سردی کو بھگانے کا کام کرتی ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ سردی سے اگر بچاؤ ممکن ہو تو ضرور احتیاطی تدابیر کرنی چاہییں۔ یہ ہر گز نہ سوچا جائے کہ زمانہ کیا کہے گا، محلے والے کیا کہیں گے۔ محلے والے، زمانے والے تو انسان کو جینے نہیں دیتے اگر ان کا بس چلے۔ آپ کو سردی لگتی ہے تو موٹے کپڑے استعمال کریں، سر کو ضرور ڈھانپیں کیونکہ سردی میں لگنے والی ہوا سے سر میں شدید درد ہو سکتا ہے۔ اگر بائیک وغیرہ چلا رہے ہیں تو آنکھوں کو بھی عینک سے ڈھانپنے کی کوشش کریں کہ سخت ٹھنڈی ہوا آنکھوں کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اور کچھ نہ بھی ہو تو ہوا کی وجہ سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جس کی وجہ سے سامنے دکھنے والی چیز دھندلی دکھائی دیتی ہے اور خدانخواستہ حادثے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اللہ پاک ہر ایک کو حادثوں سے محفوظ رکھے، امین۔

سردی میں مرغ کی یخنی، سوپ سبزیوں کا ہو یا مرغی کا، کافی فائدہ دیتا ہے

اور جسم کو گرم رکھتا ہے۔ اگر گھروں میں گیس کا ہیٹر جلایا جاتا ہے تو کوشش کی جائے ہیٹر کے پاس کوئی نہ کوئی برتن پانی کا بھر کر رکھیں۔ اسکا فائدہ یہ ہوگا کہ فضا میں ہیٹر کی وجہ سے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی ہوئی ہے وہ پانی کی نمی جذب کرتا رہے گا۔ یوں آپ کو آکسیجن کی کمی محسوس نہیں ہو گی۔ اس موسم میں جلد کا رنگ اکثر تبدیل ہو جاتا ہے یا جلد پر سرخ دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں سردی کے موسم میں اپنا زیادہ تر وقت ہیٹر' آتش دان یا انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر گزارتی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں جلد کی حفاظت کیلیے دن میں کوئی موسچرائزر چہرے پر لگائیں۔ اس سےچہرے پر نمی برقرار رہے گی اور حرارت سےچہرے کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ رات کو سوتے وقت کولڈ کریم لگالیں اور دس منٹ بعد روئی سے پونچھ ڈالیں۔ نہ صرف خواتین یہ کام کریں بلکہ مرد بھی یہ ٹوٹکا استعمال کر سکتے ہیں۔

سردیوں سے بچاؤ ضرور کریں، لیکن سردی کے مزے بھی ضرور لیں کہ ہر موسم اللہ نے ہمارے فائدے کے لیے ہی بنایا ہے۔ یہ ہم ہیں کہ کسی موسم سے نفرت کرتے ہیں اور کسی کو بہت پسند۔۔۔۔۔۔

بھیڑیے

کہانی لکھنا یا افسانہ لکھنا بھی ایک فن ہے۔ بے شک کوشش تو بہت لوگ کرتے ہیں لیکن کامیاب در حقیقت وہی لوگ کہلاتے ہیں جن کی تحریر کو عوام سراہتی ہے اور اس تحریر کا ان کی زندگی میں کچھ نہ کچھ اثر رہ جاتا ہے۔ کہانی میں اثر ڈالنا کوئی مشکل نہیں، لیکن وہ اثر دیرپا ہو کمال یہ ہوتا ہے۔ یہ اثر زیادہ تر ناولوں میں سے ہی ہوتا دیکھا گیا ہے۔ بہت کم دیکھا ہے کہ کسی افسانے نے یا مختصر کہانی نے کسی کی زندگی میں انقلاب برپا کیا ہو۔ کیا لکھا جانا چاہیے ؟ کیا وہ سعادت حسن منٹو صاحب کی طرح ہو کہ معاشرے میں جو منفی کام چھپ کر ہو رہے ہیں وہ سب کیسامنے لائے جائیں ۔ جبکہ ہمیں ہمارا دین تو یہ کہتا ہے کہ اگر تم لوگوں کا پردہ رکھوگے تو اللہ پاک قیامت کے دن تمھارا پردہ رکھیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کافی عرصہ بارش نہ ہوئی۔ انکی قوم ان کے پاس آئی اور ان سے عرض کیا کہ وہ اللہ سے بارش کی دعا کریں۔ انھوں نے سب قوم کو اکٹھا کیا اور اللہ کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اللہ نے وحی نازل کی کہ اے موسیٰ اس جھمگٹے میں ایک بہت گناہ گار شخص موجود ہے۔ اسے کہو کہ وہ اس جگہ سے نکل جائے تو بارش ہو جائے گی۔ حضرت موسٰی علیہ السلام نے یہ اعلان کیا کہ ایک شخص بہت گناہ گار ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ یہ جھمگٹا چھوڑ کر چلا جائے تو بارش ہو جائے گی۔

کوئی نہ نکلا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان دہرایا۔ وہ شخص موجود تھا۔ بہت شرمندہ ہوا۔ دل میں اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ اب تک تو نے میرا پردہ رکھا ہے، جتنے بھی گناہ کیے۔ وہ توبہ کرتا ہے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرتا ہے۔ ابھی اس شخص کی دعا مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ بارش شروع ہو گئی۔ سب نے اللہ کا شکر ادا کیا اور چلے گئے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا کہ اے اللہ، وہ شخص تو باہر نکلا ہی نہیں تھا تو بارش کیسے ہو گئی؟ اللہ نے فرمایا کہ اس نے اسی جگہ کھڑے کھڑے اپنے سارے گناہوں سے توبہ کی اور آئندہ نہ کرنے کا عہد کیا۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ اللہ اسکا پتہ بتایا جائے۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ جب وہ گناہ گار تھا تو میں نے اس کا پردہ رکھا ہوا تھا۔ اب جب کہ وہ میرا محبوب بندہ بن گیا ہے تو اسکا راز کیوں افشا کروں۔

تو لوگ منٹو صاحب کو بہترین افسانہ نگار کا درجہ دیتے ہیں۔ بالکل وہ ہوں گے۔ لیکن ان کے واہیات قسم کے افسانے جب پنہاں راز عیاں کریں گے تو وہ قیامت کے دن اللہ کا سامنا کیسے کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ بانو قدسیہ اپنے ایک افسانے میں ایک کردار کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس کے لمبے بال اسکی گردن سے ہوتے ہوئے پتلی کمر سے نیچے نجانے کہاں کی سیر کر رہے تھے۔ اب کوئی کہے بتائے کہ یہ کوئی اچھی بات ہے۔ بے شک لفاظی ہی افسانے کو بناتی ہے۔ لیکن کیا اس جملے کی

جگہ یہ نہیں لکھا جا سکتا تھا کہ اس لڑکی کے بال بہت لمبے تھے۔ آج کل کی صورتحال بھی کچھ مصنفین کی یہ ہو گئی ہے کہ جب تک اپنی تحریر میں فحش گوئی کا، لچر پن کا تڑکا نہ لگائیں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مشہور نہیں ہوں گے۔ یقینا ہوں گے لیکن بدنام نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا والی بات ہو جاتی ہے۔ بڑوں کے لیے تو تحریریں لکھی جاتی ہیں اور بڑے اس کو پڑھتے بھی ہیں اور واہیات، فحش لٹریچر کا نام دیتے ہیں لیکن پڑھتے ضرور ہیں۔ دراصل بڑے پھر بھی اس حد تک بالغ النظر ہو جاتے ہیں کہ اچھی بری بات کو سمجھتے ہیں۔ لیکن بچوں کا کیا قصور ہوتا ہے جب ان کے لیے اس طرح کی تحریریں لکھیں جائیں۔ ان کے کچے اذہان کو فحش گوئی کی طرف لگایا جائے۔ لچر پن ان کے سامنے لایا جائے۔ لفظوں کا ہیر پھیر اس طرح کیا جائے کہ بچوں کی آنکھوں کے سامنے گویا پوری تصویر بن جائے۔ پڑھیے اور بتائیے کہ کیا یہ چیز بچوں کے لیے جائز ہے؟ اور اس سے کیا سبق دیا گیا ہے؟

شانو بری طرح رو رہی تھی اور مچل رہی تھی مگر ڈمبالو کی گرفت بے حد مضبوط "
" تھی۔ اسکے علاوہ شانو کے جسم پر ایک کپڑا بھی نہ تھا۔

نرم و نازک لڑکی کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اور اسکے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ خوف کی شدت میں وہ اپنا ننگا پن بھی

"بھول گئی اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔

یہ اقتباس جس کتاب سے لیا گیا ہے اسکے سرورق کے بعد دوسرے ٹائیٹل صفحے پر درج ہے: "بچوں کے لیے دلچسپ اور خوبصورت ناول۔" کیا ان اقتباسات سے بچوں کے کچے اذہان میں یہ بات نہیں بیٹھے گی کہ ننگا پن کیا ہوتا ہے اور دوسرے کیسے لگتے ہیں جب وہ ننگے ہوتے ہیں۔ خود کے بارے میں تو نہیں سوچیں گے لیکن دوسروں کے بارے میں خیال ضرور ان کے ذہن میں آئے گا۔ قارئین کرام! یہ سلیقہ، یہ طریقہ ہمارا نہیں ہے۔ نہ ہی ہمارے اسلاف کا تھا۔ مرحوم اشتیاق احمد کے سارے ناولز اٹھا کر دیکھ لیں جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھے تھے، کسی ناول میں بھی شاید ہی ذکر ہو کہ بچوں نے کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہو۔ چہ جائیکہ کہ اس طرح کھلے عام ننگے پن کا ذکر ہو۔ یہ فحش گوئی اور عامیانہ پن دراصل ہمارے دشمنوں کا ایجنڈا ہے۔ انھوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہمارے بچوں کی تربیت میں اپنا حصہ ڈالنے کا سوچا ہے کہ وہ جب بڑے ہوں تو ان کا ذہن اس قابل ہی نہ رہے کہ وہ اسلام کی، پاکستان کی بہتری کے لیے کچھ سوچ سکیں۔ کوئی تعمیری کام کر سکے۔

جو پاکستان کے دشمن ہیں، چاہے وہ اندرونی غدار ہوں یا بیرونی سازش کرنے والے۔ انھوں نے اس طرح کی اور بھی بہت سی سازشیں کر رکھی ہیں۔ ہم کارٹون

دیکھ لیں، ہم مختلف ڈرامے دیکھ لیں۔ کارٹون حالانکہ بچوں کے لیے ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی باربی ڈول کا ڈریس اس طرح کا ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی شریف گھرانے کا فرد اپنے بچوں کو اس طرح لباس پہنانا گوارا کرے۔ ٹام اینڈ جیری کارٹون اگرچہ بہت دلچسپ ہوتے ہیں لیکن جب ان میں کوئی اور ٹام جیسی سفید بلی آتی ہے تو ٹام بلا اسکا دیوانہ بن جاتا ہے۔ اس سفید بلی کی ڈریسنگ اسطرح کی ہوتی ہے کہ مجھے ذاتی طور پر دیکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بچوں کے ذہن پر کیا اثر ہوتا ہو گا۔ میں نے ایک چھوٹا سے ویڈیو کلپ دیکھا جس میں ایک سات آٹھ سال کی بچی نے نیکر پہنی ہوئی ہے اور پھر بلاؤز انتہائی معذرت کے ساتھ کہ یہ لفظ لکھنا مجبوری ہے) پہن کر اس کو درست کر رہی ہے) کبھی اوپر کبھی نیچے۔ کوئی بتائے کہ یہ اس نے کہاں سے سیکھا ہو گا؟ ظاہر ہے یا تو کارٹونز سے یا پھر کسی بچوں کی کہانیوں کی کتاب سے یا پھر کسی ایسے ہی فحش ڈرامے سے۔
کیا کوئی ماں، کوئی باپ اپنے بچوں کو اس طرح کی کہانی پڑھنے کو دے گا جس میں لڑکی کو ننگا دکھایا جاتا ہے، یا کوئی لڑکا کسی لڑکی کو ناچتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ہر گز نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے، بچے اس طرح کی کہانیاں پڑھ بھی رہے ہیں اور ان کو پڑھانے میں قصور اگر مصنف کا ہے تو والدین کا بھی ہے۔ جنھوں نے بنا اس کہانی کو پڑھے اپنے بچوں کے ہاتھ میں دے دیا کہ

بچوں کی کہانی ہے، پڑھ لیں۔ گویا یہ زہر ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کے ذہن میں اتار رہے ہیں۔ اور ہم ہی اس سے بے خبر ہیں۔ اس طرح کی لچر اور بیہودہ کہانیاں لکھنے والے مصنفین انسان ہر گز نہیں، بھیڑیے ہیں، خونخوار بھیڑیے۔ جو غیر محسوس انداز میں دشمن کے ایجنڈے پر عمل کر رہے ہیں۔ وہاں سے بھی ان کو پیسہ ملتا ہے اور کتاب بیچ کر بھی وہ کماتے ہیں۔ یہاں پیسہ تو کما لیں گے لیکن شاید ہی کوئی ان کا ساتھ دے گا۔ یہی مصنف ہر گز نہیں چاہے گا کہ اس کی اولاد اس قسم کی کہانیاں پڑھے۔ یہ زہر صرف باہر کے لوگوں کے لیے ہے۔ وہ تحریر بڑوں کے لیے ہو یا بچوں کے لیے، اسکے اپنے گھر میں اس تحریر کا ایک پیراگراف بھی نہیں آئے گا۔ معذور اذہان کے احساسِ کمتری کے شکار مصنفین ہی اس طرح کا کام کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی شک ہوتا ہے کہ وہ شاید کھاتے پیتے بھی حرام ہی ہوں گے یعنی وہ اشیاء جو ہمارے دین میں حرام ہیں۔ تب ہی تو اس قسم کے خیالات ان کے ذہن کی سیر کرتے ہوں گے۔ ورنہ صاف دل و دماغ کے مالک حضرات ہر گز یہ باتیں کر سکتے، لکھنا تو درکنار۔

منافقین کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ جب اس کو امانت دی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ اب اللہ نے ان لکھنے والوں کو اگر قلم کی طاقت عطا کر دی ہے تو گویا ان کو ایک امانت سپرد کر دی کہ اس قلم کی طاقت سے وہ دنیا میں مثبت پیغام پہنچائیں۔ لیکن جب وہ اس قلم سے منفی تحریریں لکھیں گے، فحش، لچر

ہیں، عامیانہ باتیں لکھیں گے تو وہ منافق ہی کہلائیں گے کہ انھوں نے اللہ کی عطا کی ہوئی امانت میں خیانت کی ہے۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہوں میں فحاشی پھیلے، وہ دنیا و آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ " (سورۃ النور، آیت۔19)

کرکٹ کا جنون اور بھارت

پاکستانی قوم ۱۹۹۲ء میں کرکٹ کے ورلڈ کپ جیتنے کے بعد سے کرکٹ کی ایسی دیوانی ہوئی ہے کہ ہزار بار پاکستانی ٹیم نے (تھوڑی سی مبالغہ آرائی جائز ہے) کمزور ترین ٹیم کے ہاتھوں بھی مار کھائی ہے۔ مار بولے تو مات کھائی ہے۔ چاہے وہ بنگلہ دیش کی ٹیم ہو یا آئرلینڈ کی یا وہ زمبابوے ہو۔ لیکن پاکستانی قوم ایسی ہے کہ جب بھی کرکٹ کا موسم آتا ہے، یہ اپنے سارے کاموں میں کرکٹ کا تڑکا ضرور لگاتی ہے۔ اگر شام کو میچ ہے تو سارا دن آپس میں یہی گفتگو ہو رہی ہو گی کہ آج پاکستان فلاں کھلاڑی کو کھلائے، فلاں کو نکال دے، فلاں کو چانس دے دے۔ اگر مخالف ٹیم کے فلاں کھلاڑی کو جلد آؤٹ کر دیا تو مزا آ جائے گا۔ اور پھر اگلے دن سارا وقت یہی گفتگو۔ عرفان خان نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ اگر فلاں کھلاڑی کو یار کر پھینکتا تو وہ کبھی نہ کھیل سکتا۔ اگر حفیظ باہر جاتی ہوئی گیند کو نہ کھیلتا تو اسکا کیا جاتا۔ اس طرح کی ہزار باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں تو کھانا کم اور کرکٹ زیادہ نگلتے ہیں۔ یہاں تک کہ رات کو سوتے میں بھی انہیں کرکٹ ہی نظر آتی ہے۔ اگر کوئی شادی شدہ ہے، بیوی نے کسی چیز کا پوچھ لیا تو جواب ملتا ہے سلی مڈ آف پر پڑا ہے۔ یا لیگ.بریک چیک کر لو۔ اسکے بعد بندے کی آنکھ ہسپتال میں کھلتی ہے اور لیگ.بریک ہو چکی ہوتی

ہے۔

گزشتہ دو ماہ سے ہمارے کانوں میں مسلسل دھماکے ہو رہے ہیں کہ پاکستان کو بھارت نے کرکٹ کھیلنے کی دعوت دے دی، لیکن یہ دعوت کسی تیسرے ملک میں ہو گی۔ پھر چند ہی گھنٹوں بعد آر۔ایس۔ایس کا بیان آتا ہے کہ اگر پاکستان کی ٹیم بھارت کے ساتھ کھیلی تو گراؤنڈ سے اپنے پاؤں پر چل کر واپس نہیں جائے گی۔ ہمارے کرکٹ کے چیئرمین انڈیا جاتے ہیں اور وہاں پر ان کی جو عزت ہوئی وہ تمام دنیا نے دیکھی۔ کیا ہماری عوام اتنی ہی گئی گزری ہے کہ پھر بھارت سے کرکٹ کی پینگیں بڑھنے پر خوش ہو گی۔ ہاں یقینا ہو گی، وہ عوام جو چاہتی ہے کہ انڈیا کی فلمیں غور سے دیکھے۔ ان کا بس چلے تو وہ انڈیا میں اپنا کاروبار کریں۔ وہ انڈیا میں دوستیاں بڑھائیں۔ بھلے وہ پاکستان کے ایک ایک فرد کو بندوق کی سنگینوں پر چڑھا دیں۔ بھلے وہ خورشید قصوری کی کتاب کی تقریب رونمائی میں پبلشر کا منہ کالا کر دیں، جس سے ہمارے دیس کی توہین ہو۔ لیکن ہم نے انڈیا کے ساتھ کرکٹ ضرور کھیلنی ہے۔

انڈیا کا رویہ پاکستان سے کیا ہے، یہ ساری دنیا جانتی ہے۔ کہیں کوئی حادثہ ہوا نہیں اور الزام پاکستان پر ڈالا نہیں۔ نہ صرف الزام بلکہ دو تین گھنٹوں میں سارے ثبوت بھی پیش ہو جاتے ہیں کہ یہ دہشت گردی کرنے والا فرد پاکستان

کے فلاں علاقے سے ہے۔ اس کا تعلق پاکستان کی فلاں جماعت سے ہے۔ فلاں کا بچہ ہے، فلاں کا باپ، فلاں کا شوہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ سب نے پڑھا کہ انڈیا کی دشمنی پاکستان سے اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ ایک کبوتر کیا سرحد پار گیا، اس کو بھی پاکستان کا جاسوس قرار دے دیا گیا۔ اس کی سکیننگ ہوئی۔ اسکی تفتیش ہوئی۔ یہاں تک اس کبوتر کو جیل یاترا بھی کرائی گئی۔ خود ہی اپنے سمندر میں اپنے ہی ماہی گیروں کی کشتی کو اڑا دیتے ہیں اور الزام پاکستان پر لگاتے ہیں کہ اس کشتی کے ذریعے پاکستان دہشت گرد بھیج رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انڈیا کے اندر کا ہی ایک آفیسر یہ راز فاش کر دیتا ہے کہ اپنی ہی دیس کے معصوم ماہی گیروں کو مارنا ضروری تھا۔ کوئی اور منصوبہ بنا لیتے۔

اب بھی انڈیا نے ایک اور سازش پاکستان کے خلاف کی ہے۔ وہ ایسی سازش ہے جس میں سانپ بھی مر رہا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹ رہی۔ وہ یہ ہے کہ انڈیا پاکستان کی سرحدوں کے قریب زیرزمین پانی کا بے دریغ استعمال کر رہا ہے اور چوں کہ یہ پانی سرحدوں (تھرپارکر اور چولستان) کے قریب سے نکالا جا رہا ہے۔ اس لیے بہت زیادہ امکان ہے کہ سرحد کی دوسری جانب یعنی پاکستانی علاقے میں موجود زیرزمین پانی بھی کھینچ لیا جائے۔ بھارت نے وسیع پیانے پر زیرزمین کا سروے مکمل کر لیا ہے اور اس کے لیے وہ جرمن جیو ہیلی بورن (ہیلی کاپٹر) ٹیکنالوجی استعمال کر رہا ہے، جو بہت زیادہ گہرائی تقریباً 1000 نیچے

زیرزمین موجود پانی کا بھی سراغ لگا دیتی ہے۔پہلے تو انڈیا سے پاکستان کی طرف آنے والے مختلف دریاؤں پر انڈیا نے ڈیموں کی لائن لگا دی ہے اور یوں پاکستان کا پانی بند کر دیا ہے۔ اور اب یہ ایک اور نئی سازش پاکستان کو خشک کرنے والی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر پاکستان نے جلد اس کا ازالہ نہ کیا تو اللہ نہ کرے، میرے منہ میں خاک، پاکستان کی بہت سی زمین بنجر ہو جائے گی۔

لیکن ہمیں شوق ہے کہ ہم انڈیا سے لازمی کرکٹ میچ کھیلیں۔ ان کی ایک ہی رٹ ہے کہ میں نہ مانوں، میں نہ مانوں۔ اور ہم انہیں مختلف مقامات کے بارے میں تجاویز دے رہے ہیں کہ متحدہ عرب امارات میں کھیل لیں، سری لنکا میں کھیل لیں، بنگلہ دیش میں کھیل لیں۔ لیکن کھیلیں ضرور۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اگر پاکستان انڈیا کے ساتھ کرکٹ میچ نہ کھیلا تو شاید اربوں روپے کا پاکستان کو نقصان ہو جائے۔شاید امریکہ پاکستان سے ناراض ہو جائے۔ شاید چین پاکستان کے اندر گوادر کی بندرگاہ کا انتظام لینے سے انکار کر دے۔مجھے تو یہی لگتا ہے۔ اب جو خبر آئی ہے کہ بہاولپور میں قائدِاعظم سولر پارک کا منصوبہ بری طرح ناکام ہو گیا ہے۔ اور عنقریب پنجاب حکومت اسکو فروخت کرنے والی ہے۔ کیونکہ انکا دعوی تھا کہ وہاں سے ایک سو میگا واٹ بجلی روزانہ کی بنیاد پر پیدا کی جاسکے گی۔ نیپرا نے بھی مختلف چیزیں مدِ نظر رکھتے ہوئے فی یونٹ ریٹ پندرہ سے اٹھارہ روپے مقرر کیا تھا۔ لیکن نہ تو بجلی سو میگا

واٹ پیدا ہوئی بلکہ اٹھارہ سے بیس میگا واٹ کی پیداوار تھی۔ اور ریٹ بھی فی یونٹ چوبیس سے چھبیس روپے ہوگیا۔ مجھے شک پڑ رہا ہے کہ یہ حادثہ بھی انڈیا کے ساتھ میچ نہ کھیلنے کا شاخسانہ تھا۔ جس کی وجہ سے پاکستان کو اتنا نقصان اٹھانا پڑا۔ پتہ نہیں پاکستان نے اٹھایا یا کسی انفرادی شخصیت نے۔

انڈیا کرکٹ کے میدانوں میں ویسے بھی اتنا بدنام ہو چکا ہے کہ اب شاید اگر بڑے ملکوں میں غیرت ہو تو وہاں کبھی میچ نہ کھیلیں۔ اکتوبر کی ہی تو بات ہے جب انڈیا کے تماشائیوں نے کٹک میں افریقہ کی ٹیم کے خلاف ہلڑ بازی کی ۔ ان پر بوتلیں پھینکیں اور ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ وجہ کیا تھی، صرف یہی کہ ان کے گھر کے کاغذی شیر اجنوبی افریقہ کی ٹیم کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہے تھے۔ جب کہ انڈیا اور جنوبی افریقہ کے درمیان اس سیریز کا نام بھی امن سے متعلق ہی تھا یعنی "گاندھی مینڈیلا سیریز"۔ اسکے باوجود جو دنیا نے دیکھا کہ کتنا امن تھا اس میچ میں۔ بے شک وہاں کے چیدہ چیدہ کرکٹرز بشمول سنیل گواسکر نے کہا کہ کٹک شہر کی کم سے کم سزا یہی ہو سکتی ہے کہ یہاں کچھ عرصہ بین الاقوامی میچز نہ کروائے جائیں، یہاں تک کہ ۲۰۲۰ میں ہونے والے ورلڈ کپ کا بھی کوئی میچ یہاں نہ منعقد کروایا جائے۔ تب ہی شاید یہاں کے لوگوں کو حیا آئے۔ لیکن قارئین۔ یہ بات صرف کٹک شہر کی ہی نہیں ہے۔ نہ بات کرکٹ کی ہی ہے۔ انڈیا اپنے ہی وطن کے دیش واسیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ عامر خان

جو کہ کل تک ان کا ہیرو تھا، اس نے صرف ایک بات ہی تو کی تھی کہ بھارت انتہا پسندی اور عدم برداشت سے گریز کرے۔ اس نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ لیکن اس کے خلاف غداری کے مقدمات دائر ہو گئے۔ اس کو اپنا ہی وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ البتہ شاہ رخ خان ڈر گیا۔ اس نے بھی یہی بیان دیا تھا، لیکن اب واپس لے لیا۔ جبکہ ہمارا یہ حال ہے کہ اب تو انڈیا کے ساتھ میچوں کا شیڈول بھی فائنل کر دیا ہے۔

جب انڈیا کا اپنے دیس والوں کے ساتھ یہ "حسنِ سلوک" ہے تو پاکستان کی عوام کو تو اس نے کبھی بھی درِ خور اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ تو ہمیشہ سے اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگاتا ہے، اور ہمارے وطن کے غدار لوگ اس کے اس اکھنڈ بھارت کے خواب کو تعبیر دینے کے لیے ان کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔ کیونکہ انھوں نے پاکستان میں تو کچھ رکھنا نہیں، نہ جائیداد نہ پیسہ۔ نہ شہرت نہ دولت۔ لیکن یہ وہی لوگ ہیں جو پاکستان میں انڈیا کی فلمیں چلنے پر زور دیتے ہیں، انڈیا کے چینل چلنے پر میڈیا کا ساتھ دیتے ہیں۔ چاہے ان میں کسی قسم کی تعلیم بھی دی جا رہی ہو، انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

خدارا! اے پاکستان کے لوگو، ہوش میں آؤ۔ انڈیا نہ پہلے کبھی پاکستان کا دوست رہا ہے اور نہ کبھی آئندہ ہو گا۔ کیونکہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ کافر

کبھی بھی کسی صورت میں بھی ایک مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اسلیے آپ مسلمان
ممالک کا ساتھ دیں، آپس میں اتحاد و اتفاق سے رہیں۔ اسی میں ہماری بقا ہے۔ باقی
سب کچھ فنا ہے۔**********

یہ بھیک مانگتے لوگ۔۔

اللہ کے نام پر دے دے بابا۔ مولا کے نام پر دے دے بابا۔ تیرے بچے جیون۔ تیری حیاتی سوہنی ہووے، تیریاں مراداں پوریاں ہوون۔
پاکستان کے کسی بھی شہر میں ، کسی بھی بازار میں اس قسم کی آوازیں بکثرت سنائی دیتی ہیں۔فرق اگر ہوتا ہے تو شاید زبان کا کوئی اردو میں تو کوئی پشتو میں۔ کوئی پنجابی میں تو کوئی سندھی میں دعاؤں کی پوٹلی کھولے ایک کے بعد ایک دعا نکال رہا ہوتا ہے۔ان دعاؤں کا مقصد ماسوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوتا کہ بن مانگے اسکو کچھ روپے مل جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ زبان سے تو کچھ نہیں مانگا جاتا لیکن یا تو ہاتھ پھیلے ہوئے ہوتے ہیں یا کوئی کٹورا آگے کیا ہوتا ہے اور یا اگر زمین پر بیٹھے ہیں تو کوئی چادر پھیلائی ہوئی ہوتی ہے۔حالتیں مختلف ہوتی ہیں، انداز جدا جدا ہوتے ہیں لیکن سب کے خیالات ، انداز ایک ہی مرکز سے نکلتے ہیں۔ تان سب کی ایک سُر پر مبنی ہوتی ہے اور پسند سب کو صرف ایک ہی آواز ہوتی ہے اور وہ پیسے کی جھنکار کی آواز ہوتی ہے۔
ہر کسی کا زندگی میں کبھی نہ کبھی اس سے سامنا ہوتا رہتا ہے، اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔اور ہر کوئی ان سے اپنے اپنے انداز میں پیش آتا ہے۔

دھتکارتے ہیں، نظر انداز بھی کرتے ہیں، ترس بھری نگاہوں سے بھی دیکھتے ہیں، انکی خواہش کو پورا کرتے ہوئے پیسوں کی جھنکار بھی سنا دیتے ہیں اور بعض جھنکار سنانے کے ساتھ تھوڑی سی بحث بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن بحث بھی انکی جسمانی حالت دیکھ کر کی جاتی ہے۔ دھتکارنے والے اور بحث کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی کرے بھی تو کیا۔ ہماری نگاہ میں تو یہ لوگ شاید ہی پورے دن میں دو تین سو روپے سے زیادہ اکٹھا کرپاتے ہوں۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ شاید دس سے بیس فیصد لوگ ایسے ہوں جو اتنی کم مقدار پیسے کماتے ہوں ورنہ تو باقی سب کی آمدنی پانچ سو روپے سے دو تین ہزار روپے تک یا زیادہ ہوتی ہے۔اور وہ واقعی آمدن ہوتی ہے۔ کیونکہ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ روٹی اور کپڑا بھی یہ مانگتے ہیں۔ کھانے کے وقت میں کسی بھی ہوٹل کے سامنے اپنا ٹھیہ لگا لیتے ہیں۔ کپڑوں میں موسم کے مناسبت سے مانگتے ہیں۔ ساتھ میں کمبل یا لحاف سردیوں میں ضرور طلب کرتے ہیں۔ تو جو کچھ انھوں نے کمایا ہوتا ہے وہ آمدنی میں ہی شمار ہو سکتا ہے۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کچھ بھکاری ایک جگہ مستقل ٹھکانہ بنا لیتے ہیں۔ ایسے بھکاریوں میں زیادہ تر معذور نظر آتے ہیں یا پھر کوئی چرسی یا ہیروئن پینے والا بیٹھا ہوتا ہے۔ اب وہ معذور کس حد تک معذور ہوتے ہیں یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن ان میں سے شاید کوئی تین سے پانچ فیصد واقعی معذور ہوتے

ہیں لیکن پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خود معذور ہوتے ہیں یا انکو بھیک مانگنے کی خاطر معذور بنایا جاتا ہے۔ کسی کی ٹانگ کٹی ہوئی ہوتی ہے اور وہ اپنی اسکی کٹی ہوئی ٹانگ کو سامنے رکھ کر لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے رحم پیدا کرتا ہے اور ان سے بھیک لیتا ہے۔بدلے میں دعائیں دیتا ہے۔ تو کوئی اپنے کٹے ہوئے یا ٹیڑے میڑھے بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھامتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتا جاتا ہے، بغیر صدا لگائے یتیم صورت بنائے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ کوئی صدا لگاتا ہے " آنکھوں والو! آنکھیں بڑی نعمت ہیں"۔ تو جھٹ سے لوگ جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے اپنے ظرف کے مطابق اسکے ہاتھ میں ریزگاری یا نوٹ رکھ دیتے ہیں مبادا انکی آنکھوں کو نظر لگ جائے۔

میری ذاتی طور پر کئی بھکاریوں سے کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی ہے۔اپنے بچپن میں جب میں شاید پانچویں یا چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، ایک بھکاری کو تو باقاعدہ کھانا تک کھلاتا رہا۔ اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر اسکے منہ میں ڈالتا رہا۔ اسکے منہ سے ٹپکتی رال کو صاف کرتا رہا تھا۔ اور دنوں یا ہفتوں نہیں بلکہ دو تین سال تک اسکے ساتھ اسی طرح پیش آتا رہا۔ اسکا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے بہت سی باتوں کا پتہ چلا تھا۔اسکا نام رحمت تھا۔ اسکو شاید کبھی فالج ہوا ہوگا (بعد میں پتہ چلا تھا کہ حقیقت کچھ اور تھی) جسکی وجہ سے اسکے ہاتھ اور پاؤں بیکار ہو گئے تھے۔ ہاتھوں کو تو پھر کسی حد تک حرکت دے

لیتا تھا۔ لیکن ٹانگوں کو گھسیٹنا پڑتا تھا۔ کسی اللہ کے نیک بندے نے اسکو ایک تین پہیوں والی بڑی سائیکل، جس طرح کی آج کل چنگ چی رکشہ ہوتا ہے، خرید کر دے دی تھی جسکو ایک ہاتھ سے تھامے دوسرے ہاتھ سے چلاتا تھا۔ صرف اسکو اوپر بٹھانے کے لیے دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ کبھی کبھی اسکے ہاتھوں کی طاقت جواب دے جاتی تھی تو کوئی راہ گیر سائیکل کو کچھ فاصلے تک دھکا لگا دیتا تھا۔ اسی طرح کبھی خود چلاتے ہوئے تو کبھی دوسرے لوگوں کی مدد سے وہ اپنے گھر اور گھر سے اس مخصوص جگہ تک آتا جاتا تھا۔ ایک بات جو کم از کم مجھے عجیب لگتی تھی کہ جب وہ گھر کے قریب پہنچتا تھا تو ہمیشہ کسی نہ کسی طرف سے ایک لمبا تڑنگا آدمی اسکو فوراً گھر کے اندر لے جاتا تھا۔ تین چار دفعہ تو میں نے اس کو خود دیکھا تھا کیونکہ محلے کی کرکٹ ٹیم کبھی ایک محلے میں میچ کھیلنے جاتی تھی تو کبھی دوسرے میں۔ اور میں بھی اس ٹیم کا ایک ممبر ہوتا تھا۔ تو کئی دفعہ رحمت کے محلے میں بھی ہم میچ کھیلنے گئے تھے۔

یوں تین سال گزر گئے۔ ایک دن دوپہر کا کھانا کھلاتے ہوئے میں نے اس سے اس شخص کے بارے میں پوچھا تو پہلے تو بات کو ٹال گیا۔ لیکن میرے اصرار پر بہت احتیاط سے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے جو بات بتائی اس وقت تو مجھے اس پر یقین نہ آیا۔ گھر آ کر جب میں نے وہ بات اپنے والد محترم کو بتائی تو انھوں نے رحمت کی طرف میرا جانا بند کر دیا۔ بہت پوچھا تو بھی کچھ

نہ بتایا۔ تو تین ہفتوں کے بعد جب والد صاحب نے تھوڑی نرمی برتی تو میں پھر رحمت کی طرف چل دیا۔ لیکن اس بار تو اسکا حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ چہرے پر زخموں کے مندمل ہوتے نشانات تھے۔ سر پر دائیں جانب کان سے تھوڑا اوپر ایک عدد گومڑا ابھرا ہوا تھا۔ بازوؤں اور پنڈلیوں پر بھی زخموں کے نشانات تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے صرف اتنا کہا کہ یہ اس دن مجھ سے بات کرنے کی سزا تھی۔ اور دوبارہ اسکو اس جگہ پر آئے ہوئے صرف چار دن ہوئے ہیں۔ کیونکہ اسے زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا گیا تھا جب کہ وہ اصلیت بتا بیٹھا تھا۔

اس نے جو بات بتائی تھی وہ یہ تھی کہ اسکو فالج نہیں ہوا تھا بلکہ اسکے چند سگے رشتہ داروں نے اسکو نا معلوم وجہ سے زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ ڈاکٹروں کی محنت اور بروقت علاج سے گو اسکی زندگی تو بچ گئی تھی لیکن اسکا اثر اسکے پٹھوں پر مختلف صورتوں میں ہوا تھا۔ اور اسکی حالت یوں ہو گئی تھی جیسے فالج کے شدید حملے سے گذرا ہو۔ اسکو بات کرتے ہوئے بھی مشکل پیش آتی تھی کیونکہ اسکا منہ تھوڑا ٹیڑھا ہو گیا تھا اور اسکے منہ سے رال بھی ٹپکتی تھی۔ اسنے بتایا تھا کہ اسکا علاج علاقے کے ایک بظاہر شریف نظر آنے والے شخص نے کرایا تھا۔ اسکے علاج پر اس وقت کے لحاظ سے کافی خرچ آیا تھا۔ چونکہ علاج کے بعد اسکی ظاہری حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اب وہ کوئی کام کاج نہ کر سکتا تھا تو اس شخص نے کوئی دو تین مہینے تک اسکا بوجھ برداشت کیا۔ اسکو اپنے دو کمرے

والے مکان میں جگہ دی۔ لیکن ایک دن کہنے لگا کہ اسکے پاس کوئی حرام کے پیسے نہیں ہیں جو وہ اس پر لٹاتا رہے۔ رحمت نے اس شخص سے کہا کہ اسکی حالت سے تو وہ واقف ہی ہے کہ وہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا اور نہ ہی اسکا آگے پیچھے کوئی ہے۔ تو اس شخص نے جس کا نام پرویز تھا، اصلیت دکھا دی۔ کہنے لگا کہ پھر اسکا تو ایک ہی حل ہے کہ وہ بھیک مانگے کہ اسکی ظاہری حالت دیکھ کر ہی لوگ اس پر ترس کھائیں گے اور اسکو بہت بھیک ملے گی۔ خود بھی کمائے، کھائے اور اسکو بھی کھلائے۔ رحمت کے بقول اس نے بہت سوچا لیکن کوئی اور راستہ نظر نہ آیا۔ مجبوراً اسکو یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔ آج اس دشت کی سیاہی میں اسکو دس سال ہو گئے تھے۔

اس شخص کے متعلق جو سائیکل کو آخری لمحے میں گھر کے اندر لے جاتا تھا رحمت نے بتایا کہ اسکا نام سلیم تھا اور وہ پرویز کا تنخواہ دار تھا۔ جسکی ذمہ داری تھی کہ وہ رحمت پر اور اور جیسے مزید پانچ افراد پر نظر رکھے کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ میں یہ سن کر بہت حیران ہوا تھا۔ میں نے رحمت سے پوچھا کہ پانچ افراد کون ہیں اور کہاں ہیں؟ رحمت نے کہا کہ پرویز نے نے جانے کہاں کہاں سے ایسے افراد ڈھونڈ کر لائے ہیں جو ایک تو معذور ہوں اور دوسرا انکا کوئی والی وارث نہ ہو۔ پرویز ان سب سے بھیک منگواتا تھا۔ سلیم جیسے اس نے تین چار اور بندے ملازم رکھے ہوئے تھے جنکا کام رحمت اور دوسرے بھکاریوں پر نظر

رکھنا ہوتا تھا۔ میرے پوچھنے پر کہ سلیم تو کبھی بھی اسکے قریب نظر نہیں آیا تو رحمت نے جواب دیا کہ وہ قریب ضرور ہوتا تھا لیکن ہمیشہ کسی نہ کسی آڑ میں بیٹھا ہوتا تھا کہ کسی کو علم نہ ہوسکے کہ اسکا رحمت سے کوئی تعلق واسطہ ہے۔ ایک دن رحمت نے بڑے کرب سے بتایا کہ اس پرویز جیسے نجانے کتنے لوگ اس ملک میں اپنے گھناؤنے پنجے پھیلائے ہوئے ہیں۔ جو ننھے معصوم بچوں سے لیکر ساٹھ ستر سال کے بوڑھوں تک سے مختلف طریقوں سے بھیک منگواتے ہیں۔ اور خود ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ رحمت نے پرویز کے متعلق بتایا کہ پرویز کبھی جو دو کمروں کے مکان میں رہتا تھا آج اسکا ایک کنال پر مشتمل شہر کے پوش علاقے میں ایک تین منزلہ بنگلہ ہے۔ دس دس مرلہ کے دو گھر اور کوئی سات آٹھ دکانیں کرائے پر اٹھائی ہوئی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس نے ہمارے بھیک میں مانگے ہوئے پیسوں سے بنایا ہے۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں رحمت نے بتائی تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا۔ کسی کو کچھ سمجھانے کے قابل ہوا تو جب کسی بھکاری کو دیکھا تو رحمت ایک دفعہ ضرور یاد آیا۔ یاد اسلیے کہ انٹر کرنے کے بعد ہم نے وہ شہر چھوڑ دیا تھا اور اپنے آبائی شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ میں نے اکثر اوقات لوگوں سے بھکاریوں کے متعلق باتیں کیں۔ انھیں اپنے تجربے سے آگاہ کیا۔ لیکن کبھی کسی نے میری ایک نہ سنی۔ بلکہ جواب میں صرف یہ ہی کہا کہ بھائی یہ لوگ

بھی خدا کی طرف سے ایک امتحان ہیں۔ میں بھکاریوں تک سے باتیں کرتا رہا بلکہ اب بھی کبھی کبھی موقع ملے تو ضرور کرتا ہوں۔ اکثر یہ محسوس ہوتا تھا کہ کچھ بھکاری بات کرتے کرتے ادھر ادھر ضرور دیکھتے تھے۔ بلکہ چند ایک تو بات کرتے کرتے اچانک بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ تو تب رحمت کی بات یاد آتی تھی کہ وہ خود اپنی خوشی سے یا مرضی سے بھیک نہیں مانگتے تھے بلکہ ان سے بھیک منگوائی جاتی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اگر عام عوام اس بات سے واقف نہیں تو پھر تو ٹھیک ہے لیکن ان کو اس بات کا علم ہے تو پھر وہ انھیں بھیک کیوں دیتے ہیں۔ وہ اس سماجی بیماری کا کوئی مستقل حل کیوں نہیں نکالتے۔ وہ کیوں ووٹ مانگنے والوں کو نہیں کہتے کہ پہلے شہر کے رؤسا کو غریب کرو جو بھیک کے پیسوں سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں پھر ووٹ

مانگو۔ لیکن نہیں۔ کیونکہ جب کتی (بچ) ہی چوروں سے ملی ہوئی ہو تو اللہ ہی مالک ہے۔ حکمران پرویز جیسے لوگوں کو کیفر کردار تک کیوں نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ان کی دال روٹی بھی چلتی ہے۔ ان زبردستی کے بھکاریوں کے لیے کوئی دارلکفالہ قسم کا ادارہ کیوں نہیں بنایا جاتا جہاں بڑوں کو مختلف ہنر سکھائے جا سکتے ہیں، انکے ہنر کو استعمال کرکے انکے بنائی ہوئی اشیاء کو بازار میں فروخت کیا جا سکتا ہے اور آمدنی کا ایک حصہ انکے لیے مختص کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا

جاسکتا ہے۔ کتنی ہی بڑی عمر کے بھکاری ایسے ہوتے ہیں جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کو پڑھا سکتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو مختلف قسم کے فنون سکھائے جا سکتے ہیں۔ تاکہ کل جب وہ میدان عمل میں نکلیں تو اگر وہ سرکاری ملازمت نہ حاصل کر سکیں تو کم از کم محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال سکیں۔ مخیّر حضرات بھی یہ کار خیر انجام دے سکتے ہیں۔ زیادہ نہیں اگر ہر امیر آدمی صرف ایک ایک بھکاری چاہے وہ بچہ ہو یا بڑا کے سر پر ہاتھ رکھ دے تو معاشرہ اس لعنت سے انتہائی قلیل عرصے میں پاک ہو سکتا ہے۔ دنیا میں بھی انہیں کامیابی ہی نصیب ہو گی اور آخرت میں تو ہے ہی۔

سرکاری تعلیمی اداروں کی نج کاری

ایک خبر نظر سے گزری کہ حکومت نے سرکاری تعلیمی اداروں کی نجکاری کا فیصلہ کیا ہے۔اس سلسلے میں سفارشات کی تیاری آخری مراحل میں ہے۔ جنھیں جلد ہی منظوری کے لیے وزیراعظم صاحب کو بھیجا جائے گا۔ ان تجاویز کے ساتھ ہی وزارتِ منصوبہ بندی بچوں کو خوف میں مبتلا رکھنے کے خلاف بھی سفارشات تیار کر رہی ہے۔جس کے تحت بچوں کی بہتر نشو نما اور ملک کا اچھا شہری بنانے کے لیے کئی تجاویز پر غور کیا جارہا ہے۔ بچوں کا سالانہ میڈیکل چیک کیا جائے گا۔ انہیں روزانہ ایک پاؤ دودھ فراہم کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ ساتھ میں والدین کو بتایا جائے گا کہ بچوں کو متوازن خوراک کیسے دی جائے۔ گھروں میں بھی بچوں کو مار کٹائی سے بچانے کے کلچر کو فروغ دیا جائے گا۔ جیسے سکولوں میں "مار نہیں پیار" کی پالیسی اپنائی گئی ہے، اسی طرح گھروں میں بھی خوف کی فضا کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں بھی تجاویز زیرِ غور ہیں۔اور بھی مختلف قسم کی تجاویز پر غور کیا جا رہا ہے۔

سرکاری تعلیمی اداروں کی نجکاری کے حوالے سے جو بنیادی تجویز دی گئی ہے وہ ہے کہ اگرچہ سرکاری تعلیمی اداروں میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی نسبت تنخواہیں سو فیصد زیادہ ہیں لیکن ان کی کارکردگی نجی تعلیمی اداروں میں صرف

ایک چوتھائی ہے۔ تعلیمی اداروں کی اصلاحات کے لیے پرائیویٹ اداروں کی خدمت حاصل کی جائیں یا انہیں مکمل طور پر پرائیویٹ کر دیا جائے تا کہ اسکے رزلٹ سامنے آسکیں۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں اور شاید اور بہت سے لوگ ہوں گے جن کے ذہن میں یہ سوال آئے گا کہ سرکاری تعلیمی اداروں کی استعداد کار کو بہتر کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ با قاعدہ اساتذہ کی تربیت کی جاتی ہے۔ کوئی بھی استاد بنا پروفیشنل ڈگری کے بھرتی نہیں ہو سکتا۔ پرائمری سطح کے لیے انٹر کے ساتھ پی ایس ٹی، سی ٹی کی اضافی ڈگری بہت ضروری ہے۔ مڈل اور ہائی سکولوں میں بی ایڈ، ایم ایڈ کی اضافی ڈگر ضروری ہے۔ یہ تو سرکاری سکولوں میں اساتذہ بھرتی ہونے کی بنیادی ضرورت ہے۔ کیونکہ عام دفتروں میں جس طرح کچھ سالوں کا تجربہ ضروری ہوتا ہے، وہ کسی بھی نئے استاد کے لیے ممکن نہیں ہو سکتا۔ اسلیے انہیں اس طرح کی بنیادی ڈگری لینی پڑتی ہے۔

جب اساتذہ یہ ڈگر لے کر بھی درست طور پر بچوں کو علم نہیں دیتے، سکولوں میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ بچوں کو رٹے لگانے پر مجبور کرتے ہیں تو یہ قصور اساتذہ کا کم اور ان کے پیچھے موجود سسٹم کا زیادہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے بنیادی چیز اساتذہ کی سکول میں حاضری کو یقینی بنانا ہے۔ اس کے لیے صوبہ خیبر پختونخواہ میں مانیٹرنگ سسٹم وضع کیا گیا ہے۔ لیکن کیا صرف اساتذہ کی مکمل حاضری سے بچوں کی تعلیم میں اضافہ ممکن ہے؟ ہر گز نہیں۔ مانیٹرنگ والے

سکولوں کا چکر لگاتے ہیں، اساتذہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ وقت پر آئے ہیں، سکول میں موجود ہیں، وقت پر چھٹی کی ہے اور بس۔ کسی کسی سکول میں مانیٹرنگ والے شاید بچوں سے سوالات بھی کر لیتے ہیں لیکن میرے تجربے کے مطابق مانیٹرنگ والے کچھ سوالات ایسے کر لیتے ہیں جن کے جوابات شاید ان کو خود بھی نہ آتے ہوں۔ اگرچہ وہ سوالات ہوتے کتاب سے ہیں، لیکن ان کا جواب بچوں کو نہ آنے کی دو ہی وجوہات ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ابھی تک وہ اس باب تک نہیں پہنچے ہوتے یا پھر استاد نے ان کو پڑھایا تو ہے، لیکن اس باب سے متعلق انہیں علم فراہم نہیں کیا۔ پڑھایا ضرور ہے لیکن علم نہیں دیا۔ جس کی وجہ سے بعد میں امتحان کے قریب وہ اس باب کا اور دیگر ابواب کا رٹہ لگائیں گے۔

تو صرف اساتذہ کی حاضری ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ مانیٹرنگ والوں کونسا استاد کو چہروں سے پہچان ہوتی ہے۔ تو کوئی بھی استاد ہزار دو ہزار میں اپنی جگہ میں کسی بھی بیروزگار فرد کو رکھ کر بچوں کی تعلیم سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ استاد کی حاضری بھی لگ جاتی ہے، مانیٹرنگ والوں کا چیک اپ بھی اوکے ہو جاتا ہے اور اس بیروزگار کو کچھ سگریٹ پانی کیلیے جیب خرچ بھی مل جاتا ہے۔ اصلی استاد کدھر غائب ہوتا ہے؟ یا تو اس نے اپنا کوئی پرائیویٹ تعلیمی ادارہ کھولا ہوتا ہے یا پھر وہ کسی دوسری جگہ پر نوکری کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی ایک تیر میں دو کیا کئی شکار کرتا ہے۔ جب استاد اس طرح دھوکہ دہی سے،

فریب سے کام لے گا، تو اس کے بچوں کو کیا تعلیم دی جائے گی۔ یہی دھوکہ دہی کی، فریب کی۔ نہ تو اسکی روحانی تربیت ہوتی ہے نہ ہی جسمانی۔ اور یہ سب کچھ نہ ہونے کا ذمہ دار صرف استاد ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ تعلیمی نظام بھی ہوتا ہے جو ان اساتذہ کو بھرتی کرتا ہے، ان کو چیک کرتا ہے۔

بچوں کو تعلیم دینے میں اگر کوئی استاد سستی کرتا ہے تو اس استاد کی اس سسٹم میں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ جب وہ اپنے پیشے سے ایمانداری سے پیش نہیں آتا تو پھر اس کو اس پیشے میں رہنے کا حق ہرگز نہیں ہے۔ ویسے بھی اساتذہ کے نظام کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سب سے زیادہ عیاشی کرتے ہیں۔ کہ سال میں چھ ماہ چھٹیوں میں گزارتے ہیں اور بقیہ چھ ماہ وقت ضائع کرنے میں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نجی تعلیمی ادارے کا بچہ وہی نصاب پڑھ کر اچھے نمبر لیتا ہے اور سرکاری سکول کا بچہ اس نصاب کو ہی نہیں سمجھ سکتا۔ فرق صرف اساتذہ کے پڑھانے کے طریقہ کار کا ہوتا ہے۔ پرائیوٹ سکولوں میں باقاعدہ ایک سسٹم بنایا ہوتا ہے کہ کس ہفتے میں کیا کام کروایا جائے گا اور اس پڑھائے گئے اسباق کا نتیجہ دیکھنے کے لیے کہ وہ طلباء کے دل و دماغ میں کس حد تک سمایا ہے، ان کا ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہ ٹیسٹ بغیر کوئی تاریخ بتائے، اچانک لے لیا جاتا ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کتنے پانی میں ہے۔ پرائیویٹ سکول کی انتظامیہ اپنے بچوں کے ساتھ محنت کرتی ہے کیونکہ انھوں

نے سکول کی ساکھ کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ جو بچے وہاں داخل ہیں ان کو نکال کر کسی دوسرے سکول میں داخل کیا جائے۔ بے شک یہ فیس کے لیے بھی ہوتا ہے لیکن یہ ساکھ کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔

اگر پرائیویٹ سکول کے اساتذہ اپنے بچوں کے ساتھ ٹریننگ نہ کیے ہوئے بھی اتنی محنت کر سکتے ہیں تو پھر سرکاری سکولوں کے اساتذہ کیوں نہیں۔ درحقیقت ان اساتذہ پر مکمل چیک نہیں ہے۔ اگر مانیٹرنگ سسٹم سے ان کی حاضری چیک کی جا سکتی ہے تو ان کا استعداد کار کیوں نہیں۔ ان اساتذہ کو بھی نصاب کی ایک ترتیب بنا کر دی جائے کہ کس ہفتے کیا پڑھانا ہے اور کس حساب سے پڑھانا ہے۔ان کے ٹیسٹ کب لینے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی طلباء کے ذہن کو کھلا کرتی ہیں۔ اگر باقاعدہ طور پر ان سرگرمیوں کو جاری رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ بچے پڑھائی میں بھی دلچسپی نہ لیں۔ سرکاری سکولوں میں بچوں کی دلچسپی نہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ سکول میں انھیں ہر وقت ہی پڑھائی کی طرف رکھا جاتا ہے۔ نجی سکولوں میں جس طرح بچوں کو کھیل کھیل میں سبق سکھایا جاتا ہے، وہی طریقہ سرکاری سکولوں میں بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ اگر سکول اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ بھی کیا جائے، اس حد تک کہ انھیں دوسری نوکری کی ضرورت نہ پڑھے، اور پھر سکول میں اساتذہ کی تعداد بھی اس حد تک بڑھائی جائے کہ فی استاد زیادہ سے زیادہ چار

پیریڈ لے، تاکہ اس پر بھی حد سے زیادہ بوجھ نہ پڑھے تو ہر سکول ایک دوسرے سے بڑھ کر کارکردگی دکھائے گا۔

جب یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور بہت آسان ہے تو پھر سرکاری سکولوں کو نجکاری کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔جب تک سکول قومی دھارے میں رہیں گے، تب تک تو بچے شاید سستے میں پڑھ سکیں۔ مگر جس دن وہ نجی تحویل میں چلے گئے، پھر بچوں سے مختلف حیلے بہانوں سے مختلف قسم کے فنڈ بٹورے جائیں گے۔ اور پھر یوں ہو گا بچے صرف ان کے پڑھیں گے جو امیر سے امیر تر اور امیری ترین ہوں گے۔

بارہ دن کا عشق، پھر اندھیری رات

ماہِ عشق پھر چکا ہے، پھر سے نوجوانوں سے لیکر بوڑھوں تک میں عشق کا سانس بھر گیا ہے۔ پھر علمائے سُو نے محفلیں سجانے کا پروگرام بنالیا ہے۔ پھر سے لوگوں سے پیسے بٹورنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ ہر شہر میں ہر مقام پر ہر چوک میں بڑے بڑے بینرز آویزاں کر دیے گئے ہیں، بڑے بڑے پوسٹرز دیواروں، دروازوں پر چسپاں کر دیے گئے ہیں۔ اور بڑے بڑے خوبصورت الفاظ میں بینرز اور پوسٹرز بنوانے والوں نے ایسے ایسے الفاظ لکھے ہیں کہ بس دنیا میں ان سے بڑھ کر عاشق کوئی نہیں۔ ان سے بڑھ کر چاہنے والا کوئی نہیں۔ چاہے وہ بچہ ہے، چاہے نوجوان، جوان ہے یا بوڑھا عشق کی داستان پھر سے انھوں نے اپنے دل و دماغ میں تازہ کر دی ہے، کہ انھوں نے جوشِ خطابت کا مظاہر کرنا ہے۔ انھوں نے عشق کے سمندر میں اشکوں کے دریا بہانے ہیں۔بڑے بڑے اندھی تقلید کے کی دولت سے مالامال اب اپنے اپنے مطلب کے مطالب قرآن کی آیات سے نکال کر سامنے لائیں گے۔ احادیث سے بھی ثابت کریں گے ۔ثابت کریں گے یہ عشق کے بہت بڑے متوالے ہیں۔ لہک لہک کر ان کی مدحتیں بیان کریں گے۔ لہک لہک کر ڈھول تھاپوں پہ انکی شان میں شاعری کہیں گے۔ اور ثابت کریں گے انھوں نے موسیقی سے ہر گز نہیں منع کیا۔ استغفر اللہ۔ میرے منہ میں خاک جو میں گستاخی کا مرتکب ہوں۔

ربیع الاول کا بابرکت مہینہ جس میں رسول پاک ﷺ کی آمد آمد ہوئی۔ وجۂ تخلیق کائنات آپ ﷺ ہیں۔آپ کی تخلیق کائنات سے کتنے عرصہ پہلے ہوئی اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے سے ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ نے ان کی عمر پوچھی۔انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ، اپنی عمر کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن یہ جانتا ہوں کہ آسمان پر ایک ستارہ چمکتا ہے۔ وہ ستارہ ہر ستر ہزار سال بعد نظر آتا ہے۔ میں اس ستارے کو ستر ہزار مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ وہ ستارہ میں ہی تو ہوں۔ پھر انھوں نے اپنے سر مبارک سے عمامہ مبارک اٹھایا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وہ ستارہ رسول پاک ﷺ کی پیشانی مبارک میں نظر آیا۔ یہ بات ثابت ہے کہ عربی میں ستر کو مطلب لامحدود ہوتا ہے۔ کیونکہ جب عبداللہ بن ابی منافق فوت ہوا تو اس کے بیٹے جو سچے مسلمان صحابی تھے، رسول پاک ﷺ سے اپنے باپ کا جنازہ پڑھانے کا کہا۔ لیکن اللہ پاک نے منع فرمادیا کہ اے نبی ﷺ اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں گے تو اسکی معافی نہیں ہو گی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اسکی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں ضرور کرتا۔ اس سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں کہ ایک تو یہ رسول پاک ﷺ سراپا رحمۃ اللعلمین ہیں کہ وہ چاہتے تھے کہ منافقین کی بھی مغفرت ہو۔دوسری بات یہ کہ آپ غیب کا علم نہیں جانتے تھے جیسا کہ بہت سے

کہتے ہیں۔ میری اس بات کی وضاحت ہے سورۃ آل عمران کی آیت ۱۷۹ سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: "اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو اس حالت پر جس پر تم ہو جب تک کہ جدا نہ کردے ناپاک کو پاک سے اور اللہ نہیں ہے کہ تم کو خبر دے غیب کی لیکن اللہ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہے، تو تم یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم یقین پر رہو اور پرہیزگاری پر تو تم کو بڑا ثواب ہے۔"

تیسری بات یہ ہے کہ ستر مرتبہ عربی میں کم از کم ان وقتوں میں لامحدود کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

جب ہم عشق کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر تمام عمر اس پر قائم کیوں نہیں ہوتے۔ کیا عشق ہمارا صرف بارہ دنوں کے لیے ہوتا ہے، وہ بھی نام نہاد۔ صرف بینر لگانے سے، بڑے بڑے جھنڈے لگانے سے، لبیک یا مصطفیٰ ﷺ کہنے سے ہمارا عشق ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک قرآن میں درود کے بارے میں فرماتے ہیں۔" بے شک اللہ اور اسکے فرشتے نبی پاک ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! آپ بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔"

کیا کوئی مجھے بتائے گا کہ اس میں ربیع الاول کے مہینے کی تخصیص کہاں پر ہے؟ قرآن پاک کے جتنے احکامات ہیں ان میں سے معدودے چند ہی مخصوص ایام کے لیے ہیں جیسے روزے کا حکم، حج کا حکم۔ ورنہ تو تمام عمر کے لیے باقی احکامات ہیں۔ تو درود پڑھنے کا حکم تو سب احکامات پر حاوی ہے،افضل ہے۔ کیونکہ اللہ پاک نے باقی احکامات کے بارے میں یہ ہرگز نہیں کہا

کہ چونکہ اللہ یا اسکے فرشتے بھی یہ کام کرتے ہیں تو اے ایمان والو آپ بھی کرو۔ پس درود پاک پڑھنا تو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور یہ فرض اس پر تمام دن، پورا ہفتہ، پورا مہینہ، مکمل سال بلکہ تمام عمر ہے۔ وضو بغیر وضو کے وہ درود پاک پڑھتا رہے۔ بے شک اللہ نے اپنے ذکر کا بھی حکم دیا ہے۔ فرمایا، " اپنے دلوں کو اللہ کے ذکر سے سکون دو مطمئن کرو)۔" لیکن درود پاک بھی ضرور پڑھنا چاہیے۔ کہیں پر پڑھا تھا کہ اگر کچھ بھی) نہ پڑھا جائے تو کم از کم دن میں دس مرتبہ تو ضرور پڑھا جائے۔ کیا ہم لوگوں کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے؟ تو پھر ہمارا عشق کا دعویٰ کیا ہوا؟

لوگوں سے پوچھا جائے، جنھوں نے یہ محفلیں سجائی ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں رسول پاک ﷺ کی پیاری سنتوں پر کتنا عمل کیا ہے۔ ان کے احکامات کو کس حد تک اپنی زندگی کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے اصراف سے، فضول خرچی سے منع فرمایا ہے۔ تو یہ جو آپ نے بازاروں میں جھنڈے، بینر، قمقمے سجائے ہیں ان پر کتنا خرچہ آیا ہے؟ اگر یہی خرچہ آپ ان غریبوں میں تقسیم کر دیتے، جن کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں، جنھیں تن ڈھانپنے کو کپڑا نصیب نہیں۔ جنھیں اس شدید سردی میں سر ڈھانپنے کو چھت میسر نہیں۔ اگر ان جھنڈوں، بینروں اور محافل پر کیے گئے اخراجات سے ان کو یہ چیزیں مل جاتیں تو وہ اللہ کے دربار میں آپ کی بخشش کرانے میں اپنا حصہ ضرور ڈالتے۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھی

عورت کو اسکے پوتوں وغیرہ کے ساتھ اس کی مدد کی، انہیں بھوک میں خوراک مہیا کی تو اس عورت نے کہا کہ کاش تو عمر کی جگہ ہوتا۔ تو کیا یہ لوگ ان لوگوں کو دعائیں نہیں دیں گے۔ لیکن جب ہم اپنے اخراجات اسی طرح فضول خرچی کی مد میں جاری رکھیں گے تو پھر آپ ادھر رسول پاک ﷺ کی شان میں نعتیں کہہ رہیں ہوں گے، اور اُدھر ان کی زبان سے آپ کے لیے کیا نکلے گا۔ یہ آپ بہتر جانتے ہیں۔

شانِ مصطفیٰ بیان کرنی ہے تو پھر پورا سال کرو، ان کی سنتوں کو عام کرو، خود بھی ان پر عمل کرو تب ہی دوسرے بھی عمل کریں گے۔ حضور سرور کائنات ﷺ کے پاس ایک خاتون اپنے بیٹے کے ساتھ تشریف لائیں اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ! یہ میرا بیٹا ہے۔ میٹھا بہت کھاتا ہے۔ اسے نصیحت کیجئے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ کل آنا۔ اگلے دن وہ خاتون پھر آئیں۔ آپ ﷺ اس بچے سے صرف اتنا فرمایا۔ کہ بیٹا میٹھا کم کھایا کرو، یا نہ کھایا کرو۔ (اللہ پاک کمی بیشی معاف فرمائے) ۔اس خاتون نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ ۔ یہ بات تو آپ کل بھی فرما سکتے تھے۔فرمایا۔ کل میں نے خود کھجور کھائی ہوئی تھی، تو بچے کو کیسے منع فرماتا۔ تو قارئین کرام ! کیا ہم میں یہ خاصیت موجود ہے؟ کیا ہم سنتِ نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہیں۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ اگر ایک سنت پر عمل کرنے کے لیے کسی کو کہیں تو وہ کہتا ہے کہ اور کون سی سنتوں پر عمل ہو رہا ہے۔ نہیں ہر گز نہیں۔

فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ آپ حضرات ایک سنت پر تو عمل کریں۔ جس پر آسانی سے کر سکتے ہیں اس کو ہر گز نہ چھوڑیں۔ پھر آپ خود ہی کسی دوسری سنت کو بھی اپنا لیں گے۔ ان شاء اللہ بہت جلد ہی آپ بنا سوچے سمجھے حضور پاک ﷺ کی ہر سنت کو اپنی زندگی میں اس طرح شامل کر لیں گے کہ جس دن کوئی سنت رہ جائے گی، آپ کو زندگی بیکار لگے گی۔ حضور ﷺ کے پاس ایک شخص حاضر ہوا۔ عرض کیا، کوئی نصیحت فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جھوٹ نہیں بولنا۔ وہ شخص شراب پیتا تھا۔ شاید اس وقت تک شراب کی حرمت مکمل طور پر قائم نہ ہوئی ہو گی۔ اس شخص نے وعدہ کر لیا۔ وہ گھر گیا۔ نماز کا وقت ہونے لگا تھا۔ اس نے شراب کو منہ کے ساتھ لگایا ہی تھا کہ خیال آیا اس وعدے کا۔ جام نیچے رکھا۔ سوچا کہ کل رسول پاک ﷺ پوچھیں گے شراب کا، تو میں کیا کہوں گا۔ اگر کہوں گا نہیں پی تو جھوٹ ہو گا۔ اور اگر ہاں کہوں گا تو یہ ان کو ناپسند ہے۔ شراب چھوڑ دی۔

تو میرے پیارے ساتھیو! جب عشق ہی کرنا ہے تو پورا سال کرو، اور ایک بار کرو۔ یہ نہیں کہ بارہ دن کی اور پھر گناہوں کی راتوں میں مشغول ہو گئے۔ یہ عشق اس طرح کرو کہ پھر آپ کی جان، آپ کا مال، آپ کے اعمال، سب کے سب اسوۂ حسنہ کے مطابق نظر آئیں۔ احکامات خدا پر عمل پیرا ہوں اور سنت نبوی ﷺ آپ کی زندگی کا حصہ نہیں بلکہ آپ کی زندگی ہی ہو۔ بس پھر کامیابی ہی کامیابی ہے۔

کتاب سے دوستی سے حق بات تک

کچھ خمار ایسے ہوتے ہیں جو آپ کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جنھیں آپ جتنا بھلانا چاہیں، وہ اُتنا ہی آپ کی زندگی میں آپ کے ہر پل میں ، ہر لمحہ میں آپ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ خمار پہلی شراب کا ہو، سگریٹ کا پہلا کش ہو، یا پہلی کافی کا آخری گھونٹ، ہر اک کا الگ سا خمار ہوتا ہے۔ ان سب سے الگ ایک خمار کتاب کا بھی ہوتا ہے، جس کو چڑھ گیا، پھر اترا نہیں۔ اترے بھی کیسے کہ کتاب کا نشہ، خمار ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور خمار کی بات ہو رہی ہے، چسکے کی نہیں۔ جس نے کتاب سے دوستی کر لی، پھر اس کی دوستی شاید ہی کسی اور چیز سے ہو۔ کتاب چیز ہی ایسی ہے کہ نشہ چڑھتا ہے اور چڑھتا جاتا ہے۔ کیونکہ جو کہا گیا کہ کتاب تنہائی کی بہترین ساتھی ہے تو واقعی ہے۔ یہ آپ کو بور نہیں ہونے دیتی۔ یہ آپ کو کمبل کے اندر گرم رکھتے ہوئے محلّہ، گاؤں ، شہر ، ملک ملک کی سیر کراتی ہے۔ آپ کی واقفیت ان ان جگہوں سے کراتی ہے جہاں کے بارے میں آپ نے شاید خوابوں خیالوں میں بھی نہ سوچا ہو۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ آپ کسی ایک ملک کے دس سفر نامے پڑھ کر گیارھواں خود لکھ لیتے ہیں، اور وہ ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے۔ کیونکہ جب دس کتابوں کا بہترین نچوڑ نکال کر عرق ریزی کی جائے گی تو ظاہر ہے وہ نقل یا چربہ ضرور ہو گی لیکن بہترین ہو گی۔

ہماری قسمت میں البتہ اس طرح کی عرق ریزی ہر گز نہیں۔ کیونکہ ہم جس موضوع پر کتاب پڑھتے ہیں وہ دس کی تعداد ابھی تک پوری نہیں ہو سکی کہ ہم بھی کسی مصنف کی صف میں شامل ہو سکیں۔ لیکن ہمیں یہ اعزاز ضرور حاصل ہے کہ ہمیں دوستی کا خمار ضرور چڑھتا ہے۔ یہ وہ خمار ہے جو بچپن سے چڑھا اور ایسا چڑھا کہ آج تک اترا ہی نہیں۔ دوستوں میں عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ سکول میں اپنے سے اگلی جماعتوں والے بھی دوست تھے تو ہم جماعت تو تھے ہی۔ کالج میں سکول کے جو دوست بنے وہ تو قائم رہے، جن سے صرف گپ شپ تھی، ان سے ملاقات بھی ہو جاتی تو بہت تھا۔ پھر یونیورسٹی اور پھر عملی زندگی کا آغاز۔ لیکن نئے سے نئے دوست بنانے کا خمار، چھٹتی نہیں ہے یہ کافر منہ کو لگی ہوئی۔ کتابوں کے بہانے دوست بنے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی کتاب دیکھی، اس سے بات چیت شروع کر دی۔ کسی کو کسی کتاب پر تبصرہ کرتے دیکھا، اس سے دوستی ہو گئی۔ کسی نے پوچھ لیا کہ کیا ہو رہا ہے، جواب دیا کہ کتاب پڑھی جا رہی ہے، دوستی ہو گئی۔ یہ الگ بات کہ کچھ دوستیاں زندگی بھی خراب کر بیٹھتی ہیں۔ اپنی بھی اور آپ کی بھی۔ بھلے آپ زمانے سے لڑتے پھریں، اپنے آپ سے لڑتے پھریں، اپنے آپ کو دنیا بھر کے سامنے پر سکون ظاہر کریں، لیکن جن دوستوں نے وہ چرکہ لگایا ہوتا ہے، وہ رفو بھی نہیں ہوتا۔

بات کہاں کی کہاں نکل گئی۔ بات ہو رہی تھی دوستی کی۔ پھر نئی ٹیکنالوجی آئی۔ انٹرنیٹ کی ٹیکنالوجی۔ جس کی بدولت دنیا واقعی ایک گلوبل ویلج یعنی کائناتی گاؤں بن گئی۔ جس طرح ایک گاؤں میں رہنے والے افراد کو دوسروں کے حالات کا کافی حد تک علم ہوتا ہے، کم از کم وہ حالات جو چار دیواری سے باہر اس کو پیش آتے ہیں۔ اسی طرح اس گلوبل ویلج میں جب رابطے بڑھنے لگے تو بڑھتے بڑھتے دوستی تک پہنچ گئے۔ ایک کنویں کا مینڈک بھی کنویں سے باہر کے حالات سے یوں باخبر رہنے لگا جیسے وہ اپنی آنکھوں سے واقعات کو وقوع پذیر ہوتے دیکھ رہا ہو۔ بس ہماری حالت بھی اس کنویں کے مینڈک جیسی تھی۔ افریقہ کے کسی دور افتادہ ملک میں ہونے والے واقعے کو نیٹ سے پڑھ کر، کوئی چھوٹا موٹا کلپ دیکھ کر دیگر عوام الناس پر خوب رعب ڈالا۔ کہ نیٹ ہمارے پاس تھا، ہمارے ہمسائیوں کے پاس نہیں۔ لیکن کب تک؟ دنیا سکڑتی جا رہی تھی۔ اور مواصلاتی ٹیکنالوجی پھیلتی جا رہی تھی۔ یوں نیٹ پھر گھر سے گلی میں پھر محلے میں اور پھر ملک میں پھیلنے لگا۔ پھر یوں ہوا کہ نیٹ کیفے کھل گئے۔ جنھوں نے اس کا مثبت استعمال کیا، انھوں نے فائدہ ہی اٹھایا۔ جنھوں نے منفی استعمال کیا، آج وہ اپنی جوانی کو رو رہے ہیں۔

ہمیں ٹھہرا شوق پورے پاکستان کی سیر کا۔ ہمارا جیب خرچ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ ہم یہ کارنامہ سرانجام دے سکیں۔ اس کا حل یہ نکالا

گیا کہ نیٹ پر پاکستان بھر کی عوام سے رابطے رکھے گئے۔ جن کو ہم نے مختلف فورمز پر ڈھونڈا۔ان سے ان کے شہر کے اندر کے حالات جانیں۔ اگر کسی شہر کے بارے میں کچھ سنا ہوا تھا تو اس کی تفصیلات ان سے معلوم کیں۔ یوں انسائیکلوپیڈیا میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس گپ شپ کے دوران کچھ لوگوں سے دوستی ہو گئی۔ ایسے دوست بنے کہ پھر شہر شہر نہ رہا، بلکہ گاؤں بن گیا۔ ایک دوسرے سے ملنے کے بہانے ڈھونڈے گئے۔ کافی دوست ملے، خوشی کا اظہار ہوا۔ اگرچہ پہلی ملاقات ہوتی تھی، لیکن اگر اتفاق سے اس ملاقات میں چار پانچ دوست اکٹھے ہو گئے تو ارد گرد دیکھنے والوں کو ہرگز یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ہم دوست زندگی میں پہلی دفعہ مل رہے ہیں۔ یہ سب اس ٹیکنالوجی کا کمال تھا۔ آپس میں تحفے تحائف کا تبادلے ہوئے۔ دوستیوں کے رشتے مضبوط ہوئے۔ لیکن کیا عجب ہی بات ہے کہ ان ہی دوستوں میں کچھ ایسے بھی ٹھہرے، جنھوں نے صرف بات چیت کی حد تک ہی دوستی اختیار کی۔ فورم کی دنیا میں تو انھوں نے بہت کچھ حامی بھری، لیکن جب کبھی ان سے بات ہوئی، اگر کسی کام کا کہا گیا تو انھوں نے کبھی ایک بہانہ بنایا، کبھی دوسرا۔ لیکن اس بات پر اگر کوئی برا مانے تو یہ اس کی غلطی ہو گی کہ کون سا یہ دوست اسکا لنگوٹیا تھا، یا محلے گاؤں کا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔ کچھ لوگ ایسے بھی دوست بنے جن سے نہ کتاب کی دوستی ہوئی، نہ ٹیلی فون کی دوستی۔ نہ کبھی فون پر بات ہوئی، نہ کبھی سکائپ یا کسی اور ذریعے سے۔ لیکن وہ پھر بھی

دل کے قریب ہو گئے۔ کیونکہ وہ کسی فورم پر جو کچھ کہتے تھے وہ ان کے دل کی آواز ہوتی تھی۔ وہ دل سے لکھتے تھے، دل سے کہتے تھے۔ ان کو اگر ملک میں ہونے والا کوئی کام اچھا نہیں لگتا تھا، اور حقیقتاً بھی وہ ملک کے عام مفاد میں نہیں ہوتا تھا تو اس کو دھڑلے سے للکارنا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا، ہم نے بازو تھام لیا۔ انھوں نے بازو واہ کئے، ہم نے جادو کی جھپی ڈال لی۔ ایسے دوستوں کا خمار ہم پر ایسا جادو کر گیا کہ اب کہیں بھی کوئی بھی اس خمار کا نام لیتا ہے تو ہمارے کان تو کیا جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ایسے ہی دوستوں میں ایک نام سون نین مخمور کا بھی ہے۔ ان سے کمپیوٹر کی بورڈ کی حد تک ہی ہم سے دوستی ہے یا ہماری ان سے دوستی ہے۔ لیکن اسی کی بورڈ کو استعمال کرتے ہوئے وہ جب ظالم کو للکارتے ہیں تو ہمیں سلطان راہی یاد آ جاتا ہے۔ یہ اور بات کہ ان کی اور سلطان راہی مرحوم کی للکار میں بہت فرق ہے۔ مرحوم پردۂ سکرین پر للکارتے تھے اور پھر ایک بندوق سے جس میں بیس پچیس گولیاں ہوتی تھیں پچاس ساٹھ دشمن مرتے تھے ، اسکے باوجود کہ گولیوں کی اکثریت دشمن کے ارد گرد سے گزراتی تھی۔ جب کہ ہمارے یہ سون نین مخمور کی للکار اگر کسی دن حقیقتاً ایوانوں میں پہنچ گئی تو پھر دو ہی باتیں ہوں گی کہ یا تو ان کی باتوں کو کڑوا سچ سمجھتے ہوئے ان کے لکھنے پر پابندی لگا دی جائے گی، یا پھر ان کی تحریروں کو قبول کرتے ہوئے ان پر عمل کیا جائے گا۔ ہماری تو دل سے دعا ہے کہ ان کی تحریروں کو اللہ

پاک دوام بخشے اور پڑھنے والوں کے دل پر اثر کرے، اُن کو اِن پر عمل کی توفیق نصیب ہو۔ اور ہمیں اپنے سر نوید مخمور کا باقاعدہ مرید بننے کا شرف حاصل ہو۔

سون نین مخمور کی پیروی کرتے ہوئے ہم نے بھی کڑوا سچ لکھنے کی کئی مرتبہ کوشش کی لیکن پھر بھی مصلحتوں کا شکار ہو کر ہم نے ہر تحریر میں ڈنڈی مار ہی ڈالی۔ اسی لیے، ہماری کسی تحریر میں وہ اثر ہر گز نہ ہوا، جو سون نین مخمور کے قلم کا سحر ہے۔ ہماری ہر اس طرح کی جدو جہد پر اس وقت پانی پھرا، جب ہم نے سچ سے راہِ فرار اختیار کی۔ اور سچ کہوں تو یہ صرف ہم ہی نہیں ہیں راہِ فرار اختیار کرنے والے۔ ہماری اکثریت لکھاریوں کی، کالم نویسوں کی، مضمون نگار یا فیچر نگاروں کی ایسی ہی ہے، جو سچ کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جھوٹ کے وہ طور مار باندھتے ہیں کہ پھر یہ جھوٹ کے رات کو سورج نکل کر چار سو گرمی کا قہر برسا رہا تھا، سچ ہی سچ محسوس ہوتا ہے۔ خدارا، سچ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور جو سچ ہے اسے ہی عوام تک پہنچائیں۔ سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ ہر گز نہ کریں۔ سچ کو بیان کرنا گواہی دینا ہے۔ اللہ پاک قرآن میں فرماتے ہیں: ۔" اور تم گواہی کو مت چھپاؤ۔ اور جو اسے چھپائے گا اس کا دل گناہگار ہوگا۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔" سورۃ البقرہ۔ آیت۔ ۲۸۳۔ یعنی سچ بات لکھنا، سچ بات کہنا، سچ بات بیان کرنا فرض

ہے۔ کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اور ہمارے دوست سون نین مخمور یہی کام کرتے ہیں۔ لہذا
ہم بھی اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمارے سمیت، ہمارے سب دوست احباب کو ہمیشہ
حق سچ بات کہنے کی، کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین، ثمہ آمین۔

ہمیں خوبصورت پاکستان چاہیے

کہتے ہیں کہ کسی بھی انسان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اسکی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور یہ بات بہت حد تک سچ ہے کہ انسان جو کچھ کہتا ہے وہ بہت حد تک اسکے کردار سے، اسکی سوچ سے مطابقت رکھتا ہے۔ اسکے خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔ عمران خان صاحب نے ایک اصطلاح "نیا پاکستان" اپنی الیکشن مہم میں استعمال کرنا شروع کی تو اسکی جو تشریحات ہوئیں یا ہوتی ہیں وہ علیحدہ بحث ہے لیکن جو تشریح مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے کی تو میں تو کیا، بہت سے لوگ پڑھ کر یقیناً ششدر رہ گئے ہوں گے۔ محترم نے وہ باتیں کیں کہ دل سے بے اختیار یہ دعا نکلی کہ اللہ نہ کرے کہ کبھی پاکستان پر وہ وقت دوبارہ آ آئے۔ اللہ کبھی ایسا نہ کرے۔ استغفر اللہ۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ عمران خان کے "نیا پاکستان" سے بغاوت کی بو آتی ہے۔ جنرل یحیٰی خان کی پیروی نظر آتی ہے۔ جنرل نیازی کی طرح عمران خان بھی پاکستان کو ٹکڑوں میں بانٹنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ ۱۹۴۷ میں قائدِ اعظم نے نیا پاکستان بنایا تھا۔ جب ہندوستان کے دو ٹکڑے ہوئے تھے۔ پھر ۱۹۷۱ میں جنرل یحیٰی خان اور جنرل نیازی کی غلطیوں سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش

کی صورت میں جدا ہوا اور مغربی پاکستان ایک نئے پاکستان کے روپ میں دنیا کے نقشے میں رہ گیا۔ اور اب عمران خان خدا جانے کس حصے کو جدا کر کے (میرے منہ میں خاک) نیا پاکستان بنائیں گے؟ میں نے جب یہ بیان پڑھا تو بے اختیار ماضی کی ایک یاد دماغ میں لہرا گئی۔ جونیجو دورِ حکومت میں جب بے نظیر بھٹو صاحبہ پاکستان واپس تشریف لائی تھیں اور پھر جنرل ضیاء کے فضائی حادثے میں فوت ہو جانے کے بعد الیکشن کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں تو کسی نے مولانا فضل الرحمٰن سے پوچھا تھا کہ کیا عورت کی حکمرانی جائز ہے؟ تو انھوں نے ببانگِ دہل جواب دیا تھا کہ قطعاً ناجائز ہے۔ کیونکہ اگر ایک چھوٹے سے گھر کی حکمراں ایک عورت نہیں ہو سکتی تو ملک کی حکمرانی کیسے جائز ہو گی؟ لیکن پورے پاکستان نے دیکھا کہ چند ماہ بعد ہی مولانا صاحب کو اسی بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت میں ایک عدد وزارت دی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے ایک وفاقی وزیر وزیر اعظم کو ہی جوابدہ ہوتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس وقت عورت کی حکمرانی کدھر گئی؟

نیا پاکستان" کے حوالے سے مولانا صاحب کا بیان انکی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ جبکہ میں کہوں گا کہ جب پاکستان سے دہشت گردی ختم کر دی جائے، قانون کی بالادستی قائم ہو، امیر غریب سب کے لیے ایک قانون ہو، سفارش رشوت اور اقربا پروری کا سسٹم ختم ہو کر میرٹ سسٹم بحال ہو، انصاف کا بول بالا ہو، غریب

کبھی بھی بھوکا نہ سوئے، لوڈ شیڈنگ گیس کی ہو یا بجلی کی، کا خاتمہ ہو۔ اسلام کے اصولوں کے مطابق عوام آزادی سے زندگی گزار سکیں، ملک میں معیشت اپنے اصلی اور اعلیٰ مقام پر ہو۔ دنیا میں پاکستان کا نام مثبت انداز میں احترام و عزت سے لیا جائے۔۔۔ تو کیا یہ ایک نیا پاکستان نہیں کہلائے گا؟ جس طرح ایک ویران اور اجڑے گھر کی نئے سرے سے تزین و آرائش کی جاتی ہے تو ہر دیکھنے والا کہتا ہے کہ واہ یہ تو بالکل نیا ہو گیا۔ تو کیا پاکستان کو نیا نہیں کہا جا سکتا؟ مولانا صاحب، میرے اس سوال کا جواب ضرور دیجئے گا؟ اگرچہ یہ سوال مجھے الیکشن سے پہلے پوچھنا چاہیے تھا، لیکن ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔
عمران خان صاحب کا وژن بہت اعلیٰ تھا۔ منشور بہت اچھا تھا۔ لیکن انکے بنائے گئے اس خوبصورت تالاب میں چند ایک گندی مچھلیاں بھی جمع ہو گئی تھیں اور بد قسمتی سے انکو ٹکٹ بھی دے دیا گیا۔ وہ ایسے لوگ تھے جو ممبر نیشنل اسمبلی یا صوبائی اسمبلی نہ ہونے کے باوجود لوگوں سے ملنے جلنے سے کتراتے تھے۔ پولیس کو، ڈی سی اوز کو اپنے آگے پیچھے دوڑاتے تھے۔۔ شراب، کباب و شباب کے رسیا تھے تو اختیار ملنے کے بعد انکا کیا حال ہوا، سب نے دیکھ لیا، اور ہنوز دیکھ رہے ہیں۔ ایک قول جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کیا جاتا ہے کہ جب کسی کے پاس مال و دولت اور اختیار آ جاتا ہے تو وہ بدلتا نہیں بلکہ اسکی

اصلیت سامنے آتی ہے۔ اور ہم نے بہت سے لوگوں کی اصلیت دیکھی۔ خان صاحب آپ کی سوچ بہت عمدہ تھی۔ مستقبل کے بارے میں جو خاکہ آپ کے ذہن میں تھا وہ یقیناً قابلِ تحسین تھا۔ لیکن ان چند گندی مچھلیوں کی وجہ سے آپ کوئی نمایاں کارنامہ سر انجام نہ دے سکے۔ خیبر پختون خواہ میں حکومت بنانے کے چھ ماہ بعد آپ نے کہا کہ پولیس کو آپ نے سیاست سے پاک کر دیا ہے۔ وہ کبھی کسی سیاستدان کے آگے پیچھے نہیں پھریں گے بلکہ اپنے علاقے میں امن و امان قائم کرنے کے لیے کام کریں گے۔ لیکن ہوا کیا؟ ایک سب سے بڑی مثال ضلع مانسہرہ میں اس وقت کے ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر جناب عبدالغفور آفریدی کی ہے۔ جنھوں نے مانسہرہ میں وہ امن قائم کیا کہ اس سے پہلے شاید کراچی میں ہی اسکی مثال ملتی ہو جنرل نصیراللہ بابر کے زمانے میں یا پھر موجود رینجرز کے ایکشن میں۔ مذکورہ ڈی پی او نے مجرموں کو چن چن کر گرفتار کیا۔ ان کو سزائیں دلوائیں۔ لیکن جب انھوں نے بڑے مجرموں پر ہاتھ ڈالا تو انہیں ایک نئے سیاستدان ہی کے دباؤ پر تبدیل کر دیا گیا۔ بہانہ کیا گیا کہ ان کو شولڈر پروموشن دی گئی ہے اور انہیں ڈی آئی جی بنا کر ڈیرہ اسماعیل خان بھیج دیا گیا ہے۔ خان صاحب، وہ سیاستدان کون تھا، یہ آپ جناب آفتاب شیرپاؤ صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس سیاستدان کے پاس اس وقت پانچ وزارتیں تھیں۔ جو اپنے علاقے میں ٹمبر مافیا کا بادشاہ تھا۔ آپ خود سوچیں، آپ نے اس طرح کے کتنے فیصلے اپنی مرضی سے کیے۔

نہیں عمران خان صاحب نہیں۔ آپ نے اگر واقعی نیا پاکستان بنانا تھا اور ابھی بھی یہی ارادے ہیں۔ پاکستان کے تشخص کو دنیا میں بہتر سے بہترین کرنا ہے۔ قرضے جیسی لعنت سے پاک کرنا ہے، تو آپ نے پاکستان کے مفاد میں جب بھی فیصلے کرنے ہیں تو پھر ان پر ڈٹ بھی جانا ہے۔ آپ نے پھر پاکستان کے علاوہ کسی کا مفاد نہیں دیکھنا۔ آپ ہی کے پارٹی ممبرز آپ کو ڈرائیں گے کہ اگر ڈرون حملے بند کرا دیے تو امریکہ پاکستان کی امداد روک دے گا۔ جاپان سے الیکٹرانکس کا سامان نہیں آئے گا۔ لگژری گاڑیاں نہیں آئیں گی۔ تو میں کہوں گا کہ خان صاحب کیا فرق پڑتا ہے؟ خان صاحب، کیا آپ کی پارٹی والے اس طرح کی بات کر کے ملک سے غداری کرنے کے زمرے میں تو نہیں شامل ہو جائیں گے؟ سوچ لیجئے گا۔

اللہ نے آپ کو ایک صوبے میں حکومت عطا کر دی۔ یہ سمجھیں کہ آپ کا ٹرائل ہے۔ اگر آپ پانچ سال، جس میں سے کچھ ماہ کم تین سال گزر چکے ہیں، عمدہ طریقے سے گزار دیتے ہیں کہ جب دنیا میں بہترین نظام حکومت کا سروے ہو، تو صوبہ خیبر پختونخواہ اول درجے پر آئے، تب ہم کہیں گے کہ ہاں، آپ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ لیکن ابھی تک ہمیں ایک شوکت خانم ہسپتال کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یا پھر مانیٹرنگ ٹیمز جو صرف اساتذہ کو چیک کرتی پھر رہی ہیں کہ وہ وقت پر سکول آتے ہیں یا بچوں کو اچھی طرح سے پڑھاتے ہیں، مزید کچھ بھی نہیں۔ کرپشن بھی اسی طرح جاری ہے، اور مرضی سے تبادلے بھی۔ لیکن ابھی بھی آپ کے پاس دو

سال باقی ہیں۔ ایک منٹ کے زلزلے سے دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے تو دو سال میں اپ خیبر پختون خواہ کے حالات بھی بدل سکتے ہیں۔ عوام الناس کو فوری اور صاف انصاف مہیا کریں۔ سالوں اور عشروں سے جو مقدمات لٹکے ہوئے ہیں کہ مقدمات کی تعداد ہی اتنی زیادہ ہے، ان کو انصاف پر حل کروائیں۔ کوئی نظام ایسا بنائیں کہ کوئی بھی مقدمہ ہو، یا پولیس کے پاس رپورٹ درج ہو، اس کا حل دنوں میں نکلے۔ کیا فرق پڑے گا۔ خود دیکھ لیجئے گا۔

صحت و صفائی کا سلسلہ بہترین ہو۔ پاکستان میں شاید ایک اسلام آباد کے علاوہ کسی بھی دوسرے شہر میں نکاسیٔ آب کا نظام بالکل بھی نہیں۔ گھروں کا پانی گلی محلّہ کی سڑکوں پر بہہ رہا ہوتا ہے۔ کیا صفائی سے رہنا عوام کا حق نہیں۔ آپ نکاسیٔ آب کا نظام بہتر بنوائیں۔ صوبہ کے ہر شہر کا سروے کرائیں کہ کس کس علاقے میں یہ نظام بالکل بے کار ہے۔ ہر ضلع میں ضلعی دفاتر قائم ہیں۔ ٹیم ایم بھی اور سول ورکس والے بھی۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ کچھ علاقوں میں کچھ مخصوص لوگ اپنی اجارہ داری ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے گھر سے نکلنے والے گندے، غلیظ پانی کا بہاؤ نیچے کی طرف تو کر دیتے ہیں، لیکن اپنے گھر کے سامنے گزرنے والی گلی سے یا سڑک سے نالہ نہیں بنوانے دیتے۔ کیوں؟ وجہ نامعلوم۔ آپ کو وقت کے ان فرعونوں سے بھی ٹکرانا ہے۔ عوام کو اگر مفت یا کم سے کم قیمت پر علاج اور ادویات نصیب ہوں۔

ہسپتالوں میں، ڈسپنسریوں میں ڈاکٹر ہر وقت موجود ہوں، اور دل سے مریضوں کو چیک کریں۔ صرف دل پر سٹیتھوسکوپ رکھ کر مریض کی ٹانگ کا درد نہ معلوم کریں۔ اور جس علاقے میں مریضوں کا رش زیادہ ہے، وہاں پر ڈاکٹروں کی تعداد بڑھائیں۔ دوائیں اصلی دستیاب ہوں۔ اور ہر وقت ہر قسم کی دوائی موجود ہو۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ لوگ آپ کو دعائیں نہ دیں۔ ہاں اس کیساتھ آپ کی شوکت خانم ہسپتال چاہے لاہور کی ہو یا پشاور کی، اس میں اگر غریب لوگوں کو بھی مفت علاج ہو تو پھر مزید جھولیاں بھر کر دعائیں ملیں گی۔ ورنہ شوکت خانم کمائی کا ذریعہ تو ہے ہی۔

اگر آپ کی ان پالیسیوں کی وجہ سے امریکہ امداد بند کر دے گا تو کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم جو ہر سال کروڑوں اربوں ڈالر کی صورت میں میں قرضہ کی مد میں واپس کرتے ہیں، ہم وہ ادا نہ کریں تو کیا فرق پڑے گا۔ اگر تو سابقہ حکمرانوں میں سے کسی نےپاکستان کو آئی۔ایم۔ایف، ورلڈ بینک یا امریکہ کے پاس گروی نہیں رکھا ہوا تو امداد بند ہونے پر اور قرضہ واپس نہ کرنے پر یہ کیا کرلیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ ساری دنیا کے یہ نام نہاد ٹھیکیدار دنیا میں تنہا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم پر مختلف حیلے بہانوں سے پابندیاں لگوانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس وقت میں حکمرانوں سے دست بستہ عرض کروں گا کہ آپ اللہ کا نام لے کر ایسے اقدامات کیجئے کہ پاکستان کے جو قریب

ترین ترقی یافتہ ممالک ہیں، جو امریکہ، برطانیہ، انڈیا، آئی ایم ایف کا نہیں کھاتے، آپ ان سے رابطے میں رہیں، ان سے معاہدے کریں، ان کو اپنی ٹیکنالوجی دیں، ان سے ان کی ٹیکنالوجی دیں تو پھر کیا امریکہ، برطانیہ، انڈیا اور آئی ایم ایف یا ورلڈ بینک کوئی بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔

الحمد اللہ پاکستان ہر چیز میں خود کفیل ہے۔ اگر پاکستان میزائل بنا سکتا ہے۔ خالد، ضرار جیسے ٹینک بنا سکتا ہے۔ جے ایف 17 تھنڈر طیارے بنا سکتا ہے تو باقی چیزیں بنانا کون سا مشکل ہے۔ اصل میں امریکہ اور اسکے اتحادیوں نے ہمیں کاہلی پر لگا دیا ہے۔ اور کچھ یوں لگا دیا ہے کہ ہمیں ان باتوں کی طرف سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اگر پاکستان کی بہتری کے لیے کچھ سوچتے بھی ہیں تو اس میں بھی کمیشن مافیا آگے بڑھ کر ساری سوچ پر پہرے بٹھا دیتا ہے۔ پھر ہمیں فرصت ہی نہیں ملتی کہ کہیں ہم کسی بھی معاملہ میں خود کفیل نہ ہو جائیں۔ اور پہلے اپنے پاو?ں پر کھڑے ہو کر، پھر دوسری اقوام کی مدد بھی نہ شروع کر دیں جس کی وجہ سے ان ٹھیکیداروں کی بادشاہی ختم ہو جائے۔ جیسا کہ چین نے کیا۔ امریکہ اور اسکے اتحادیوں کی اجارہ داری ختم ہونے کا ڈر ہے نا۔۔۔

جناب وزیرِ اعظم صاحب، یہ سب اگرچہ عمران خان صاحب کے لیے بظاہر لکھا گیا

ہے، لیکن آپ تو بہت تجربہ کار ہیں۔ مواصلات کے ساتھ ساتھ متوازی طور پر اگر دیگر مسائل پر بھی انکے وزارتوں کے ذریعے توجہ دیں تو کیا ۲۰۱۸ تک سارے کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے؟ کیا دنیا میں پاکستان کا نام اونچا نہیں ہو گا۔ ابھی اگر لاہور میتھین پیدا کرنے میں دنیا میں دوسرے نمبر پر آسکتا ہے تو صفائی پسند ماحول میں بھی تو اول نمبر پر آسکتا ہے۔ ہمیں بس ایک پاکستان چاہیے، جس میں یہ سب کچھ ہو۔ نہ ہو تو ناانصافی نہ ہو، کرپشن نہ ہو، گندگی نہ ہو، قرضہ نہ ہو، سود نہ ہو، ظلم و زیادتی نہ ہو۔۔ ہو تو تعلیمی نظام سادہ، آسان لیکن دنیا سے بھرپور مقابلے والا ہو، انصاف کا بول بالا ہو، عوام کو رہائش، بجلی، پانی، گیس، سب کچھ آسانی سے ملے۔ صحت و صفائی ہو، ہسپتالوں میں دوائی ہو۔سب سے بڑھ کر اگر اسلام کے نفاذ کا اعلان نہ بھی کیا جائے، لیکن اسلام کی تعلیمات کو اپنا کر انہیں ہی نافذ کر دیا جائے تو ہمارے اس خوبصورت پاکستان میں ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہمیں انصاف چاہیے

قرطبہ کے قاضی یحیٰی بن منصور کے انصاف کا واقعہ شاید ہر پڑھے لکھے با شعور پاکستانی نے پڑھا ہو گا، سنا ہو گا۔ جب اس کے بیٹے سے قتل کا ایک جرم سرزد ہو گیا۔ کہاں کہاں سے سفارشیں نہیں آئیں۔ اس عورت نے ان کی منتیں کیں جس نے ان کے بیٹے کو پالا تھا۔ پورے کا پورا شہر اس حق میں بالکل نہیں تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ پھر اس لڑکے کے دیگر ساتھی پورے شہر کو خون میں نہلا دیتے۔ گلیوں کی گلیاں اجاڑ دیتے۔ نہیں، بلکہ اس لیے کہ پورا شہر سمجھتا تھا کہ زبیر نے یہ قتل برابر کی لڑائی میں کیا تھا۔ لیکن قاضی صاحب ہرگز نہ مانے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو موت کی سزا سنائی۔ پورے شہر میں ان کے بیٹے زبیر کو پھانسی دینے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں۔ قاضی نے فتویٰ تو دے دیا تھا، لیکن اس پر عمل کون کرے، یہ کسی کو بھی گوارا نہ تھا۔ اگرچہ پھانسی کے وقت تمام شہر مرکزی چوک میں کھڑا تھا۔ لیکن کوئی بھی قدم آگے نہیں بڑھا پا رہا تھا۔ جب قاضی ایک سرکاری افسر کو کہتا ہے تو افسر کہتا ہے ان کے بیٹے کو پھانسی دینے سے پہلے وہ خود سولی پر کیوں نہ چڑھ جائے۔ جب وقت قریب پہنچا اور کوئی بھی تیار نہ ہوا تو قاضی یحیٰی بن منصور خود آگے بڑھے اور اپنے بیٹے کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔

دوسری طرف ہمارے اس پیارے وطن میں ایک سولہ سالہ طالب علم کو ایک بڑے آدمی کی گاڑی ٹکر مار جاتی ہے۔ دسیوں گواہ بھی ہوتے ہیں۔ اور باقاعدہ پولیس کے سامنے گواہی دیتے ہیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس بدمست نے اپنے گارڈ کے ساتھ مل کر زین نامی طالب علم پر فائرنگ کی تھی۔ کمال کی بات ہے، جب کیس عدالت میں پہنچا تو کیس پوری طرح تیار تھا۔ پولیس نے کیس کو بہت مضبوط بنایا ہوا تھا۔ گواہوں کے بیانات ساتھ لف تھے۔ یہاں تک کہ مجرم کا کہنا تھا کہ پولیس لواحقین کے ساتھ مل کر اسے اور اس کے گارڈ کو اس کیس میں ناحق پھنسا رہی تھی۔ پھر دیر کسی بات کی ہوئی۔ دس ماہ تک جب مقدمہ چلتا رہے، اور گواہان کو ہر بار گواہی کے لیے بلایا جائے، جب کہ وہ صرف گواہی دینے کی وجہ سے اپنے ضروری کام کاج بھی نہ سر انجام دے سکیں تو پھر کون گواہی کے لیے تیار ہو گا۔ اس کے بعد جب ان میں سے بھی کچھ گواہ آخر تک ساتھ نبھانے کی خاطر بھرپور تیاری میں ہوتے ہیں تو اچانک ساری کایا پلٹ جاتی ہے۔ گواہان مکر جاتے ہیں۔ پولیس کا غذات میں کہانی ہی بدل جاتی ہے۔ اور ملزم بلکہ مجرم بری ہو جاتا ہے۔ مجرم نے ہر سطح پر اپنے جرم سے انکار کیا۔ اس کے مطابق زین ان کی فائرنگ سے ہرگز نہیں مارا گیا۔ اگر مجرم کی یہ بات درست مان لی جائے تو پھر فرانزک لیبارٹری کی اس رپورٹ کا کیا کریں گے جس میں گارڈ کی شرٹ پر لگے خون کے داغ کا گروپ زین کے گروپ سے میچ کر گیا۔ گاڑی میں لگے خون کے داغ بھی زین ہی کے تھے۔ اصولی طور پر تو یہ ایک ہی ثبوت کافی تھا۔ جب گواہوں نے پہلی

بار گواہی دی تو وہ گواہی کافی ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن ستم بالائے ستم، ہمارے ملک کا قانون ہے تو بہت مضبوط، لیکن ایک معمولی، انتہائی معمولی نقطے کو پکڑ کر مخالف وکیل پورے کیس کی دھجیاں اڑا لیتا ہے۔ ادھر بھی یہی ہوا۔ عدالت تو مکمل ثبوت مانگتی ہے، جب ثبوت نامکمل تھے، تو ملزم بری ہو گیا۔ آج اس کی ماں کہتی ہے کہ اس نے مجرم کو معاف ہر گز نہیں کیا، لیکن قانونی داؤ پیچ کے سامنے وہ ہار گئی ہے۔

ویڈیو ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ جب ایک مشہور ماڈل ایئرپورٹ پر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ، جس کو ملک کے ایک سابق صدر کا قریبی ساتھی سمجھا جاتا ہے پانچ لاکھ امریکی ڈالر ملک سے باہر لے جاتے ہوئے گرفتار کی گئی۔ جس کسٹم انسپکٹر نے گرفتار کیا، اس نے بہت سے ثبوت پیش کیے۔ جب گواہی دینے کی باری آئی تو شہنشاہ کی طرح اسے بھی دنیا سے رخصت کر دیا گیا۔ چودہ مارچ کو گرفتار ہونے سے لیکر چودہ جولائی ۲۰۱۵ کے چار ماہ تک مختلف حوالوں سے بقول ماڈل کے اس کو تنگ کیا جاتا رہا۔ اس پر مختلف قسم کے دباؤ ڈالے جاتے رہے کہ وہ اپنے جرم کو مان لے۔ اس جرم کو جو اس نے کیا ہی نہیں۔ چار ماہ تک اسے اڈیالہ جیل میں رکھا گیا۔ کیا پاکستانی پولیس یا قانون اتنا ہی اندھا تھا کہ ایک خاتون کو بنا کسی وجہ کے ساری دنیا کے سامنے جیل میں ڈال رکھا ہے اور اس کا قصور ہی کوئی نہیں۔ ماڈل صاحبہ کا کہنا تھا کہ اس پر جیل میں بہت دباؤ ڈالا گیا۔

مختلف حیلے بہانوں سے انجان لوگ اس سے ملنے کے بہانے آتے رہے اور اس کو اپنا جرم ماننے کا کہتے رہے۔ اس کو کال کوٹھڑی میں بھی رکھا گیا۔ کیا یہ سچ ہے؟ جب کہ ہم نے میڈیا پر دیکھا، اخبارات میں پڑھا کہ اس کو تو وہاں پر نیٹ کی، موبائل کی، میک اپ تک کی سہولت موجود تھی۔ کیا سب نہیں دیکھتے تھے کہ وہ جب عدالت میں پیشی پر جاتی تھی تو کس قدر تر و تازہ نظر آتی تھی۔ ہاتھ میں اس کے موبائل ہوتا تھا اور کسی نہ کسی سے باتیں کرتی ہوئی جاتی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ سادہ سا لباس پہن کر عدالت جاتی، اس کا لباس اس وقت بھی اگر لاکھوں روپے کی مالیت کا نہ سہی تو پچاس ساٹھ ہزار سے کیا کم ہوگا۔ باالآخر ضمانت پر اس کو رہا کر دیا گیا۔ شروع میں اسکا نام ای سی ایل میں ڈالا گیا۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ شاید میرے جیسا میڈیا اخبارات سے دور رہنے والے کو کچھ بھی نہیں معلوم۔

حضرت عمر فاروقؓ کا بیٹا شراب پینے کے جرم میں گرفتار ہوا۔ اس پر حد جاری ہوئی۔ خلیفہ وقت نے خود اپنے ہاتھوں سے اس پر کوڑے برسائے۔ کوڑے مارنے کے دوران ہی بیٹے کی روح نکل گئی، لیکن انصاف کا تقاضا پورا کرنا تھا۔ انھوں نے اس کی نعش پر کوڑوں کی تعداد پوری کی۔ جب تک وہ خلیفہ تھے، تب تک ان کے ہاتھ نہیں کانپے۔ جب بیٹے کی نعش گھر لائی گئی، یہ گھر پہنچے تو بیٹے کی نعش کے قریب بیٹھ کر آنسو بہانے لگے۔ پوچھا گیا کہ یہ کیا؟ اس وقت تو چہرہ

پتھر کی طرح سخت تھا اور اب یہ حالت کیوں؟ فرمایا، تب میں اللہ کے حکم کی پاسداری کر رہا تھا۔ اگر میرے ہاتھ بھی لرز جاتے حکمِ خدا کی تکمیل میں تو میدانِ حشر میں خدا کو کیا کیا جواب دیتا۔ اب میں بحیثیت باپ کیا اتنا بھی اختیار نہیں رکھتا کہ افسوس کا اظہار بھی نہ کر سکوں؟ انہی خلیفہ کے دور میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے نے ایک شخص پر اس وقت ظلم کیا جب حضرت ابن العاصؓ گورنر تھے۔ وہ شخص شکایت لے کر خلیفہ کے دربار میں پہنچا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے دونوں باپ بیٹے کو مدینہ بلایا۔ پہلے اس شخص کو اس بیٹے سے بدلہ لینے کو کہا جس کا باپ گورنر تھا۔ جب بدلہ ہو چکا تو حضرت عمر فاروقؓ نے مشہور جملہ ارشاد فرمایا: ۔" اے عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، جب کہ ان کی ماؤں نے انکو آزاد جنا تھا۔" کیا آج کے دور میں کوئی ایسا ہو سکتا ہے جو بنا دیکھے کہ جرم کرنے والا کون ہے، صرف ایک مضبوط ثبوت کی بنا پر مجرم کو شہر کے مرکزی چوک میں پھانسی پر لٹکائے۔ ہے کوئی ایسا انصاف کرنے والا! نہیں ہر گز نہیں! جب تک مدعی کے مقدمے کو اسکے پوتوں تک نہ پہنچایا جائے گا، تب تک وہ مقدمہ کیسے کہلائے گا۔ جب تک گواہوں کو دھمکایا نہ جائے گا، مقدمے کے کاغذات کو ردی میں ڈال کر انگاروں میں سرخا نہ جائے گا، وہ مقدمہ کیسے کہلائے گا۔ اگر پاکستان میں مقدموں کا فیصلہ دنوں اور ہفتوں میں ہونے

لگے تو پھر وکیلوں کا گھر کیسے چلے گا؟ اگر یہ وکیل وقت پر عدالت پہنچیں، اپنے مؤکل کو بر وقت حاضری کا کہیں، لفظوں سے کھیلنے کی بجائے سیدھا سیدھا مقدمہ پیش کریں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جج کو فیصلہ کرنے میں کوئی مشکل پیش آئے۔ یاد نہیں کونسا ملک ہے، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی یا کوئی اور۔ ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک لڑکی کی جب اس کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی، عزت لوٹی گئی۔ اس کو اس وقت سمجھ نہیں آئی تھی کہ اسکے کیا کرنا چاہیے۔ بعد میں بارہ سال بعد جب اس کی شادی ہوئی۔ اس نے اپنے شوہر سے ذکر کیا۔ یہ اگر پاکستانی معاشرہ ہوتا تو شوہر نے اس کو طلاق دینے کی بجائے گولی سے اڑا دینا تھا۔ جب کہ اس غیر مسلم شوہر نے اس کو تسلی دی کہ جو ہو گیا ہوگیا، انکی زندگی میں اس بات کی بنیاد پر کوئی مسلہ نہیں ہوگا۔ پھر وہ شوہر اپنی بیوی کو عدالت لے گیا۔ بارہ سال پہلے والے حادثے کا ذکر کرتے ہوئے انصاف حاصل کرنے کی خاطر مقدمہ دائر کر دیا۔ اگر پاکستان یا ہندوستان ہوتا تو ہمارا قانون ٹائم بار (یعنی بہت وقت گزر چکا ہے، سارے ثبوت مٹ چکے ہیں) کہہ کر کبھی بھی مقدمہ درج نہ کرتا۔ خیر وہاں مقدمہ درج ہوا۔ لڑکی کے ٹیسٹ کیے گئے۔ حیران کن بات ہے کہ بارہ سال پرانے ڈی این کے ٹیسٹ بھی ہوئے۔ جس شخص نے اس کی عزت لوٹی تھی چونکہ لڑکی نے اس کا نام اور پتہ تک دیا تھا، اس کو لایا گیا۔ اس کا ٹیسٹ بھی کیا گیا۔ لڑکی کی غیر موجودگی میں اس سے پوچھا گیا، تو تھوڑی سی تفتیش کے بعد وہ مان گیا کہ اس نے یہ غلطی کی تھی۔ کیا

فیصلہ ہوا؟ وہ لڑکی جیت گئی۔ بارہ سال بعد اس کو انصاف ملا۔ اس شخص کو سزا ہوئی۔ جتنی بھی ہوئی وہ اس ملک کے قانون کے مطابق تھی۔ مقدمہ دائر کرنے سے لی کر فیصلہ ہونے تک صرف دو ہفتے لگے۔

پاکستان میں ہمیں حضرت عمر فاروقؓ جیسے حکمران کی ضرورت ہے۔ ہمیں یحییٰ بن منصور جیسے قاضی کی ضرورت ہے۔ اور ضرورت ہے تو ایسے نظام کی جو ہر پست کو بالا کر دے۔ اور وہ نظام ہے صرف اسلام کا نظام۔ جو اس کو قائم کرے گا، چاہے وہ جناب نواز شریف صاحب ہوں، یا کوئی اور، اللہ کے دربار میں موجود اٹھارہ کروڑ پاکستانی اس کے حق میں گواہی دیں گے۔ وہ گواہی دیں گے کہ اس شخص نے اللہ کے دیے ہوئے پیارے پاکستان میں اس وقت اے اللہ، آپ کے دین پر عمل پیرا ہونے کا اعلان کیا تھا، جب ہر سو، چار سو افرا تفری، بے امنی، دہشتگردی، بے حیائی، اپنے پورے عروج پر تھی۔ تب اس آپ کے بندے نے ہمیں صراطِ مستقیم پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ خود بھی اس راہ کا مسافر ہوا، اور ہمیں بھی اپنی اقتداء میں چلنے کا حکم دیا۔ اے اللہ اس کی مغفرت کیجئے۔

سوچئے کون یہ کامیابی نہ حاصل کرنا چاہے گا؟ ضرور سوچیے۔

مداری کا پٹہ

پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں سے ایک عاجزانہ اور مخلصانہ درخواست ہے کہ اس نام نہاد ڈسپنسر کمپاؤنڈر ڈاکٹر کی کوئی تو تاریخ یعنی ہسٹری ڈھونڈ نکالیں۔ کوئی چھان پھٹک کریں۔ کوئی تانے بانے جوڑیں۔ کوئی خفیہ گرہیں کھولیں۔ کوئی میڈیکل چیک اپ کرائیں، خدارا کچھ تو کریں۔ یہ حکم قرآن " ولا تجسسوا " (اور دوسروں کی ٹوہ میں نہ پڑو)۔ آپ کے لیے ہر گز نہیں ہے۔آپ کے لیے تو حکم ہے " ولا تکتموا الشھادۃ " (اور تم ہر گز گواہی یعنی حق بات نہ چھپاؤ)۔ تو آپ عیاں کریں۔ اس پاکستانی قوم پر احسان کریں۔ اور وہ احسان بھی ایسا کہ ہماری نوجوان نسل زہریلے گڑ سے مرنے سے بچ جائے۔آپ کا یہ احسان نہ صرف نوجوان نسل پر ہوگا بلکہ پوری پاکستانی قوم پر ہوگا۔ خدارا یہ احسان ضرور کریں اور بے شک جتائیں بھی، کوئی حرج نہیں۔پھر جو ثبوت نکلیں کہ یہ انڈیا کی را کا یا اسرائیل کی موساد کا ایجنٹ ہے، یا پھر قادیانی ہے جو مسلمانوں کے بھیس میں مسلمانوں کے دینی جذبات سے کھیل رہا ہے تو اس کو پہلے سنگسار کروائیں پھر اس کی کھال اتروائیں، اور پھر اس کو پھانسی کی سزا دیں، لیکن بیچ چوراہے میں۔

وہ شخص کچھ بھی کہے، کوئی بھی بکواس کرے، اسلام کے احکامات کی شان میں

گستاخی کرکے گستاخیوں کی تاریخ میں ایک اور تاریک ترین باب کا اضافہ کرے لیکن مجال ہے کوئی پوچھے تو سہی۔ ہماری اندھی تقلید کی صفت نے ہمیں " اندھا، بہرا اور گونگا بنا دیا ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی پھر اس کو سنتے ہیں۔ سر دھنتے ہیں۔ اور کہتے ہیں " کہ کیا خوب کہا ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ دین کی چار کتابیں پڑھنے سے کیا کوئی عالم بن جاتا ہے، وہ بھی آن لائن۔ اگر سننے والے کو کوئی کہے کہ مت سنو اس کو، یہ تو کرتب دکھاتا ہے۔ تو کہا جاتا ہے کہ یہ مت دیکھو کون کہہ رہا ہے، یہ سنو کہ کیا کہہ رہا ہے۔ ربیع الاول میں وہ نعتیں سناتا ہے، تو لوگ سر دھنتے ہیں۔ علماء کرام کو سامنے بٹھا کر آف دی ایئر کیمرہ کے سامنے کیا کچھ کہہ جاتا ہے، سارے ثبوت سب کے سامنے ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی لوگ سنتے ہیں۔

دکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے کرامؒ بھی جو علمائے سو ہیں، اس سے کم نہیں ہیں۔ ایک نجی چینل پر ایک مفتی نما عالم بیٹھے ہیں۔ ایک خاتون لہک لہک کر گانا گاتی ہوئی مٹکتی ہوئی ان مفتی صاحب کے پاس آتی ہے، پہلے ہلکے سے ان کو ان کے بازو پر کندھے کے قریب پیار سے مکا مارتی ہے، مفتی صاحب ایک ادا سے مسکراتے ہوئے آداب پیش کرتے ہیں۔ کیا کہنے۔ جس مذہب کی تعلیمات کو پڑھ کر وہ مفتی بنے، اپنے آپ کو عالم کہنے لگے، اس مذہب کی تعلیمات کیا یہ تعلیم دیتی ہیں۔ جب اس نام نہاد عالم کے پروگرام میں آنے والے عالم یا

مفتی ایسے ہوں گے تو اس کو توشہ ملتی ہوگی۔

انٹرنیٹ پر جب اس شخص کی اس طرح کی ویڈیو وائرل ہوئیں یعنی پھیلیں تو کیا بونگی دلیل دی کہ اس کی آواز کی کاپی کی گئی ہے۔ اس نے ہر گز یہ الفاظ ادا نہیں کیے۔ چلیں اگر بفرضِ محال مان لیں اس کی یہ بات، تو کیا اسکا سٹائل بھی کاپی کیا گیا ہوگا؟ یا کسی بندے کو فلمی میک اپ میں بٹھا کر انداز دیا گیا ہوگا۔ ارے بھئی، الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ انسان کے چہرے کے تاثرات بھی بنتے بگڑتے ہیں۔ اور ان ویڈیوز میں صاف دیکھا جا رہا ہے کہ جب ماں بہن کی گالی دی جارہی ہوتی ہے تو آنکھوں میں ہوس کی چنگاریاں کیسے لوٹتی ہیں۔ اس نوجوان عالم نے جب ایک سوال کا جواب دینا شروع کیا کہ بہت نازک مسلہ ہے۔ تو جناب کہنے لگے کمال ہے، کیا نازک نازک لگا رکھا ہے۔ یہاں اس کی عزت لوٹ لی گئی اور تمھیں ناز کی نظر آتی ہے۔ یہ میں نے تھوڑے الفاظ میں ردو بدل کیا ہے، ورنہ ہر کوئی اس ویڈیوں کو یہاں سے دیکھ سکتا ہے۔

https://www.youtube.com/watch?v=VL2RNGiaYLU ۔ خود اندازہ لگایئے کہ علماء کے سامنے بیٹھ کر فلموں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اور علماء بھی چپ چاپ سن رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ انہیں کیا اس کی فکر نہیں تھی کہ انھوں نے اللہ کو جواب دینا ہے۔ بے شک اللہ پاک معاف کرنے والا مہربان ہے، لیکن خوفِ خدا بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ اور جو خدا سے ڈرتا ہے اس کے لیے دو جنتوں کا وعدہ ہے۔ سورۃ الرحمٰن۔ آیت ۴۶۔

یہ شخص جو مداری کی طرح کرتب دکھانے میں بھی ماہر ہے۔ اور دکان کا سامان بیچنے میں بھی۔ لوگ طارق عزیز صاحب کو برا کہتے تھے کہ مال بیچتا ہے۔ ارے وہ تو پھر عوام الناس میں مقابلہ کروا کر کچھ نہ کچھ انعام کے طور پر دیتے تھے، لیکن یہاں تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ انسان کو حقیر سے حقیر تر حرکتیں کرنے پر مجبور کرکے، اس کی عزت نفس مجروح کرکے اس کو انعام دیا جاتا ہے۔ اٹھارہ کروڑ عوام نہ سہی، پانچ کروڑ سہی، اس کے سامنے ایک خاندان سے الٹی سیدھی حرکتیں کروا کر جیسے کیک میں سے رس گلہ یا گلاب جامن ڈھونڈ کر نکالنا، جس سے سارے چہرے پر کیک کی کریم یا چاکلیٹ پھیل جاتی ہے، اس کو انعام سے نوازنا۔ لیکن پانچ شرکاء میں سے ایک کو انعام دینا، باقیوں کی بے عزتی کرنا، کہاں کی شرافت ہے۔ ویسے اس پروگرام کو بہت سے دوسرے چینلز نے بھی کاپی کیا ہے۔

ہماری عوام بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ مداری سے کم نہیں۔ مداری کرتب دکھاتا ہے، کبھی ادھر جاتا ہے کبھی ادھر جاتا ہے۔ لیکن جدھر بھی جاتا ہے، وہاں لڑکیوں کی تعداد ضرور ہوتی ہے۔ مجال ہے جو کبھی جہاں لڑکے جمع ہوں، وہاں گیا ہو۔ مداری ڈگڈگی بجاتا ہے، بندر ناچتا ہے۔ اب آپ جو بھی جس کو سمجھیں۔ آپ کی عقل پر ہے۔ حد ہے نا، کہ ایک طرف عالم کا چوغہ پہنے حضور نبی

کریم ﷺ کی مدح بیان کرتا ہے، اور دوسری طرف اسی رسولِ پاک ﷺ کے دین کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ قرآن کی الحمدللہ سے لے کر والناس تک، اور رسول پاک ﷺ کے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پہلی وحی کی گفتگو سے لے کر آپ ﷺ کے آخری الفاظ تک کہیں سے یہ عالم تو کیا دنیا کا کوئی بھی عالم ثابت کر دے کہ عورتوں کا مردوں کے ساتھ مخلوط محفل سجانا کسی بھی صورت میں جائز تو میں اس کی بیعت کر لوں گا۔
چہ جائیکہ کو خواتین اس طرح بیٹھی ہوں کہ ان کے سر پر دوپٹے نہ ہوں الٹا گلے میں لٹک رہے ہوں، بلکہ آج کل تو وہ بھی غائب ہو گئے ہیں۔ اور جب دوپٹہ کے بارے میں سوال کیا جائے تو استغفر اللہ۔ کیا بکواس بھرا جواب دیا ہے حضرت نے۔ کہتا ہے، " جس کے گلے میں اسلام کا پٹہ ڈلا ہو، اس کو دوپٹے کی کیا ضرورت ہے۔" او خدا کے بندے، تم نے تو دین میں تحریف کر دی۔ تم نے قرآن کے الفاظ کی توہین کر دی۔ تم نے اللہ کے احکامات کو ہی بدل ڈالا۔ "اور یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایت کے بدلے گمراہی خریدتے ہیں۔۔۔۔۔۔البقرہ" ۔ یہ نشانی اللہ نے قرآن مجید فرقانِ حمید میں منافقین کی بتائی ہے۔ تو بتاؤ منافق کون ہوا؟
کفار بھی اس طرح کی حرکات نہیں کرتے، جس طرح کی تم کر رہے ہو۔ یقینا کفار کی چالیں ایسی ہوتی ہیں۔ اگر وہ خود مسلمانوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تو پھر ان میں میر جعفر، میر صادق پیدا کر دیتے ہیں۔ ان میں مرزا ملعون

قادیانی پیدا کر دیتے ہیں۔ جو پہلے مسلمانوں میں اپنا نام پیدا کرتا ہے، اور پھر نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ لیکن یاد رکھو، ایسے لوگوں کی موت بیت الخلاء میں ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ گڑ کی جگہ مٹی کا ڈھیلا کھایا کرتے ہیں کہ اللہ ان کو غبی کر دیتا ہے۔ تم ایک طرف اللہ کے رسول ﷺ کی نعتیں سناتے ہو، لوگوں کو رلاتے ہو۔ لوگ تو عاشق ہیں، دیوانے ہیں، مستانے ہیں۔ ان کو تو اللہ کی، اسکے پیارے رسول ﷺ کی باتیں جو بھی سنائے گا، وہ تو سنتے ہیں۔ سن کر روتے ہیں۔ یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ وہ پکے سچے ہمیشہ کے لیے عاشق کیوں نہیں بن پاتے۔ یہ احساس ان کو رلاتا ہے۔ لیکن تم جو ان کے ساتھ روتے ہو نا، تم مگرمچھ کے آنسو روتے ہو۔ کیونکہ تمھیں ہرگز نہیں معلوم کہ فنا فی اللہ کیا ہوتا ہے اور فنا فی الرسول کا درس کیا ہے؟ جو پوچھنا ہے تو پوچھو سیدنا حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے۔ جو پوچھنا ہے تو پھر پوچھو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں کہ ان کے آنے سے آجاتی ہے منہ پہ رونق۔سب سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے (شاعر سے معذرت کے ساتھ)۔اگر عشق مصطفیٰ ﷺ دیکھنا ہے تو پھر دیکھو حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ کو۔ دیکھو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، جو کہتے ہیں کہ خبردار! اگر کسی نے کہا کہ رسول پاک ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو اسکا سر تن سے جدا کر دوں گا۔ او خدا کے بندے، اپنے گریبان میں جھانکو، عامر لیاقت حسین، نام تو ماں باپ نے بہت خوبصورت رکھا، لیکن تم نے نہ تو حضرت حسینؓ کے نام کی لاج رکھی اور نہ ہی کوئی لیاقت

پائی۔ میرا دل ہرگز نہیں کرتا کہ تمھاری عزت کروں۔ کیونکہ تم نے رسول پاک ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ ان کی دی ہوئی تعلیمات کا مذاق اڑایا ہے۔ توبہ کرو، اس سے پہلے کہ تمھاری توبہ قبول ہونے سے رہ جائے۔******

ضلع مانسہرہ کو کس کی نظر لگی ہے؟ (حصہ اول

ہسپتال ہے، دوائی نہیں۔ گند ہے، صفائی نہیں۔ پانی ہے، نالے کی کٹائی نہیں۔ پی ٹی آئی کی حکومت نے بلند بانگ دعوے کیے، لیکن افسوس، انتہائی افسوس کہ سارے دعوے پشاور تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ یا پھر صرف ان شہروں میں جہاں اکثریتی ووٹ ان کو ملے تھے۔ مانسہرہ سے نون لیگ کے امیدوار منتخب ہوئے تھے، انھوں نے بھی اسلام آباد میں ڈیرہ ڈال لیا۔ جو ایم پی اے ہیں، وہ شاید ہفتہ اتوار کو اپنے گھروں کے چکر لگاتے ہوں، لیکن ان کے حلقے میں انکے گھر کے علاوہ بھی کچھ علاقے آتے ہیں، یہ ان کی یاداشت سے عرصہ پانچ سال کے لیے محو ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ اب ہم ان کے لیے شودر ہو چکے ہیں۔ وہ بڑی گاڑیوں میں، فل پروٹوکول کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لازمی نہیں کہ پروٹوکول میں گاڑیاں بھی شامل ہوں، لیکن ان کے ارد گرد مکھن فروش افراد کا ایک جمگھٹا لگا رہتا ہے تو ہم جیسے عام سادہ لوح لوگ اس مکھن کی وجہ سے پہلے سے ہی پھسل کر نیچے گر پڑتے ہیں۔ جس طرح کی گاڑیوں میں وہ سفر کرتے ہیں ان میں دھچکے تو لگتے نہیں۔ تو ان کو کیسے علم ہو گا کہ گڑھی روڈ سے جاتے ہوئے ناظم کے دفتر تک کیسے کیسے دھچکے لگتے ہیں۔

وہ مانسہرہ کی ڈسٹرکٹ ہسپتال سے علاج کروائیں تو پتہ چلے کہ جب ایک وقت میں

ایمرجنسی میں پچاس مریض کھڑے ہوں، اور ایک یا دو ڈاکٹر ہوں تو مریضوں پر کیا گزرتی ہے۔ پچاس مریضوں میں سے اگر بہت کم بھی ہوئے تو بیس کے قریب واقعی میں ایمرجنسی والے ہوں گے۔ ایمرجنسی کا مطلب ایکسیڈنٹ میں ہی زخمی ہو کر آنا نہیں ہوتا۔ کسی درد کی حالت میں بھی ایمرجنسی ہو سکتی ہے۔ جس کو وہ برداشت نہ کر کے اور بے ہوش ہو جائے۔ لیکن ہمارے اس اکلوتے ہسپتال میں اوپی ڈی کے دوران ایک سیکشن میں دو یا تین ڈاکٹر ہوتے ہیں وہ بھی مریض کو ایک منٹ سے کم وقت میں چیک کر کے فارغ کر دیتے ہیں۔ ساتھ میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور مریض بھی چیک ہو رہا ہوتا ہے۔ تو کیا خاک چیک ہو گا؟ کبھی بھی مریض کو تفصیل سے نہیں چیک کیا۔ اگر کوئی مریض بتاتا ہے کہ اس کو بخار ہے تو ڈاکٹر نے ہمیشہ اس کو بخار کی دوائی دی۔ کبھی اس کی تہہ تک نہیں پہنچے کہ بخار کی وجہ کیا ہے؟ ہاضمہ خراب ہے، گلہ خراب ہے، الرجی ہے یا کوئی اور وجہ؟ اگر مریض تھوڑا سا اصرار کر بیٹھے تو اس کو ٹیسٹ لکھ دیا جاتا ہے۔

ٹیسٹ کی بات آئی تو ہسپتال کی لیبارٹی میں گنے چنے شاید دس سے پندرہ ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ یا بیس کہہ دیں۔ ایک ضلع کی ہسپتال ہو، اور کافی بڑی ہسپتال ہو۔ اس میں ٹیسٹ کی یہ صورت حال ہو۔ بہت کم مریض ایسے ہوتے ہیں جو ہسپتال کی لیبارٹری سے ٹیسٹ کرواتے ہوں گے۔ کیونکہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں لیب میں

ڈاکٹر تو کوئی نہیں البتہ جو اٹینڈنٹ موجود ہوتا ہے وہ ایک ٹیسٹ لگا کر اگلے مریض کے لیے آدھ گھنٹے کا انتظار لگا دیتا ہے۔یوں آٹھ گھنٹے میں صرف خون کے زیادہ سے زیادہ سولہ سے بیس ٹیسٹ ہی ممکن ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اور ٹیسٹس کی بھی صورتحال ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ہسپتال میں کیے گئے ٹیسٹ اب تک تو سارے نتائج بہت اچھے آتے تھے، کافی دنوں سے جانا نہیں ہوا، تو اب کا اپ ڈیٹ علم نہیں۔ پھر مریض ٹیسٹ کا یہ نتیجہ لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس پھر ایک لمبی قطار لگی ہوتی ہے۔ وہی مریض جس نے پہلے ایک گھنٹہ انتظار کرکے اپنا چیک اپ کروایا تھا، اب بھی اس کو دوبارہ ٹیسٹ چیک کروانے میں اور نسخہ لکھوانے میں آدھا گھنٹہ تو لگ ہی جاتا ہے۔ اور ڈاکٹر دوائی بھی وہ لکھتا ہے جو دو تین دن پہلے کوئی نہ کوئی فارماسیوٹکل کمپنی کا نمائندہ بتا کر گیا ہوتا ہے، اس وعدے کے ساتھ کہ اگر ڈاکٹر صرف تین عدد کاٹن بھی بکوادے گا تو ایک عدد چھوٹی مہران گاڑی اگلے دن اس ڈاکٹر کے گھر کے باہر کھڑی ہو گی۔ لازمی نہیں کہ مہران گاڑی ہی ہو، اور بھی کئی مراعات ہو سکتی ہیں۔ اب معدے کی ایک دوائی ہے میپرازول۔ مختلف ناموں سے مختلف قیمت لگی مختلف کمپنیوں کی پیکنگ میں آتی ہے۔ایک کمپنی کی چودہ ٹیبلٹس یا کیپسول کی پیکنگ ایک سو چالیس روپے تو دوسری کمپنی کی وہی دوائی پانچ سو روپے کی۔ ڈاکٹر کبھی بھی مریض کی معاشی حالت پر غور نہیں کرتا۔ اور پانچ سو روپے والی دوائی لکھ کر دے دے گا۔

بے چارے مریض کو کیا علم کہ اسی فارمولے کی دوسری دوائی بھی میسر ہے۔ سونے پہ سہاگہ، ہمارے کیمسٹ دکاندار حضرات بھی کبھی مریض کی طرف داری نہیں کرتے۔ کبھی مریض کو نہیں کہتے کہ پانچ سوالی دوائی کی جگہ ایک سو چالیس روپے والی دوائی کا بھی وہی اثر ہے۔ لیکن ایک سو چالیس میں کیمسٹ کو بیس روپے بچتے ہیں تو پانچ سو والی میں سو روپے۔ وہ کیوں ایک سو چالیس والی دوائی دے گا۔ میرا ایک کزن کچھ عرصہ پہلے ڈرگز کنٹرول ایڈمنسٹریشن کے ادارے میں جاب کرتا تھا۔ اسکا کہنا ہے کہ ڈرگز والے ہمیں خود بتاتے کہ پاکستان میں چونکہ اکثر دوائیں امپورٹ ہوتی ہیں تو امپورٹ شدہ دوائی کی قیمت در حقیقت فروخت کردہ قیمت سے پانچ سو سے آٹھ سو گناہ تک کم ہوتی ہے۔ بے شک آپ اس میں پیکنگ کی قیمت لگالیں، دو تین بار کا کرایہ لگالیں، کمپنی کے نمائندہ کی تنخواہ فی کیپسول لگالیں، لیکن پھر بھی اصل قیمت بہت ہی زیادہ کم ہوتی ہے۔ اس نے مثال دی ایک دوائی کی (نام مجھے یاد نہیں رہا)۔ اس نے کہا کہ دس کیپسولوں میں جتنا مواد ہوتا ہے اس کی کل درآمدی قیمت بیس روپے بنتی ہے۔ دکاندار تک پہنچے تک جس میں مختلف اخراجات شامل کر لیں، مزدور کی مزدوری، بجلی گیس پانی کا بل، فیکٹری کا کرایہ، مالک کی آمدنی، اور دیگر متفرق اخراجات، تب بھی اس دس کیپسول والی ڈبی کی حد قیمت ساٹھ روپے سے زیادہ نہیں جاتی۔ لیکن جب دکاندار آپ کو وہ ڈبی دیتا ہے تو ڈبی پر قیمت تین سو ساٹھ روپے لکھی ہوتی

ہے۔اب بتائیں کہ ساٹھ روپے کی ڈبی کی قیمت جب تین سو ساٹھ روپے ہو گی تو ڈاکٹر کا حصہ بھی تو لازمی ہو گا۔

کیا اس شہر مانسہرہ کے عوامی نمائندے (دس فیصد عوام کے) یہ حق نہیں رکھتے کہ مریضوں کو اس نازک صورتحال سے بچائیں۔ ہپتال کی صورتحال کو باقاعدہ اس طرح منظم کریں کہ ڈاکٹروں کی بھی ایک اچھی تعداد موجود ہو۔ مریضوں کو باقاعدہ تسلی سے چیک کرے۔ ہپتال میں ہر سہولت میسر ہو۔ یقین کریں کہ مریضوں کے لیے جو بستر موجود ہیں ان کی صورت حال سے کون واقف نہیں۔ ہاں نہیں واقف تو یہ نمائندے اس وقت واقف نہیں۔ کیونکہ ان کو یہاں کبھی علاج جو نہیں کروانا ہوتا۔ وہ تو کم سے کم اسلام آباد کی ہپتالوں میں علاج کروانے جاتے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ ایم این اے یا ایم پی نہ ہوتے ہوئے بھی باہر کی سیر کرنے جاتے ہیں اور علاج امریکہ کے ہپتال میں کرواتے ہیں۔ کیونکہ اپنے پانچ سالہ دورِ حکومت میں پاکستان کے کسی بھی ہپتال کو اس قابل نہیں بنایا کہ یہاں پر اپنا فشارِ خون ہی چیک کرواسکیں۔ بستروں کی صورت حال ایسی ہوتی ہے کہ وہ رسیوں سے بندھے ہوتے ہیں۔ اگر اتفاق سے مریض کے ساتھ بستر پر کوئی تیماردار لمحہ بھر کو اٹک جائے تو مریض اور تیماردار نیچے اور بستر ان کے اوپر ہوتا ہے۔ صفائی کا انتظام انتہائی اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ بے شک قصور عوام کا ہوتا ہے کہ وہ بنا یہ دیکھے کہ ہپتال میں کھڑے ہیں، جھٹ سے منہ

سے نسوار نکالی اور ایک کونے کا نشانہ لیتے ہوئے پھینک دی۔ پھر چلتے چلتے ایک دیوار پر دو تین بار تھوک دیا۔ واش رومز کی حالت تو ایسی ہے کہ بندہ جائے تو کدھر جائے۔

پہلے تو ناک منہ کو اچھی طرح ڈھانپ کر گھسا جاتا ہے اور ساتھ میں پھر واش روم میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ دنوں تو کیا، ہفتوں ہفتوں صفائی والا واش روم کا چکر نہیں لگاتا۔ ٹوٹے ہوئے سینک میں پانی نہیں آتا۔ جتنا قصور عوام کا ہے، اتنا ہی قصور صفائی کا ہے۔ اگر ہسپتال کو پہلے دن سے ہی وہ ستھرا رکھتے، کسی اچھے ہسپتال کی طرح ہر وقت ایک جگہ پر تین چار صفائی والے موجود ہوں تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی گند کرے۔ کیونکہ انہیں پھر یہ احساس لازمی ہوگا کہ اگر گندہ کیا تو خود کی یا ساتھ موجود مریض کی بیماری میں اضافہ ہی ہوگا۔

سرکاری ہسپتال ہے، کوئی بھنگڑ خانہ نہیں۔ پیار سے ہر کام نکالا جا سکتا ہے۔ اگر اساتذہ کا ریفرشر کورس کروایا جا سکتا ہے تو ہسپتال میں ڈاکٹرز سمیت دیگر ملازمین کی اچھی تعداد تعینات کرکے ان کو سکھایا جا سکتا ہے کہ ہر مریض کو، تیمار دار کو اچھی طرح سمجھائیں کہ ان کا فائدہ کیا ہے؟ ایک مریض کے ساتھ دو سے زیادہ تیماردار نہ ہوں۔ ایک باہر جو دوائی وغیرہ لا سکے (اگرچہ پی ٹی آئی حکومت کا اعلان تھا کہ ہسپتالوں میں مفت دوائی فراہم کی جائے گی۔ لیکن سوائے درد کے ایک دو انجکشنز کے کچھ بھی نہیں ملتا، یا مشکل

سے ایک دوا اور انجکشنز ملتے ہوں۔ دوائی تو ہرگز نہیں دستیاب) ، دوسرا مریض کے ساتھ اندر۔ تاکہ بوقتِ ضرورت ڈاکٹر تک کوئی لیبارٹری ٹیسٹ کروانا ہو، ساتھ رہ سکے۔ آج تک شاید ہی محکمہ صحت کے کسی نمائندہ نے ہسپتال کا چکر لگایا ہو۔ اگر لگایا بھی ہو گا تو چائے پی، سموسے کھائے اور چل دیے۔ مریضوں سے یا تیمارداروں سے یقینا پوچھا ہو گا کہ کیا صورتحال ہے، بہتری لانے کا وعدہ کر کے چل دیے۔ اور ابھی تک چل رہے ہیں۔

عوام الناس بھی تو قصور وار ہیں۔ جب ان کو سہولیات نہیں ملتیں تو ان کا رویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ کم وسائل کو وہ صرف اپنی جاگیر سمجھ کر استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہمارا دین بہت پیارا دین ہے۔ وہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے جیو۔ اللہ پاک آپ کی زندگی میں خیر و عافیت والی برکت ڈالے گا۔ آپ اگر کسی کی مدد اپنی مشکل وقت میں کریں گے تو اللہ پاک یقینا آپ کی مدد اس وقت کرے گا جب آپ کو یہ یقین ہو گا کہ اب آپ کا مددگار کوئی نہیں، یہاں تک کوئی کوئی رشتہ دار، دوست احباب بھی نہیں۔ جب تحمل کا مادہ پیدا کرتے ہوئے آپ دوسروں کو ترجیح دیں گے تو یقین رکھیں کہ اللہ پاک آپ کے لیے وہ وسیلہ پیدا فرمائے گا کہ آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ اللہ پر یقین کامل رکھیں۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

اللہ پاک قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں۔ "اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور تمھیں شعور نہیں۔" اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اللہ کے ہاں سے رزق کھاتے ہیں۔ پھر اس کی تشریح یا تفسیر میں فرمایا گیا کہ ان لوگوں کو شہید کہا جاتا ہے۔ شہید کا درجہ اس آیات میں بیان ہوا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو بھی اللہ کی راہ میں دین کی خاطر، مسلمان ہوتے ہوئے اپنے وطن کی خاطر لڑا اور شہادت پائی، اس کو دنیا ہمیشہ ہی اچھے الفاظ سے یاد کرتی ہے۔جب کبھی دین پر یا وطن پر مشکل وقت آیا تو ان شہیدوں کو لازمی یاد کیا گیا کہ آج ان ہی کی وجہ سے اللہ پاک نے یہ دین اس وطن میں قائم و دائم رکھا ہوا ہے۔ بے شک اللہ پاک چاہتا تو بنا کسی بندے کے دین کو قائم رکھتا، لیکن بندوں کو مختلف درجات بھی تو دینے تھے، تو ایک درجہ شہید کا تخلیق کیا گیا۔

۲۳ جون ۲۰۱۵ کو شام پانچ بج کر پچاس منٹ پر ۵۲ میڈیکل رجمنٹ کے لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل بمعہ اپنے سات ساتھیوں کے ایڈوانس پوزیشنز سے اپنے ماتحت خدا کے شیر سپاہیوں کا حوصلہ بلند کرنے کے بعد واپس آ رہے تھے۔ ان کا ارادہ کچھ دیر آرام کرنے کا تھا۔ کیونکہ گزشتہ تین دن اور تین راتوں سے

انہوں نے آرام کی غرض سے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ان تین دن راتوں میں وہ مسلسل دہشت گردوں کی ایک بڑی جماعت سے نبرد آزما تھے۔ جنھوں نے ان کے کیمپ پر حملہ کیا تھا۔ وہ دہشت گردوں کو اپنے سپاہیوں کے ساتھ اللہ کی مدد سے پیچھے دھکیلتے ہوئے کافی پیچھے لے گئے تھے۔اس وقت لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل کے ساتھ بمشکل آٹھ جوان تھے۔جب کہ دہشت گرد کوئی تیس کے قریب تھے۔ لیکن جب اللہ کی مدد شامل حال ہو تو فتح مقدر ہوتی ہے۔ اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح قریب ہو گئی (القرآن)۔ تو اللہ کی مدد سے انھوں نے ان دہشت گردوں کا حملہ پسپا کر دیا۔ اور جوابی کاروائی اتنی شدت سے کی کہ دہشت گرد الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ پھر لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل نے اپنے مزید ساتھیوں کے ساتھ اپنے کیمپ اور دیگر علاقے کے ارد گرد مختلف مشاہداتی پوسٹس قائم کیں۔ انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ یہ والا حملہ صرف ابتدا تھی، ابھی ایک اور حملہ ہونے والا ہے جو کافی بڑا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ پاکستان کے فوجی جوانوں نے ضربِ عضب کے دوران دہشت گردوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ان دہشت گردوں کو جن کی زیادہ تعداد پاکستانی قومیت کی نہیں تھی پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل اپنے جوانوں کے ساتھ جس جگہ قائم تھے، وہ دہشت گردوں کے لیے بہت اہم تھی۔ اس کو واپس اپنے قبضہ میں لینے کے لیے

انھوں نے ایک بڑا حملہ کیا۔ اس وقت لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل نے اپنے ساتھیوں کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑا، بلکہ اگلے محاذ پر ان کے ساتھ دشمن کا سامنا کرتے رہے۔ دشمن بھی وقفے وقفے سے فائر کرتا رہا۔ کبھی مارٹر گنوں کا فائر ہوتا تو کبھی بم پھینکے جاتے۔ اور کبھی میزائل گنوں سے میزائل گرائے جاتے۔ فوجی جوان بھی زخمی ہو رہے تھے تو کچھ نے اپنے رب کے حضور حاضری بھی دے دی تھی۔ یہاں تو تعداد کم تھی کہ یہ اللہ کے شیر سپاہی تھے اور باقاعدہ بہترین طریقے سے تربیت یافتہ تھے۔ دوسرا اللہ کی راہ میں اپنے دین و وطن کی سربلندی کے لیے لڑ رہے تھے، نہ کہ دشمنوں کے بہکاوے میں آکر اپنے وطن سے غداری کر رہے تھے۔جب کہ دوسری طرف دہشت گردوں کو جانی نقصان زیادہ پہنچ رہا تھا۔ اسلیے وہ ایک دم سے بھرپور حملہ کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل اور ان کے جوانوں کو چاروں طرف سے گھیر سکے۔ لیکن لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل کا ایک پاؤں اگر اپنے ایریا میں شمال میں تھا تو دوسرے گھنٹے میں وہ فوراً جنوب میں پہنچ جاتے تھے اور ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔

تین دن لگاتار دشمنوں کے ساتھ فائرنگ کے تبادلے کے بعد باالآخر دہشتگردوں کو لاشوں کی ایک بڑی تعداد چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ اس کے بعد بھی کافی دیر تک پاک فوج کے جوان اپنی اپنی ان پوزیشنز پر جمے رہے، جہاں تک انھوں نے

قبضہ کیا تھا۔ پھر لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل نے تازہ دم جوان طلب کئے۔ یہ پوزیشنز ان کے حوالے کیں۔ ان کا حوصلہ بڑھایا۔ اور خود اپنے کیمپ کی جانب چل پڑے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ وہاں موجود دہشتگردوں کی کمر توڑ دی تھی۔ اب اکا دکا واقعات ہو رہے تھے۔ کیونکہ دشمن اس وقت ختم ہو گا، جب اللہ کی رضا ہو گی۔ ورنہ تو تا قیامت حق و باطل کی لڑائی جاری رہے گی۔

تئیس جون ۲۰۱۵ کو انہیں کیا معلوم تھا کہ اس بار ان کی واپسی اب کیمپ میں نہیں بلکہ اللہ کی جانب ہے۔ واپسی پر آتے ہوئے اپنی جیپ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک حوالدار بیٹھا تھا۔ جب کہ پانچ جوان ان کے ساتھ پیچھے بیٹھے تھے۔ جب وہ اپنے کیمپ کے راستے میں تھے تو اچانک ان کی جیپ ایک بارودی سرنگ کے اوپر آ گئی۔ بارودی سرنگ پھٹی اور جیپ کئی فٹ اوپر فضا میں اچھلی۔ جب واپس گری تو لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل اس میں سے نیچے گرے۔ جیپ کا ایک حصہ ان کی ایک ٹانگ کو زخمی کرتے ہوئے وہی پر جام ہو گیا۔ ان کو چھاتی پر بھی زخم آئے۔ ان کے ساتھ دوسرے ساتھ فوجی بھی زخمی ہوئے، جبکہ ایک جوان موقع پر ہی شہید ہو گیا۔ لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل کو فوری طور پر ہاسپٹل پہنچایا گیا۔ لیکن وہاں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وہ انا الیہ راجعون۔

۲۴ جون ۲۰۱۵ کو انہیں ان کے آبائی شہر ملتان میں دفن کیا گیا۔ان کا تعلق ایک دین دار گھرانے سے تھا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی سے انھوں نے اپریل ۱۹۹۷ میں پاسنگ آؤٹ کے بعد پاکستان آرمی میں شمولیت اختیار کی۔تب سے مختلف شہروں میں ، مختلف مقامات پر اپنے فرائض بہ احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے۔ پی۔ ایم۔ اے میں دورانِ تربیت بھی وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہر وقت تعاون پر آمادہ رہتے تھے۔ پی ایم اے کی ایک خاصیت ہے کہ وہاں جو ساتھی ایک پلاٹون میں ہوتے ہیں وہ مرتے دم تک ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ رابطے میں رہتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے ایک ساتھ خوشیاں بھی دیکھی ہوتی ہیں اور مشکلات اور تکالیف کے دور بھی اکٹھے ہی گزرے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے، پھر باہنوں میں ہاتھ ڈالتے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل پی ایم اے میں بھی نعت خوانی کرتے تھے ۔ اللہ کا ذکر کرنا بھی ان کا مشغلہ تھا۔ ان کے ایک ساتھی کہتے ہیں کہ شہادت سے پہلے وہ جیپ کے ڈرائیور کے ساتھ نہیں بیٹھے تھے۔ بلکہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ان کو یاد آیا کہ انھوں نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی۔ اگر تھوڑی دیر لیٹ کرتے تو قضا ہو جاتی۔ جیپ کو روک کر باہر پڑھ نہیں سکتے تھے کہ ہر وقت دشمن کے حملے کا خطرہ تھا، اور اس طرح باہر پڑھنے میں گویا خودکشی کرنا تھا۔ تو لیفٹننٹ کرنل افتخار احمد جمیل پچھلی سیٹ پر ہی نماز پڑھنے لگے۔ اور گاڑی چلتی رہی۔ نماز سے فارغ ہو کر اللہ کا ذکر شروع کر دیا۔ جس وقت بارودی سرنگ کا

دھماکہ ہوا اس وقت بھی ان کے ہونٹ ہل رہے تھے ، گویا اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ تعلیمی کیریئر میں بھی وہ بہت بہتر تھے۔ جسمانی تربیت میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اڑھائی سال انھوں نے پی ایم اے میں گزارے اور بہت خوب گزارے۔ ان کے ساتھ جتنے بھی ساتھی تھے، آج بھی ان کو بہت اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ اللہ پاک ان کی شہادت کو قبول فرمائے، اور اس شہادت کے صدقے پاکستان کی حفاظت فرمائے، آمین۔

****

دہشت گرد کون؟

کمال کا سوشل میڈیا ہے۔ حکومت نے اعلان کیا یا نہیں کیا، لیکن سوشل میڈیا پر دہشت گردوں کی پہچان کے بارے میں کچھ جملے یوں وائرل ہوئے جیسے گھر گھر کسی کے گھر کے اجڑنے کی خبر پھیلتی ہے۔ میں وہ پہچان پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ شاید ہر دوسرا نہیں تو تیسرا مسلمان ان نشانیوں پر سو فیصد پورا اترتا ہے، تو کیا ڈیڑھ بلین سے زیادہ مسلمانوں میں سے ایک تہائی مسلمان دہشت گرد ہیں؟ افسوس ہوا اور بہت افسوس ہوا اس سوشل میڈیا پر، خاص طور اس کے شیئر کرنے والے پر۔ اور پھر سونے پہ سہاگہ والی بات کہ بنا سوچے سمجھے اس کو ہر دوسرا تیسرا فرد شیئر کرنے لگ گیا۔ کسی نے نہیں سوچا کہ یہود، ہنود یا قادیانی سازش ہو سکتی ہے؟ کسی نے غور نہیں کیا کہ سب سے زیادہ دہشت گردی کون کر رہا ہے۔ ان کی کوئی نشانی بھی نہیں۔ کیونکہ ان کی نشانی بتانا کارِ سرکار میں مداخلت ہوگی۔ شام میں معصوم مسلمانوں پر دن رات بم برسائے جا رہے ہیں، انہیں گولیوں سے اڑیا جا رہا ہے، اور کہا جا رہا ہے کہ یہ دہشت گردی مسلمان کر رہے ہیں۔ نائیجیریا میں ایک تنظیم بوکو حرام نے تباہی مچا کر رکھی ہوئی ہے جو بظاہر مسلمان نظر آتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ دہشت گرد مسلمان ہیں۔ اگر بوکو حرام مسلمان ہوتی تو کیا مسلمانوں کو نشانہ بناتی۔ داعش نے ایک مسجد پر خودکش حملہ کروایا۔ ان سے

پوچھا گیا کہ مسجد ہی کیوں؟ جواب تھا کہ ہم نے مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا بلکہ وہاں غیر مسلم سیاح آتے تھے ان پر حملہ کیا۔ کمال کی بات ہے۔ اسی مسجد سے پانچ سو میٹر کے فاصلے پر ایک عدد سابقہ چرچ اور موجودہ سیاحت کا مقام ہے، جہاں سیاحوں کا رش لگا رہتا ہے۔اس مسجد کی دوسری طرف پر ایک عدد کلب بنا ہوا ہے، جس میں سیاحوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس مسجد سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے کے اندر ایک عدد قحبہ خانہ بنا ہوا ہے، وہاں اگر سیاح نہیں ہوں گے تو کون آئیں گے۔ لیکن داعش کو مسجد ہی نظر آئی سیاحوں کو اڑانے کے لیے۔اور پھر وہ کہتے ہیں کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔نشانیاں کیا تھیں؟ آپ بھی پڑھ لیں۔ وہ دہشت گرد سترہ سے بیس سال کی عمر کا ہوگا۔ اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے ہوں گے۔ اسکا رنگ زردی مائل ہوگا۔ اس کے ہاتھ اس کے جسم سے فاصلے پر ہوں گے۔ اس کی داڑھی ہوگی۔ہے نا افسوس کا مقام۔

ہر اچھے گھر میں جہاں بے شک مومنانہ صفات کے والدین نہ رہتے ہوں لیکن مسلمان ہوں، نماز روزہ حج زکوٰۃ کی پابندی ہو۔ دین کے دیگر احکامات کی بھی پابندی کی جاتی ہو۔ بے شک دنیادار ہوں تو اس گھر میں جو سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان ہوگا اس کو ذکر کی عادت ہوگی۔ تو ذکر تو چیز ہی ایسی ہے کہ بندہ اٹھتے بیٹھتے کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ بے شک اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے دائیں کروٹ یا بائیں کروٹ اللہ کا ذکر کیا کرو۔ اور

یہ تذکرہ ہے ایمان والوں کا۔ تو جو اللہ کا بندہ پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھے، رمضان المبارک کے روزے تواتر کے ساتھ اور اچھی طرح سے رکھے۔ اڑھائی فیصد زکوۃ باقاعدگی سے ادا کرے اور جب استطاعت ہو تو حج بیت اللہ ادا کرے۔ جب کوئی یہ سب کرے گا تو اللہ کا ذکر کیسے نہ کرے گا۔ ایسے گھرانے میں پیدا ہونے والے افراد بھی ظاہر ہے اسلامی تعلیمات کے پابند ہی ہوں گے۔ تو کوئی بتائے کہ وہ نوجوان سترہ اٹھارہ سال کا کیا دہشت گرد ہو گا۔ واہ! کیا معیار ہے دہشت گرد کی پہچان کا۔ جب ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔ یا پھر کہا گیا کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو سکون دو۔ تو ذکر کرنے والا باآواز بلند ذکر تو کسی محفل میں ہی کر سکتا ہے جہاں سب ذکر کر رہے ہوں۔ انفرادی حیثیت میں تو وہ ذکر خاموشی سے ہی کرے گا۔ ذکر کرتے ہوئے ہونٹ تو ہلتے ہی ہیں۔ تو پھر یہ کون ہوتے ہیں ذکر کرنے والوں کو دہشت گرد کہنے والے؟

جس طرح صحت اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی طرح بیماری بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ خدانخواستہ بندہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا خون نکلتا ہے۔ علاج کرانے پر لازمی تو نہیں کہ اس کو اسی طرح کی صحت و تندرستی اسی طرح سے ایک دم مل جائے جیسے وہ حادثہ سے پہلے تھا۔ تو کیا خیال ہے اس کے چہرے کی رنگت زردی مائل نہ ہو گی۔ وہی بندہ جو اللہ کا ذکر بھی کرتا ہے بنا کسی حادثے کے

بھی کسی وجہ سے زردی مائل ہو سکتا ہے، تو کیا خیال ہے وہ دہشت گرد ہو گا۔ کیا کیا باتیں لوگوں کے ذہنوں میں آتی ہیں۔ ان لوگوں کے ذہنوں میں جو فارغ بیٹھے ہوتے ہیں۔ کیونکہ خالی دماغ کو شیطان کا کارخانہ کہا گیا ہے۔ اور شیطان کے کارخانے میں بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے تو کچھ بھی نہیں۔ سراسر شر ہی شر ہے۔ تو یہ شیطان ہی تو ہے جو انسان کو دینِ حق کی راہ سے بھٹکا کر کبھی خود کش دھماکے کرواتا ہے، چاہے وہ دشمنانِ اسلام کو مارنے کے لیے ہی کیوں نہ ہوں۔ غزوۂ احد میں ایک شخص مسلمانوں کی طرف سے لڑتے ہوئے شدید زخمی ہو گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس کی بہت تعریف کی۔ تو اللہ کے حکم سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص جہنمی ہے۔ صحابہ کرامؓ بڑے پریشان بھی ہوئے اور حیران بھی۔ دوڑے دوڑے اس مقام پر پہنچے جہاں وہ زخمی شخص پڑا تھا۔ دیکھا تو اس نے اپنی ایک رگ کو اپنے ہی ہاتھ سے کاٹ لیا اور یوں وہ فوت ہو گیا۔ اگر ایک شخص باوجود مسلمانوں کی طرف سے لڑنے کے، جب جنگ ختم بھی ہو چکی ہے اپنے آپ کو مار کر جہنم کا حقدار بنا لیتا ہے تو پھر یہ خود کش حملہ آور کیسے جنتی ہوں گے۔ جو رسول پاک ﷺ کے واضح احکامات کے باوجود بچوں کو، بوڑھوں کو، خواتین کو ہلاک کرنے میں پیش پیش ہوں گے۔ جو اس جگہ جا کر خود کو دھماکے سے اڑائیں گے جہاں پر لوگ اللہ کے ذکر میں مصروف ہوں گے۔ تو اللہ کے ذکر سے روکنے والوں کو جہنم کی خبر سنائی گئی ہے نہ کہ جنت کی۔

اب بات ہو جائے داڑھی کی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ تک کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام آئے۔ سب کا چہرہ مبارک داڑھی سے مزیّن تھا۔ سب کے جو جو ساتھی تھے، سب کی داڑھی تھی۔ اب بات آتی ہے قرونِ آخر کے لوگوں کی۔ تو جو لوگ رسول پاک ﷺ کی تعلیمات کو اپناتے ہیں یا ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا دل کرتا ہے کہ ان کا چہرہ بھی داڑھی سے مزین ہو۔ چاہے چھوٹی ہو یا بڑی۔ ایک مشت ہو یا ایک بالشت۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن چہرے پر داڑھی ہونا تو سنتِ رسول ﷺ ہے۔ پچھلے دنوں تاجکستان میں دینی شعائر میں سے تین پر پابندی لگائی گئی۔ جن میں حج، حجاب اور داڑھی شامل ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ حکمران کس کے حکم کی پیروی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اللہ کے دربار میں ان کے اعمال جب تولے جائیں گے تو جن جن کی داڑھیاں زبردستی منڈوائی گئیں، وہ اللہ سے کہیں گے کہ انھوں نے تو اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے اپنے چہرے کو سجایا تھا۔ اس بدبخت نے ان کے چہرے کو اتنا خراب کر دیا کہ وہ آج قیامت کے دن رسول پاک ﷺ کو چہرہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔
داڑھی تو شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ فرض ہے، واجب ہے یا سنت۔ یہ علمائے حق جانیں، مفتیان کرام جانیں۔ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ رسول پاک ﷺ نے اپنے چہرہ انور پر سجائی تھی۔ تو میں اسکا ادنی امتی ہونے کے ناطے اپنے چہرے پر کیوں نہ سجاؤں۔
تو کیا ہر داڑھی رکھنے والا

دہشت گرد ہوگا؟ ساتھ میں اگر وہ اللہ کا ذکر بھی کر رہا ہو، اور اسکی صحت بھی کمزور ہو کہ اس کی رنگت زردی مائل بھی ہو اور بدقسمتی سے اس کی عمر بھی سترہ سے بیس سال کے درمیان ہو۔

ہرگز نہیں۔ دہشت گردی مسلمان ہرگز نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کے غدار ہیں۔ جنہیں احادیث میں خوارج کہا گیا ہے۔ ''وہ کم سن لڑکے ہوں گے'' ۔ ''دماغی طور پر ناپختہ ہوں گے'' ۔ ''گھنی داڑھی رکھیں گے''۔ ''ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا''۔ ''وہ عبادت اور دین میں بہت متشدد اور انتہا پسند ہوں گے''۔ ''وہ لوگوں کو قرآن کی طرف بلائیں گے لیکن قرآن کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہو گا''۔ '' وہ بظاہر بڑی اچھی باتیں کریں گے ''۔ ''ان کے نعرے اور ظاہری باتیں دوسرے لوگوں سے اچھی ہوں گی اور متاثر کرنے والی ہوں گی''۔ ''مگر وہ کردار کے لحاظ سے بڑے ظالم، خونخوار اور گھناؤنے لوگ ہوں گے''۔ وہ حکومت وقت یا حکمرانوں کے خلاف خوب طعنہ زنی کریں گے اور ان پر ضلالت و گمراہی کا فتویٰ لگائیں گے ''۔ '' وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے ''۔ ''وہ ناحق خون بہائیں گے۔''۔۔ یہ چند معمولی سی نشانیاں میں نے لکھیں۔ احادیث میں تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ تو بتائے پھر دہشت گرد کون ہوا؟ ہر تیسرا مسلمان یا یہ لوگ حدیث کے مطابق تمام مخلوق میں سے بدترین لوگ ہیں؟

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا جذباتی پیروکار

کعب بن اشرف ایک یہودی نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتا تھا اور قریش کو مسلمانوں کے خلاف ابھارتا تھا۔ یہ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور انکے واسطے سے اللہ کو اذیت دیتا تھا۔ رسول پاک ﷺ کو ظاہر ہے، اس طرح کی باتوں سے ایذا پہنچتی تھی۔ لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ کا ہر کام، انکی زبان مبارک سے نکلنے والا ہر لفظ گویا وحی کی صورت ہوتا تھا، تو وہ خود سے فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ جب تک حکم ربی نہیں آیا تھا، آپ ﷺ خاموش تھے۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ کئی بار اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنی تلوار کو نیام سے نکال کر لہرا کر بارگاہِ رسالت میں عرض کی تھی کہ ان کو حکم دیا جائے وہ اس شاتمِ رسول، گستاخ رسول ﷺ کا سر تن سے جدا کرکے آپ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیں۔ لیکن جب تک رب کا حکم نہیں آیا تھا، آپ ﷺ انہیں یہ اجازت کیسے دے سکتے تھے۔ پھر جب اذن ہوا تھا آپ ﷺ باقاعدہ صحابہ کرامؓ کی محفل میں پوچھا کہ کون ہوگا جو اس کو رضائے الٰہی اور رضائے محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے جہنم واصل کرے۔ کئی صحابہ کرام یقیناً اٹھ کھڑے ہوئے ہوں گے، لیکن یہ سعادت بزورِ بازو نیست۔ قرعہ حضرت محمد بن مسلمہؓ کے نام نکلا۔ آپؓ گئے، اس کا سر تن سے جدا کیا اور پھر رسول پاک ﷺ کو اطلاع دی کہ اس مردود و گستاخ رسول ﷺ کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے۔ رسول پاک ﷺ نے حضرت

محمد بن مسلمہؓ کے لے دعائے خیر فرمائی۔

اسی طرح ایک اور ایک اور یہودی ابو رافع نے بھی رسول پاک ﷺ کی شان میں گستاخی شروع کی ہوئی تھی۔ اور اپنے اس یہودی مردود کی پیروی میں لگا ہوا تھا۔ رسول پاک ﷺ کی شان میں گستاخانہ باتیں پھیلاتا تھا۔ اور رسول پاک ﷺ کے خلاف ہونے والی سازشوں میں آپ ﷺ کے دشمنوں کا ساتھ دیتا تھا۔ صحابہ کرامؓ تو کب کے اس کا سر تن سے جدا کرکے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر چکے ہوتے لیکن آپ ﷺ کی وجہ سے خاموش تھے۔ پھر جیسے ہی حکم الہی آیا تو رسول پاک ﷺ نے اس یہودی کو قتل کرنے کے لیے چند انصار کو نامزد فرمایا۔ جن کی تعداد تین تھی۔ ان کا امیر انہی میں سے ایک حضرت عبد اللہ بن عتیک کو مقرر فرمایا۔ جب یہ جانباز غازی کامیاب ہو کر واپس لوٹے تو اس وقت رسول پاک ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ جونہی رسول اللہ ﷺ کی نظر مبارک ان صحابہ کرام پر پڑی، پکار اٹھے۔ افلحت الوجوہ۔ یہ چہرے کامیاب ہو گئے۔

آقا علیہ السلام اپنے جانثار صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، چودھویں کے روشن چاند کے گرداگرد ستاروں کی حسین محفل۔۔۔ ایک قتل کا مقدمہ درپیش تھا، ایک باندی کو کسی نے قتل کر دیا تھا اور قاتل کا کچھ پتہ نہ تھا، مقدمہ کی صورت حال پیچیدہ ہو رہی تھی، جب کسی طرح قاتل کا نشان معلوم نہ ہوا تو آقا

:علیہ السلام نے اہل مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا
جس شخص نے بھی یہ کام کیا ہے، اور میرا اس پر حق ہے تو اسے میں اللہ کی قسم دے"
"کر کہتا ہوں کہ وہ کھڑا ہو جائے
آقا علیہ السلام کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر ایک نابینا شخص اس حالت میں کھڑا
:ہو گیا کہ اس کا بدن کانپ رہا تھا، اور کہنے لگا کہ

یارسول اللہ میں اس کا قاتل ہوں، یہ میری ام ولد تھی اور اس کی میرے ساتھ بہت" محبت اور رفاقت تھی، اس سے میرے دو موتیوں جیسے خوبصورت بچے بھی تھے، لیکن یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کیا کرتی اور آپ کو برا بھلا کہا کرتی تھی، میں اسے روکتا مگر یہ نہ رکتی، میں اسے دھمکاتا پر یہ باز نہ آتی۔ کل رات اس نے آپ کا ذکر کیا اور آپ کی شان اقدس میں گستاخی کی تو میں نے ایک چھری اٹھائی اور اس کے پیٹ پر رکھ کر اس چھری پر اپنا بوجھ ڈال دیا یہاں تک کہ یہ مر گئی"۔ نابینا صحابی یہ سارا واقعہ سنا کر خاموش ہو چکے تھے۔ معاملہ بہت نازک اور کیس سیدھا سیدھا دہشت گردی" بلکہ "فوجی عدالت" کا تھا۔ ایک شخص نے قانون ہاتھ میں لے لیا" تھا۔ از خود مدعی اور از خود جج" بنتے ہوئے ایک انسان کو قتل کر دیا تھا۔۔ "حکومت کی رٹ" چیلنج ہو چکی تھی۔ حکومت بھی کسی چیف، صدر یا وزیر اعظم کی نہیں کی نہیں، خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔۔۔ "محض مذہبی جذبات" کی بناء پر ایک انسان کو

قتل کیا جاچکا تھا۔ "مذہبی جنونیت" کی روک تھام شاید بہت ضروری تھی اور جذباتیت" کا قلع قمع بھی۔۔۔۔ پھر وہ لب ہلے جو "ان ھو الا وحی یوحی" کی سند لئے ہوئے تھے۔ جن کا ہلنا بھی وحی، جن کا خاموش رہنا بھی وحی تھا، جن سے نکلے ہوئے الفاظ قیامت تک کے لئے قانون بن جاتے تھے، جن کا غصہ بھی برحق اور جن کا رحم بھی برحق تھا، جو جان بوجھ کر باطل کہہ نہیں سکتے تھے اور خطا پر ان کا رب ان کو باقی رہنے نہیں دیتا تھا۔۔۔۔!! سب کان ہمہ تن گوش تھے۔ فضا میں ایک آواز گونجی، وہی آواز جو سراپا حق تھی۔۔۔

الا۔۔۔! اشھدوا۔۔۔! ان دمھاھدر" "سنو۔۔۔! گواہ ہو جاؤ۔۔۔! اس لونڈی کا" خون رائگاں ہے" (اس کا کوئی قصاص نہیں)۔

مولانا شیرانی صاحب کہتے ہیں کہ ممتاز قادری کا فعل، گو کہ مذہبی جذبات میں کیا گیا تھا، غیر قانونی تھا کیونکہ ممتاز قادری نے قانون اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور ممتاز قادری کو سزا اس لئے ملی کہ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ پاکستان کا آئین کہتا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکم ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا، وہ ایک مقدس امانت ہے۔۔۔۔ مولانا شیرانی صاحب، بتائیں کہ غازی ممتاز قادری شہید نے تو وہ اختیار استعمال کیا جو اللہ اور اسکے پیارے رسول ﷺ نے اس کو تفویض کیا۔ تو

کہاں آئین کی خلاف ورزی ہوئی؟

سلمان تاثیر نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ چونکہ گستاخی رسول ﷺ کا قانون ایسا ہے جو کہ غلط استعمال ہو سکتا ہے، اس کے اثرات معاشرے پر غلط پڑ سکتے ہیں اس لیے اس میں ترمیم کی ضرورت ہے یا اس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ میرا عوام سے سوال ہے کہ اگر سلمان تاثیر یہ کہتا ہے کہ چونکہ اپنے چہروں پر گھونگنٹ نکلنا یا چادر سے چہرے کو ڈھانپنا معاشرے میں بے راہ روی پھیلا رہا ہے، روزے رکھنے سے انسان کی صحت کمزور ہو جاتی ہے تو قرآن کی آیات کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، تو کیا حکومت وقت یہ بھی کر گزرتی؟ شاید۔۔ لیکن پھر نہ تو اس حکومت کے لیے اور نہ ہی اس حکومت کو چلانے کے لیے اس کے پاس افرادی قوت باقی رہ جاتی، جو بھی سلمان کے اس بیان کی تصدیق کر کے حامی بھرتا۔چونکہ سلمان تاثیر نے گستاخی کی تھی، قانون اسلام کو تبدیل کرنے کی بات صریحاً گستاخی ہے۔ اور جب حکومت کوئی فیصلہ نہیں لے گی تو فیصلہ لے وہ عشق۔۔ جو دل سے نکلتا ہے۔ جو نکلتا ہے اور عرش کو ہلا دیتا ہے۔ اور پھر اللہ کے دربار سے فیصلہ آتا ہے فلاں بندہ سرخروئی حاصل کرے گا۔ باقی سب صرف اس کے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے ہی رہ جائیں گے۔

تو میرے پیارے قارئین۔ جو یہ کہتا ہے کہ غازی ممتاز قادری شہید نے قانون

ہاتھ میں لیا تو کیا ہوا۔ اس نے سلمان تاثیر کو قتل کیا، حق پر یا ناحق پر۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ شہید قادری کے دل میں جذبہ کیا تھا۔ وہ جذبہ عشق تھا۔ عشق محمد مصطفیٰ ﷺ۔ مولانا حنیف قادری کی باتوں می وہ آیا یا نہیں، لیکن اس کا جذبہ عشق ہی اس کے عشق کی گواہی دے گا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ دنیا میں کوئی پتہ تک بھی اللہ کی رضا کے بغیر نہیں ہل سکتا تو ممتاز قادری کے جنازے میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ کیسے پہنچ گئے؟ جنازے بے شک فیصلہ نہ کریں، لیکن اللہ کا حکم تو پھر بھی سب سے افضل ہے۔

حضرت محمد بن مسلمہؓ کے پیروکار

کعب بن اشرف ایک یہودی نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتا تھا اور قریش کو مسلمانوں کے خلاف ابھارتا تھا۔ یہ یہودی نبی صل اللہ علیہ وسلم کو اور انکے واسطے سے اللہ کو اذیت دیتا تھا۔ رسول پاک ﷺ کو کو ظاہر ہے، اس طرح کی باتوں سے ایذا پہنچتی تھی۔ لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ کا ہر کام ، انکی زبان مبارک سے نکلنے والا ہر لفظ گویا وحی کی صورت ہوتا تھا، تو وہ خود سے فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ جب تک حکم ربی نہیں آیا تھا، آپ ﷺ خاموش تھے۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ کئی بار اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنی تلوار کو نیام سے نکال کر لہرا کر بارگاہِ رسالت میں عرض کی تھی کہ ان کو حکم دیا جائے وہ اس شاتمِ رسول، گستاخ رسول ﷺ کا سر تن سے جدا کرکے آپ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیں۔ لیکن جب تک رب کا حکم نہیں آیا تھا، آپ ﷺ انہیں یہ اجازت کیسے دے سکتے تھے۔ پھر جب اذن ہوا تھا آپ ﷺ باقاعدہ صحابہ کرامؓ کی محفل میں پوچھا کہ کون ہوگا جو اس کو رضائے الٰہی اور رضائے محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے جہنم واصل کرے۔ کئی صحابہ کرام یقیناً اٹھ کھڑے ہوئے ہوں گے، لیکن یہ سعادت۔بزورِ بازو نیست۔ قرعہ حضرت محمد بن مسلمہؓ کے نام نکلا۔ آپؓ گئے، اس کا سر تن سے جدا کیا اور پھر رسول پاک ﷺ کو اطلاع دی کہ اس مردود و گستاخ رسول ﷺ کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے۔ رسول پاک ﷺ نے حضرت

محمد بن مسلمہؓ کے لے دعائے خیر فرمائی۔

اسی طرح ایک اور ایک اور یہودی ابو رافع نے بھی رسول پاک ﷺ کی شان میں گستاخی شروع کی ہوئی تھی۔ اور اپنے اس یہودی مردود کی پیروی میں لگا ہوا تھا۔ رسول پاک ﷺ کی شان میں گستاخانہ باتیں پھیلاتا تھا۔ اور رسول پاک ﷺ کے خلاف ہونے والی سازشوں میں آپ ﷺ کے دشمنوں کا ساتھ دیتا تھا۔ صحابہ کرامؓ تو کب کے اس کا سر تن سے جدا کرکے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر چکے ہوتے لیکن آپ ﷺ کی وجہ سے خاموش تھے۔ پھر جیسے ہی حکم الٰہی آیا تو رسول پاک ﷺ نے اس یہودی کو قتل کرنے کے لیے چند انصار کو نامزد فرمایا۔ جن کی تعداد تین تھی۔ ان کا امیر انہی میں سے ایک حضرت عبد اللہ بن عتیک کو مقرر فرمایا۔جب یہ جانباز غازی کامیاب ہو کر واپس لوٹے تو اس وقت رسول پاک ﷺ خطبہ ارشاد فرمارہے تھے۔ جونہی رسول اللہ ﷺ کی نظر مبارک ان صحابہ کرام پر پڑی ، پکار اٹھے۔ افلحت الوجوہ۔ یہ چہرے کامیاب ہو گئے۔

آقا علیہ السلام اپنے جانثار صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، چودھویں کے روشن چاند کے گرد اگرد ستاروں کی حسین محفل۔۔۔ ایک قتل کا مقدمہ درپیش تھا، ایک باندی کو کسی نے قتل کردیا تھا اور قاتل کا کچھ پتہ نہ تھا، مقدمہ کی صورت حال پیچیدہ ہو رہی تھی، جب کسی طرح قاتل کا نشان معلوم نہ ہوا تو آقا

: علیہ السلام نے اہل مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا

جس شخص نے بھی یہ کام کیا ہے، اور میرا اس پر حق ہے تو اسے میں اللہ کی قسم دے"
" کر کہتا ہوں کہ وہ کھڑا ہو جائے

آ قا علیہ السلام کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر ایک نابینا شخص اس حالت میں کھڑا
: ہوگیا کہ اس کا بدن کانپ رہا تھا، اور کہنے لگا کہ

یارسول اللہ میں اس کا قاتل ہوں، یہ میری ام ولد تھی اور اس کی میرے ساتھ بہت"
محبت اور رفاقت تھی، اس سے میرے دو موتیوں جیسے خوبصورت بچے بھی تھے، لیکن یہ
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کیا کرتی اور آپ کو برا بھلا کہا کرتی
تھی، میں اسے روکتا مگر یہ نہ رکتی، میں اسے دھمکاتا پر یہ باز نہ آتی۔ کل رات اس نے
آپ کا ذکر کیا اور آپ کی شان اقدس میں گستاخی کی تو میں نے ایک چھری اٹھائی اور
"اس کے پیٹ پر رکھ کر اس چھری پر اپنا بوجھ ڈال دیا یہاں تک کہ یہ مر گئ

نابینا صحابی یہ سارا واقعہ سنا کر خاموش ہو چکے تھے۔

معاملہ بہت نازک اور کیس سیدھا سیدھا "دہشت گردی" بلکہ "فوجی عدالت" کا تھا۔

"ایک شخص نے "قانون ہاتھ میں لے لیا تھا۔

از خود مدعی اور از خود جج" بنتے ہوئے ایک انسان کو قتل کر دیا تھا۔۔"

حکومت کی رٹ" چیلنج ہو چکی تھی۔"

حکومت بھی کسی راحیل، پرویز، زرداری یا نواز کی نہیں، خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔۔۔

محض مذہبی جذبات" کی بناء پر ایک انسان کو قتل کیا جاچکا تھا۔"

!! عدالت میں کوئی کیس، تھانے میں کوئی رپٹ درج کرائے بغیر۔۔۔۔

مذہبی جنونیت" کی روک تھام شاید بہت ضروری تھی اور "جذباتیت" کا قلع قمع" بھی۔۔۔۔

پھر وہ لب ہلے جو "ان ھو الا وحی یوحی" کی سند لئے ہوئے تھے۔

جن کا ہلنا بھی وحی، جن کا خاموش رہنا بھی وحی تھا، جن سے نکلے ہوئے الفاظ قیامت تک کے لئے قانون بن جاتے تھے، جن کا غصہ بھی برحق اور جن کا رحم بھی برحق تھا، جو جان بوجھ کر باطل کہہ نہیں سکتے تھے اور خطا پر ان کا رب ان کو باقی رہنے نہیں دیتا !! تھا۔۔۔

سب کان ہمہ تن گوش تھے

فضاء میں ایک آواز گونجی، وہی آواز جو سراپا حق تھی۔۔۔

"الا۔۔۔! اشھدوا۔۔۔! ان دمھاھدر"

"سنو۔۔۔! گواہ ہو جاؤ۔۔۔۔! اس لونڈی کا خون رائگاں ہے"

(اس کا کوئی قصاص نہیں)

جنید جمشید صاحب، یہ غلط فہمیاں کہیں ہمیں لے نہ ڈوبیں

جنید جمشید پر عرفان لدھا نامی نوجوان نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملے کی وجہ وہاں کسی نے پوچھی تو کہنے لگا کہ اس نے نعوذ باللہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی کی ہے۔ کمال کی بات ہے کہ جب بقول اس کے "گستاخی" کی گئی تھی تب یہ عرفان لدھا کدھر تھا۔ اس وقت کیا اس کے دل میں عشق رسول جاگزیں نہیں تھا۔ شاید نہیں، کہ یہ اس وقت کسی ایسے کام میں مصروف ہوگا جو اللہ کے دینِ اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ شاید گانے سنے جا رہے ہوں گے، یا فیس بک لڑکیوں سے بات چیت کی جا رہی ہو گی یا پھر کوئی بھی چھوٹا یا بڑا، کوئی ایسا کام ہو رہا ہوگا، جس کی ہمارے دین میں گنجائش نہیں ہو گی۔ لیکن کیا کیا جائے، یہ عشق ہمیشہ اسی وقت سامنے آتا ہے، جب کوئی بتاتا ہے۔ کوئی دماغ کی صفائی کرتا ہے، یعنی برین واشنگ۔ ورنہ کیسی محبت، کہاں کا عشق۔

اگر باشعور عوام الناس نے جنید کی وہ تقریر یا وہ درس سنا ہو جس میں اس نے امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کیا ہے اور غور سے سنا ہو تو وہ یقینا یہ مانیں گے کہ جنید نے ایک حدیث کو اپنے الفاظ میں بیان کیا

تھا۔ جہاں تک میں نے اس کو دیکھا ہے، سنا ہے، سمجھا ہے جنید نے وہ حدیث تھوڑا اس انداز میں بیان کی ہے کہ سامع کو آسانی سے سمجھ بھی آجائے اور وہ اس کو دل پر بھی نقش کر لے۔ پھر جب کچھ علماء نے اس وقت اعتراض کیا تھا تو جنید نے باقاعدہ معافی مانگ لی تھی۔ اللہ پاک سے توبہ کر لی تھی۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا، تو پھر سال بعد لوگوں کے دلوں میں عشق کہاں سے جاگ گیا۔ کیا جنید جمشید نے اس کے بعد کوئی سفر نہیں کیا ہو گا، اپنے محلے کی مسجد میں نماز نہیں پڑھی ہو گی۔ کہیں خرید وفروخت کرنے نہیں نکلا ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سب کچھ ہوا ہو اور کسی نے کچھ نہ کہا ہو۔ یقیناً نہیں کہا کہ سب جانتے تھے کہ جنید نے جو کچھ جس انداز میں کہا وہ اگرچہ بظاہر کم علمی کی بنیاد پر تھوڑا مزاح سے پر ہو گیا، لیکن اس میں غلط کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس وقت یہ عرفان لدھا نامی نوجوان شاید پیدا نہیں ہوا تھا، تب ہی اس کو یہ علم نہیں تھا کہ جنید جمشید نے اس طرح کی کوئی بات کی ہے۔ ورنہ اس نے تو ٹی وی سٹیشن پر حملہ کر دینا تھا یا پھر اس محفل کو سبوتاژ کر دینا تھا، وہاں خود کش دھماکہ کرنا تھا کہ سنت کے منافی، اسلام کی شان میں گستاخی ہو رہی تھی۔ جنید جمشید وہاں اللہ کی نہیں، اللہ کے رسول ﷺ کی نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی باتیں نہیں کر رہا تھا بلکہ اسلام کی مخالفت میں درس دے کر لوگوں کے جذبات بھڑکا رہا تھا۔

جنھوں نے جنید جمشید پر ہاتھ اٹھایا، وہ ہر گز عاشق نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جن کے عشق میں انھوں نے ہاتھ اٹھایا، انھوں نے تو ان اشخاص کو بھی کچھ نہ کہا جنھوں نے امی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھا تھا۔ تفصیل کے لیے واقعہ افک اور سورۃ نور دیکھی جا سکتی ہے۔ ان الزامات لگانے والوں میں ایک امی عائشہ رضی اللہ عنہا کا بہت قریبی رشتہ دار بھی تھا۔ اس بہتان کی ابتدا اگرچہ منافقین نے کی تھی جن کا سربراہ عبداللہ ابن ابی منافق تھا۔ لیکن پھر اللہ پاک نے سورۃ النور کی آیات نازل فرما کر ان کی برات کا اعلان فرما دیا۔ اور اس طرح برات فرمائی کہ تا قیامت وہ برات جاری و ساری رہے گی۔ کہ ان آیات کی تلاوت قیامت تک کی جاتی رہے گی۔ تو لوگ، جب حضور پاک ﷺ ان صحابہ کو کچھ نہیں فرمایا سوائے اس کے کہ صرف تنبیہ کی تو پھر ہم کون ہوتے ہیں جنید جمشید کو برا بھلا کہنے والے، اگرچہ اس نے تو حدیثِ رسول ﷺ کے الفاظ کو اپنے انداز میں بیان کیا تھا۔ اور پھر بھی اس نے اپنی کم علمی کو سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو جاہل کہا اور توبہ کی اور سب سے معافی بھی مانگی۔ تو جب بندہ اللہ سے معافی مانگ لے (بشرطیکہ وہ مسلمان بھی ہو) تو پھر تو معاملہ رب اور اس بندے کے درمیان ہو گیا۔

جہاں تک ممتاز قادری کے حوالے سے بات ہے کہ اس کے عشق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ عمل انجام دیا گیا۔ تو یہ مطابقت یا مسابقت تو ہر گز غلط ہے۔ اس نے جو

کیا وہ عشق رسول ﷺ میں کیا۔ اور عشق رسول ﷺ میں اگر حکومت وقت کوئی ایکشن نہیں لیتی باوجود اس کے کہ گستاخی کرنے والے کے خلاف باقاعدہ تصویری یا فلمی ثبوت ہیں تو پھر شاید اللہ کو یہ منظور نہ ہوگا کہ اپنے حبیب کے گستاخ کو اس زمین پر زندہ رہنے کا حق دے۔ اسکی حالت یقینا ایسی ہو جاتی ہے جیسے دھتکارا ہوا۔ جو رسول پاک ﷺ پر حد سے زیادہ بہتان باندھے، تہمت لگائے اس کے بارے میں اللہ نے ایک لفظ ''زنیم'' فرمایا ہے۔ جس کا مختلف تفاسیر میں مختلف ترجمہ کیا گیا ہے۔ کلام عرب میں یہ لفظ اس ولدالزنا کے لیے بولا جاتا ہے جو دراصل ایک خاندان کا فرد نہ ہو مگر اس میں شامل ہوگیا ہو۔ سعید بن جبیر اور شعبی کہتے ہیں کہ یہ لفظ اس شخص کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو لوگوں میں اپنے شر کی وجہ سے معروف و مشہور ہو۔ ان آیات میں جس شخص کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں اس کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شخص ولید بن مغیرہ تھا۔ کسی نے اسود بن عبد یغوث کا نام لیا ہے۔ کسی نے اخنس بن شریق کو اس کا مصداق ٹھیرایا ہے۔ اور بعض لوگوں نے کچھ دوسرے اشخاص کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن قرآن مجید میں نام لیے بغیر صرف اس کے اوصاف بیان کردیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں وہ اپنے ان اوصاف کے لیے اتنا مشہور تھا کہ اس کا نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی یہ صفات سنتے ہی ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اشارہ کس کی طرف ہے۔

اب جہاں تک بات گستاخی کی نکلتی ہے تو جو سر عام گستاخی کرتے پھرتے ہیں ، قرآن پاک کی شان میں ،اللہ پاک کی شان میں ، رسول پاک ﷺ کی شان میں ، ان کی تعلیمات میں تحریف کرتے ہوئے، اس کو تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ اس کے پیچھے پیچھے چلنا فخر سمجھتے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے۔ عامر لیاقت حسین سر عام مجمع میں کہتا ہے کہ ایک صحابی کو سوالات کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کی وجہ یہ بدبخت یہ بتاتا ہے کہ اس صحابی کو کوئی بات سمجھ ہی نہیں آتی تھی ۔ اس لیے وہ سوال در سوال کرتے تھے۔ جس لہجے میں ، جس انداز سے یہ بات عامر لیاقت حسین نے کی وہ صریح اس بات کا غماز تھی کہ وہ نعوذ باللہ ان صحابی رضی اللہ عنہ کو کم عقل، بے وقوف یا کند ذہن سمجھ رہا ہے۔ مجال ہے جو اس مجمع میں کوئی بھی اٹھ کر بولا ہے کہ اے مداری مولانا، یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔۔۔۔ اس کے بعد پھر جب ایک خاتون نمائندکر پر سن کے سوال پر دوپٹہ کو مستثنا قرار دیا تو بھی ارد گرد افراد میں سے کوئی کیمرہ مین، کوئی ورکر میڈیا کا اٹھ کر نہیں بولا کہ یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ پھر جب وہ علمائے سو کے سامنے فلموں کی، گانوں کی باتیں کر رہا تھا، گالیاں بک رہا تھا، تو ان علماء نے بھی احتجاج نہیں کیا کہ یہ کیا بکواس ہے۔

گستاخی رسول ﷺ کا جو قانون ہے اس میں جو ترمیم کی بات کرے، اسے چاہیے کہ پھر بات کو ثبوت کے ساتھ کرے۔ یہ ثابت کرے کہ توہین رسالت کے قانون میں

نعوذ باللہ کوئی قدغن ہے، کوئی کمی ہے۔ لیکن کچھ ہو گا تو ملے گا نا۔ ورنہ تو اس قانون کو نعوذ باللہ غلط کہنے والا خود ہی غلط ہو گا۔ ہاں، آپ نے اگر جنید جمشید کو کچھ کہنا ہی ہے تو اس بات پر کہیں کہ اس نے فیشن شو کا افتتاح قصیدہ بردہ شریف پڑھ کر کیوں کیا۔ اس نے دوبارہ سلمان احمد، جو نعوذ باللہ قرآن کی آیات کو گٹار پر گانا نیک کام سمجھتا ہے، کے ساتھ مل کر گانا کیوں گایا۔ پھر گانا کیوں گایا، جو کہ اسلام کی تعلیمات کی رو سے ممنوع ہے۔ اگر آپ نے جنید جمشید کو برا ہی کہنا ہے تو اس بات پر کہیں کہ پہلے وہ تعلیمات پوری کرے، پھر ان پر عمل کی کوشش کرے۔ تب عوام الناس کو تبلیغ کرے۔ ورنہ اپنی عاقبت ہی سنوار لے تو بہت ہے۔

دہشت گرد کون؟ (دوسرا حصہ)۔

طبعیت کچھ عجیب طرح سے اداس تھی کہ کچھ بھی لکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسلیے اتنے دن کچھ نہ لکھ سکا۔ گزشتہ کالم میں چند جملے جو سوشل میڈیا پر گردش کر رہے تھے ان کو زیرِ بحث لایا۔ اختتام پر خارجیوں کی کچھ نشانیاں بیان کیں۔ تفصیلات احادیث سے مل سکتی ہیں۔ لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ ان خارجیوں کو پیدا کس نے کیا، انکا حلیہ بھی ان جیسا ہی کیوں بنایا جیسے سوشل میڈیا پر دہشت گردوں کی شناخت فضول طور پر وائرل کی گئی۔ ان کو سامنے کون لایا۔ ان کو فنڈ کون دیتا ہے؟ اتنا اسلحہ ان کے پاس کہاں سے آتا ہے؟ ایسا جدید اسلحہ جو صرف بڑے ممالک کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔ یہ وردی کسی لنڈے میں بھی اتنی وافر مقدار میں نہیں بکتی جو انہوں نے پہنی ہوتی ہے۔ جدید مواصلاتی نظام کی سہولیات انہیں میسر، انٹرنیٹ کے اس طرح ماہر کے امریکہ، فرانس، جاپان،، برطانیہ، جرمنی، اسرائیل، انڈیا کے ہیکر بھی ان کا ٹھکانہ نہیں ڈھونڈ سکتے۔ ہے نا کمال کی بات؟ ویسے تو امریکہ کو سمندر کی تہہ میں آسمان میں گھومتے مصنوعی سیارے سے سوئی نظر آ جاتی ہے لیکن تورا بورا کی پہاڑیوں میں اسے اسامہ بن لادن نظر نہیں آیا۔ کیونکہ اس نے عمرو عیار کی سلیمانی چادر سوتے جاگتے، چلتے پھرتے پہنی ہوئی ہوتی تھی۔ تب ہی وہ جب تک تورا بورا میں رہے، کسی دشمن کو نظر نہ آئے۔

پھر پتہ چلا کہ وہ ایبٹ آباد میں موجود ہے، آدھی رات کو چوروں کی طرح امریکی ہیلی کاپٹر کمانڈوز سے بھرا ہوا آیا۔ بظاہر اس کو مار کر اس کی لاش ساتھ لے گئے اور پھر سمندر برد کر دی۔ اب معلوم نہیں سچ کیا ہے، ان کمانڈوز میں سے ایک نے کچھ دن پہلے بیان دیا ہے کہ اسامہ بن لادن مرا نہیں، بلکہ اسے زندہ گرفتار کرکے امریکہ لایا گیا تھا۔ جب تک عراق ایران کے ساتھ لڑتا رہا، ڈٹ کر اسلحہ دیتے رہے اور خوب دو ملکوں کو آپس میں لڑاتے رہے۔ ایک کو امریکہ سہارا دے رہا تھا تو دوسرے کے پیچھے روس کا ہاتھ تھا۔ لیکن جب ان کی لڑائی تھم گئی۔ صدام حسین نے عراق کو ترقی دینے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے مختلف قسم کے کاموں کی بنیاد ڈالی تو امریکہ کی نیندیں اڑنے لگ گئیں۔ اس نے ایک سازش کے تحت کویت پر حملہ کروایا، قبضہ کروایا۔ اور پھر خود بتیس ملکوں کی فوج لے کر، اقوامِ متحدہ کے منع کرنے کے باوجود عراق پر چڑھ دوڑا۔ وجہ کیا تھی، امریکہ کے مفادات کو خطرہ۔

پھر طالبان نے افغانستان میں روس کے ٹکڑے ہونے کے بعد عنان حکومت سنبھالی۔ اور اس طرح سنبھالی کہ کفار کی نظروں میں کھٹکنے لگ گئے۔ بہت سوچا، بہت غور کیا لیکن امریکہ والوں کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ ان طالبان مومنین کا راستہ کس طرح روکیں۔ اگر تو ان کی حکومت قائم رہی اور کچھ عرصہ مزید چلتی رہی تو شاید وہ وقت دور نہ ہوتا جب اسلام کی روح افغانستان سے نکل کر

پاکستان، ایران، عراق تاجکستان اور دیگر بہت سے ممالک تک ایمان کی روشنی پھیلاتی۔جب کچھ نہ بنا امریکہ سے تو پھر انکا چہیتا میدانِ جنگ میں اترا۔ وہ میدان جہاں صرف سازشیں پنپتی ہیں۔ جہاں دیواروں کے کان بھی سیسہ کی مدد سے بند کر دیا جاتا ہے۔ہاں جی، امریکہ کا چہیتا، بن ماں کے باپ کا لاڈلا اسرائیل، جس نے وہ سازش کی کہ ساری دنیا اسکے نتیجے میں اس طرح تبدیل ہوئی کہ ۹ ستمبر ۲۰۰۱ سے لے کر آج تک پھر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکا۔ اس سازش کا پہلا نتیجہ نکلا تو کچھ اس طرح کہ پاکستان کی اس وقت کی حکومت نے اگرچہ بظاہر امریکہ کو اڈے تو نہیں دیے لیکن امریکہ کا بیک لائن اتحادی بن کر اسے بھرپور سہارا دیا۔ اور وہ سازش جس کے تانے بانے اسرائیلی شر دماغوں نے بنے، اسکو سلجھایا افغانستان میں گیا۔اور تب کی لگی آگ سے آج تک افغانستان میں امن قائم نہ ہو سکا۔بے شک دو تین حکومتیں وہاں تبدیل ہوئیں، لیکن جسے صحیح معنوں میں امن کہتے ہیں وہ ہر گز ہر گز نہ تو کرزئی کی حکومت قائم کر سکی اور نہ ہی اشرف غنی صاحب کی حکومت اس میں کامیاب ہوئی۔ کیوں؟ کیونکہ پہلے امریکہ نہیں چاہتا تھا اور اب بھی نہیں چاہتا۔ ورنہ اس کا کیا کام رہ گیا اب۔ طالبان کی حکومت ختم کرنا اس کا مقصود تھا، کر دیا۔ اب کیا یہاں بیٹھا اچار ڈال رہا ہے؟ نہیں ، وہ چاہتا ہی نہیں کہ افغانستان اور اس سے ملحقہ ممالک میں کسی بھی طرح سے امن قائم ہو۔

امریکہ افغانستان میں کیوں اپنی فوجیں جمع کیے بیٹھا ہے۔ اس لیے کہ یہاں سے اس کو پاکستان میں گھسنے کے لیے بہت آسانی ہے۔ ڈرون حملے کہاں سے ہوتے ہیں، کیا امریکہ سے اٹھ کر ڈرون جہاز آتے ہیں۔ نہیں بلکہ افغانستان سے ہی درآمد ہوتے ہیں۔ امریکہ کی موجودگی کی وجہ سے انڈیا کو بھی ایک مظبوط شہہ ملی ہوئی ہے۔ افغانستان کے ہر اس شہر میں اس نے قونصل خانے بنائے ہوئے ہیں جہاں پر اشرف غنی کی حکومت کا کنٹرول ہے۔ طالبان کے کنٹرول کردہ علاقوں میں وہ قونصل خانہ تو کیا، چھوٹا سا دو کمروں کا گھر ہی تعمیر کرکے دکھادے تو مانوں۔ پاکستان میں جتنی دہشت گردی ہوتی ہے اس میں سو فیصد تین بہترین دماغ جڑ کر منصوبہ بناتے ہیں، لیکن نام اس کا آتا ہے جو صرف استعمال ہوتا ہے۔ آرمی پبلک سکول پشاور پر حملہ کیا گیا۔ دہشت گرد کون تھے؟ داڑھی والے، لیکن سالوں سے نہائے ہوئے نہیں تھے۔ کہاں سے آئے تھے، افغانستان سے۔ اس وقت جب ان کی رابطے تلاش کیے گئے تو رابطہ کا اختتام کہاں پر ہوا تھا ایک انڈین فرد تک، جو کہ راء کا کوئی ریجنل سربراہ تھا یا کوئی اچھی پوسٹ کا افسر تھا۔ لیکن نام کس کا استعمال ہوا، طالبان کا وہ بھی جو پاکستان سے بھاگے ہوئے تھے۔ ملا فضل اللہ ریڈیو کا۔ یقیناً ملا فضل اللہ کے بندے ہی استعمال ہوئے لیکن ان کو تربیت دینے والے کون تھے، ان کو اسلحہ پہنچانے والے کون تھے، ان کو پاکستان کے اندر داخل کرکے ان کو یہاں سہارا دینے والے کون تھے؟ یقیناً غدارانِ پاکستان تھے، جو کھاتے پیتے تو پاکستان کا ہیں، رہتے پاکستان میں

ہیں، لیکن گن امریکہ، اسرائیل اور انڈیا کے گاتے ہیں۔

اب اگر کوئی کہے کہ ہر داڑھی والا دہشت گرد ہوتا ہے تو ہر گز نہیں۔ لیکن ہر دہشت گرد شاید داڑھی والا ضرور ہوتا ہے، وہ جو سامنے ہوتا ہے۔ ورنہ تو اوبامہ کی کوئی داڑھی نہیں، اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو بھی اوبامہ کی طرح ہی چہرے سے تھرڈ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہاں اگر مودی صاحب کا کہیں تو داڑی ہے، تو گجرات کے فسادات کرائے ہی نہیں تھے، بلکہ حصہ بھی لیا تھا۔ تو ہر دہشت گرد داڑھی والا ضرور ہوتا ہے۔ جس طرح ہر نمازی بد کردار نہیں ہوتا، لیکن بد کردار نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے اندر جتنی بھی دہشت گردی ہوتی ہے، اس میں کسی بھی سچے پاکستانی کا ہاتھ ہر گز نہیں ہے۔ اگر کوئی پاکستان میں سچ، حق والا سچ جاننے کے لیے سروے کرے، اور کروڑوں پاکستانیوں سے کرے، تو ثابت ہو گا کہ کوئی پاکستانی کسی بھی قسم کی دہشت گردی خود سے بالکل نہیں کرتا۔ میں نے لفظ دہشت گردی استعمال کیا ہے۔ نہ کہ ظلم کے خلاف، ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا۔ اگر کوئی شخص بھری عدالت میں اپنے دشمن کو مار دیتا ہے، تو شاید اس وجہ سے کہ پولیس نے الٹا اسکو ہی پکڑا ہوتا ہے۔ اگر زین کے رشتہ دار مصطفٰی کانجو کو خدانخواستہ قانون اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کوئی نقصان پہنچا دیتے ہیں تو یہ دہشت گردی نہیں ہو گی، بلکہ ظلم، ناانصافی کے خلاف آواز ہو گی۔ چاہے اسکا انداز کچھ اور ہی

کیوں نہ ہو۔

دہشت گردی کیا ہے؟ شام میں بشار الاسد اور اسکے حامی جن میں روس اور ایران بشار الاسد کا ساتھ دے رہے ہیں۔ امریکہ،برطانیہ بظاہر شامی حکومت کے خلاف ہیں اور حملے وہ داعش کے ٹھکانوں پر کر رہے ہیں، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ داعش کا کوئی فرد ان حملوں میں نہیں مر رہا بلکہ شام کے مجبور و بے بس عوام ان حملوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ترکی بھی بشار الاسد کا مخالف ہے، سعودیہ، قطر بھی بشار الاسد کے مخالف جنگجوؤں کی حمایت کر رہا ہے۔ یہ کھلی دہشت گردی نہیں تو کیا ہے کہ یا تو سیدھا سیدھا داعش کے ٹھکانوں پر حملے ہوں اور انکا شام سے صفایا کیا جائے، اگر وہ واقعی میں اسلام کے، دنیا کے دشمن ہیں (ان کی باتوں سے اور کردار سے بظاہر تو یہی لگتا ہے، حقیقت اللہ ہی جانتا ہے)۔ یا پھر بشار الاسد کا تختہ الٹ کر وہاں پر کوئی اعتدال پسند حکمران لایا جائے، جو اسلام کا نفاذ کرے، لیکن امریکہ یا روس یہ کب ہونے دیں گے؟ کبھی نہیں۔ اسرائیل فلسطین میں ۱۹۶۷ سے پھولوں کے گلدستے برسا رہا ہے، جن میں آتش و آہن بھرا ہوا ہے۔ بھارت میں اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کو پاؤں تلے روند کر انڈیا میں روزانہ استصوابِ رائے کراتا ہے، اور اس کے نتیجے میں روزانہ سینکڑوں لاشے اٹھتے ہیں۔

مسلمان تو بس مفت کے بدنام ہیں، کیونکہ وہ مسلمان ہیں، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے ماننے والے ہیں۔ ورنہ تو

دنیا میں اور بھی مذاہب ہیں لیکن ہندو، یہودی، نصاریٰ ہر گز دہشت گرد نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

خودکشی سے پرہیز- جنت ناگریز

غزہ احد میں ایک شخص بہت شاندار انداز سے تلوار کے جوہر دکھا رہا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے رسول پاک ﷺ سے عرض کیا کہ فلاں شخص کیا لڑ رہا ہے۔ چند لمحے کے توقف کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص دوزخی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیران ہوئے۔ لڑائی ختم ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شخص کو شہیدوں میں تلاش کیا۔ وہ شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ پھر اس شخص کی تلاش زخمیوں میں شروع کی۔ تو دیکھا کہ وہ شخص زخمیوں میں فوت شدہ پڑا ہے۔ جب اس کے جسم پر غور کیا تو دیکھا کہ اس نے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لی تھی۔ جس سے خون بہنے کی وجہ سے اس کی جان چلی گئی۔ اب ہوا کیا تھا کہ وہ شخص لڑائی کے دوران زخمی ہو گیا تھا لیکن پھر زخموں کی تکلیف.برداشت نہ کر سکا۔ صبر نہ کرتے ہوئے اس نے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لی اور یوں وہ جنت کا راستہ بھول کر جہنم کے دروازے کی راہ پر لگ گیا۔ رسول پاک ﷺ کا فرمان ہمیشہ کی طرح سچ ثابت ہوا۔ شب معراج میں رسول پاک ﷺ نے دیکھا کہ کچھ لوگ پہاڑ سے چھلانگ مار رہے ہیں اور بار بار مار رہے ہیں۔ مرتے ہیں، پھر زندہ ہو جاتے ہیں ۔ پھر پہاڑ پر چڑھ کر دوبارہ چھلانگ مارتے ہیں۔ کچھ اپنے آپ کو دوسرے طریقوں سے مار رہے ہیں۔ اور بار بار یہ عمل دہرایا جا رہا ہے۔ رسول پاک ﷺ نے اپنے ہم رکاب حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ

کیا ماجرا ہے؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا میں خود کشی کی اور اب یہ ہمیشہ اسی طرح کرتے رہیں گے۔ یعنی اپنے آپ کو اسی طریقہ سے ماریں گے اور مر کر دوبارہ زندہ ہوں گے، اور پھر ماریں گے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

خود کشی ہے کیا؟ اپنی جان لینا۔ گویا اللہ کی دی ہوئی جان میں خیانت کی اور اس شدید قسم کی خیانت کہ اپنی جان ہی لے لی۔ کیا خود کشی کرنے والے کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنی جان لیتا۔ نہ تو وہ خود پیدا ہوا، نہ خود پلا بڑھا، نہ ہی اس نے اپنی مرضی سے رزق کمایا۔ نہ ہی وہ اپنی مرضی سے بیمار ہوا یا صحت یاب ہوا۔ دنیا کی کوئی نعمت اس نے اپنی مرضی سے حاصل نہیں کی، تو پھر وہ جان لینے میں اپنی مرضی کیسے کر سکتا تھا۔ بے شک یہ جان تب دیتا جب دوسرے لیتے۔ لیکن اس وقت مزا آتا جب یہ جان دینا اس شعر کے مصداق ہوتا۔ ؎

جان دی دی ہوئی اس کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

اللہ کی راہ میں، اللہ کے رسول ﷺ کے عشق میں، اللہ کے دین کی خاطر اگر جان دینی پڑے، لیکن دوسروں کے ہاتھوں دینی پڑے تو بات بنتی ہے۔ ورنہ قیامت کے دن

حساب کتاب کے بعد تم جتنے ولی ٹھہرے دنیا میں۔۔ تم جتنے انسانوں میں ہر دل عزیز تھے، متاعِ جاں تھے، لیکن اگر اپنے ہاتھوں سے خود کو اڑا دیا تو پھر کوئی فائدہ نہیں۔ ساری زندگی کی نیکیاں رائیگاں۔ نہ جنت کے مزے نہ پل صراط سے مانند برق گزرنا۔ جو گزرا بھی تو ایسے کہ پل صراط سے نیچے نظر پڑی اور پھر اس نظر کے پیچھے بندہ بھی نیچے۔ لیکن بندہ خوکشی کیوں کرتا ہے؟ کیا اس کا ناطہ دین سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کیا اس نے اللہ کے حکم کو نہیں مانا ہوتا۔ کیا اس کا دکھ، اس کا غم، اس کی تکلیف اللہ کی رحمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہر گز نہیں۔ جب اللہ پاک نے قرآن میں صریح الفاظ میں فرما دیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہر گز نہ ہو، تو پھر بندہ کون ہوتا ہے اپنی پریشانیوں کو بہت زیادہ سمجھنے والا۔

اگر آپ طالب علم ہیں، آپ کو امتحانات کی پریشانی ہے، فیل ہونے کا خطرہ ہے۔ اور فیل ہونے کی وجہ سے باپ کے غصے کا ڈر ہے۔ تو کیوں ہے؟ کیا آپ نالائق طالب علم ہیں۔ نہیں۔ آپ میں ذہانت ہے، لگن ہے، محنت ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ جب آپ محنت کریں، دل لگا کر کریں اور سبق میں من تن دماغ لگا کر کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ نہ صرف آپ پاس ہوں بلکہ آپ کے نمبر بھی اچھے ہوں۔ ایک لطیفہ یاد آگیا۔ رزلٹ آنا تھا۔ ایک دوست دوسرے کہنے لگا کہ تم رزلٹ سن کر گھر آنا۔ اگر والد پاس ہوں تو ایک پیپر میں فیل کا کہنا کہ مسلمان کی

طرف سے سلام۔ دو میں فیل ہوا تو کہنا مسلمانوں کی طرف سے سلام۔ دوست رزلٹ دیکھ کر آیا اور بولا پوری امت مسلمہ کی طرف سے سلام قبول ہو۔ یہ تو چلتے چلتے ایک بات ہو گئی۔ اگر تو باپ کا ڈر ہے تو بھی قصور آپ کا نہیں۔ آپ کے والد کا ہے۔ انہیں چاہیے کہ دین کا مطالعہ کریں۔ ہمارے دین میں اللہ کے احکامات کیا ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیمات کیا ہیں؟ کیا ہم ان پر عمل کر رہے ہیں؟ کیا رسول پاک ﷺ نے جو فرمایا ہے کہ اپنی اولاد کے ساتھ بہترین سلوک کرو، ان کی بہترین تربیت کرو، تو کیا آپ نے بہترین تربیت کی ہے؟ اگر آپ کی تربیت میں کمی نہ ہوتی، ان کو محنت کا فارمولا سکھایا ہوتا تو ہر گز اس طالب علم میں گھبراہٹ نہ ہوتی۔

آپ کاروباری ہیں۔ آپ کو کاروبار میں نقصان ہو رہا ہے اور اب نوعیت اس بات تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا سے جی اچاٹ گیا ہے۔ اپنی جان لینے کو جی چاہتا ہے۔ تو ایسا ہر گز نہ سوچیے۔ آپ یہ سوچیے کہ کاروبار کرنے کے دوران آپ نے کسی کا حق تو نہیں مارا۔ چاہے وہ ایک روپے کا ہو یا ایک لاکھ روپے کا۔ اس بات پر غور ضرور کریں۔ کاروبار کے دوران کہیں بے ایمانی سے تو کام نہیں لیتے رہے۔ غور کریں اور خوب غور کریں۔ اور اس کا علاج تو بہت آسان ہے۔ پہلے رب سے توبہ۔ دل سے توبہ۔ سجدے میں سر رکھ کر گڑگڑا کر توبہ۔ اور اللہ تو ہے ہی وہ ذات کہ جس کا کہنا ہے تم ستر مرتبہ توبہ کرو، میں ستر مرتبہ تمھاری توبہ

قبول کروں گا۔ جب آپ کو توبہ کرنے کی توفیق مل جائے، سجدے میں سر رکھنا نصیب ہو جائے تو پھر اس شخص کو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں جس کی حق تلافی کی تھی۔ جس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اگر بفرضِ محال وہ شخص نہیں ملتا تو پھر وہ حق جو اس کا تھا، بنا ثواب کی نیت کیے یا یہ کہ اس کا ثواب اس شخص کو پہنچے اللہ کی راہ میں عطیہ کر دیں۔ میں گارنٹی سے کہتا ہوں کہ اگر دنوں میں آپ کے دن نہ پھرے تو نام تبدیل کر دیجیے گا۔ اور یہ گارنٹی میں اپنے آپ سے نہیں دے رہا ہوں۔ اپنے اللہ کے احکامات اور اسکے رسول ﷺ کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔

آپ ملازم پیشہ ہیں۔ آپ کو آفس میں تنگ کیا جا رہا ہے۔ مختلف حیلے بہانوں سے آپ کی دفتر کی زندگی اجیرن کی جا رہی ہے۔ دفتر والے رشوت لیتے ہیں اور آپ کو بھی مجبور کر رہے ہیں۔ اگر آپ نہیں لیتے تو وہ آپ کو آپ کی مرضی سے کام نہیں کرنے دیتے۔ ارد گرد کے دیگر افراد آپ پر آوازیں کستے ہیں۔ یہاں تک کہ اب آپ کا دل کرتا ہے کہ ان کو مار کر خود بھی مر جاؤں۔ تو جناب عالی ! نہ آپ کو فائدہ، نہ ان کو نقصان۔ ہو سکتا ہے، آپ کے ان کو مارنے کی وجہ سے ان کی شاید نیکی کا پی میں کسی نیکی کا اضافہ ہو جائے۔ البتہ آپ یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ نظر انداز کرنے کا ہنر سیکھ لیں۔ کوئی آپ سے کچھ کہے، کوئی آپ کے بارے میں دوسروں سے کچھ بھی غیبت کرے۔ آپ پہلے تو سنیں ہی نہ۔ لیکن اگر

غلطی سے کان میں کوئی بات پڑ بھی گئی ہے تو یوں سمجھیں کہ آپ کے دونوں کانوں کے درمیان جگہ خالی ہے۔ ایک کان سے سنا، دماغ ہے ہی نہیں، تو دوسرے کان سے بات باہر نکال دی۔ آپ نے حق کا، سچائی کا جو راستہ اپنایا ہے، اس کو اپنائے رکھیں۔ جب اللہ کے احکامات کے مطابق حق پر چلنے والا ہمیشہ سرخرو رہتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ آپ کو سرفرازی نہ نصیب ہو۔ اس میں ایک چھوٹی سی شرط ہے کہ اللہ کے احکامات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا کام کریں۔ ساتھ میں اللہ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو دین و دنیا میں سرخرو فرمائے۔ یقین مانئے کامیابی آپ کے قدموں میں ہو گی۔ آزمائش شرط ہے۔

رہبانیت اور جعلی پیر

گزشتہ چند دنوں سے میری طبیعت ناساز تھی۔ کچھ گردوں میں پتھری کی شکایت تھی۔ علاج چل رہا تھا۔ الحمدللہ بہتری کی طرف گامزن ہوں۔ اسی دوران ایک دن آفس میں بیٹھا کام ہو رہا تھا کہ ایک ساتھی عمومی طور پر ملا۔ حال احوال پوچھا۔ بتایا کہ آج کل گردوں کی شکایت ہے تو کہنے لگا کہ کھیوڑہ کے قریب ایک مقام ہے جہاں کا پانی پی لیں تو آرام آ جائے گا۔ میرے پوچھنے پر کہ اس پانی کی خصوصیت کیا ہے تو جواب ملا کہ وہاں جس بزرگ کی زیارت ہے، اس بزرگ نے اس پانی میں کچھ عرصہ ریاضت کی تھی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ وہ بزرگ وہاں کوما کی سی حالت میں رہے تھے یا بیٹھے رہے تھے ۔ لیکن یہ یاد ہے کہ انھوں نے بنا وقفہ کیے وہاں ریاضت کرتے رہے تھے۔ میں نے اس ساتھی سے کہا کہ یہ سنا گیا ہے کہ آب زم زم کو جس بیماری میں صحت یابی کی نیت سے پیا جائے اور صدق دل سے پیا جائے تو اس بیماری سے اللہ پاک ضرور صحت یاب کر دیتے ہیں۔ اور میں کتنی بار آب زم زم پی چکا ہوں۔ لیکن ابھی تک مکمل صحت یاب نہیں ہوا۔ تو جب مجھے آب زم زم سے راس نہیں آیا تو پھر دنیا کا کوئی اور پانی کیسے راس آ سکتا ہے؟ وہ بھی اس طرح کا پانی جس میں کوئی شخص کچھ عرصہ اس حالت میں بیٹھا ہو کہ نہ اس کی پاکی ناپاکی کا علم ہو، نہ کچھ اور۔ مزید اضافہ یہ کہ اتنے دنوں میں کیا اس نے نماز وغیرہ کا کیا

اہتمام کیا ہو گا؟ اور پھر یہ کہ حدیث کے مطابق ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے''۔ تو جب رہبانیت اسلام میں منع ہے تو پھر کوئی بھی فرد چاہے وہ اللہ کی رضا کے لیے کرے، اگر اس میں وہ اسلام کے بنیادی ارکان کی پابندی نہیں کرتا، تو اسکی وہ رہبانیت کسی کام کی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب تک نبوت نہیں ملی تھی، تب تک تو آپ ﷺ غارِ حرا میں تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کی نشانیوں پر غور فرماتے تھے۔ کائنات کیسے تخلیق ہوئی؟ آسمان، سورج، چاند، زمین کیا ہیں؟ کائنات اور انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اس طرح کی بہت سی باتوں پر آپ ﷺ غور فرمایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے ساتھ خورد نوش کا سامان لے جایا کرتے تھے۔ دیکھ لیں، کہیں پر بھی اس طرح کا عمل نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ آپ ﷺ نے بالکل ہی دنیا سے کنارہ کر لیا ہو۔ کھانا پینا چھوڑ دیا ہو۔ جب نبوت سے سرفراز ہوئے تو دنیا سے رخصت ہونے کے وقت تک تئیس سال کے عرصے میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی جسے ان کی زندگی میں رہبانیت کا عرصہ کہا جا سکے۔

سورۃ الحدید آیت ۲۷ میں اللہ پاک فرماتے ہیں: ''پھر اس کے بعد ہم نے اپنے اور رسول بھیجے اور عیسٰی ابن مریم کو بعد میں بھیجا اور اسے ہم نے انجیل دی، اور اس کے ماننے والوں کے دلوں میں ہم نے نرمی اور مہربانی رکھ دی، اور ترک دنیا جو انہوں نے خود ایجاد کی ہم نے وہ ان پر فرض نہیں کی تھی مگر انہوں نے

رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا پس اسے نباہ نہ سکے جیسے نباہنا چاہیے تھا، تو ہم نے انہیں جو ان میں سے ایمان لائے ان کا اجر دے دیا، اور بہت سے تو ان میں بدکار ہی ہیں۔" اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رہبانیت اختیار کرنے والے اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ اس میں اللہ کی رضا شامل نہیں ہوتی۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے بارے میں کہا گیا ہے لیکن پھر وہ اس کو پوری طرح اور اس کی روح کے مطابق نہ نباہ سکے جیسا کہ نباہنے کا حق تھا تو میرا سوال ان سے یہ ہے کہ پھر یہ بات ہمیں کیوں بتائی گئی؟ قرآن سے ہی یہ ثابت ہے کہ ہمیں یعنی اس آخری امت کو ماضی کی یہ باتیں اسلیے بتائی جاتی ہیں کہ ہم ان سے سیکھیں، اگر عبرت کا مقام ہے تو عبرت حاصل کریں۔ ورنہ ہمیں فرعون کے غرقِ دریا کا قصہ کس لیے بتایا گیا؟ واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے دنیا بنائی ہے، دنیا میں رہنے والے بنائے ہیں۔ آپس میں تعلق رشتہ داری، برادری قائم کی ہے، قبیلے آئے، تو ظاہر ہے ان کو آپس میں تعلقات بھی تو رکھنے ہیں۔ کہ جب اللہ پاک کے فرمان کے مطابق " اور لوگوں سے اچھے طریقے سے بات کرو" کے مصداق یہ فرض ہے کہ آپ کا اپنے ارد گرد لوگوں سے رابطہ رہے گا۔ پھر حکم ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور قرابت داروں کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور مساکین کے ساتھ اور مسافروں کے ساتھ۔ تو اگر رہبانیت اختیار کی جائے گی تو یہ سب کچھ کہاں جائے گا۔ پھر تو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی نا۔ کیونکہ قرآن پاک میں جو

احکامات ہوتے ہیں ان پر عمل فرض ہوتا ہے۔ آپشن کی گنجائش نہیں ہوتی۔
ہزاروں بزرگوں کی حکایتیں سب کی نظروں سے گزری ہوں گی۔ سید علی ہجویری، خواجہ نظام الدین، بہاؤالدین زکریا ملتانی، بابا فرید الدین رحمہ اللہ علیہم جیسے ہزاروں بزرگ گزرے ہیں۔ مختلف کتابوں میں ان بزرگوں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں مختلف حالات درج ہیں۔ ایک بزرگ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب ان کو ان کے والد ان کے ہونے والے مرشد کے پاس لے گئے تو مرشد نے باطنی نگاہ سے مستقبل کے ولی اللہ کو پہچان لیا۔ والد صاحب کو رخصت کیا۔ اور پھر مرید سے فرمایا کہ یہ کمرہ ہے۔ اس میں بند ہو جا۔ اور جب تک میں نہ کہوں یا کمرے کا دروازہ نہ کھولوں، دروازہ نہیں کھولنا۔ اور ساتھ میں انہیں اک ورد سکھا دیا کہ اس کو پڑھتا رہ۔ بارہ سال گزر گئے۔ اب بندہ کہے کہ بارہ سال تک کیا اس کو کھانے پینے کی اشیاء دینے کے لیے فرشتے آئے ہوں گے، حضرت بی بی مریم علیہا السلام کی طرح۔ پھر جب وہ بچہ آیا تھا تو اس وقت ان کی عمر کوئی دس سال کے لگ بھگ تھی۔ اب دس کا بچہ ہو، وہ کتنے دن بھوک پیاس برداشت کر سکتا ہے۔ یا چلیں سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے مرشد نے انہیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی طریقے سے مہیا کرتے ہوں گے۔ لیکن دس کے بچے پر نماز فرض ہے۔ پھر اللہ کے حکم کے مطابق جماعت کے ساتھ فرض ہے۔ تو بارہ سال بچے میں بچہ جوان ہوا۔ اس نے جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھی۔ کیونکہ جہاں ان کی

ریاضت کے بارے میں لکھا ہوا ہے، وہاں اگر انھوں نے نماز پڑھی ہوتی تو یہ کچھ بھی لازمی لکھا ہوتا۔ کیا کوئی بھی آج کا کوئی بھی عالم، سوائے غامدی صاحب کے، عمار ناصر صاحب کے یا عامر لیاقت حسین کے یہ بتا سکتا ہے کہ جماعت کی نماز کس کیا اس طرح معاف کروائی جا سکتی ہے اور نماز پر ریاضت کو ترجیح دی جا سکتی ہے؟ ہر گز نہیں۔

اسکے بعد اللہ نے بہت سے بزرگوں کو ولی، قطب، ابدال، غوث کے درجے پر فائز کیا۔ مجھے تو یہ القابات ہی سمجھ نہیں آتے۔ کیا اللہ نے قرآن پاک میں یہ القابات اس حکم کے تحت بیان فرمائے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کیے بہت بعد کچھ امتی ان القابات کے لائق ہوں گے۔ یا پھر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے بعد آنے والے اپنی امت کے بہترین لوگوں کے لیے یہ القابات وضع کیے تھے۔ چلیں جو بھی ہے، تصوف کے کھیل ہیں، میری سمجھ سے باہر۔ لیکن کیا کوئی ان اولیاء سے ثابت کر سکتا ہے کہ انھوں نے کہا ہو کہ وہ داتا ہے (جبکہ دینے والی ذات صرف اور صرف اللہ کی ہے)۔ سورۃ الحدید کی آیات ۲۸ ۔ ۲۹ میں اللہ فرماتے ہیں: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وہ تمھیں اپنی رحمت سے دوہرا حصہ دے گا اور تمھیں ایسا نور عطا کرے گا تم اس کے ذریعہ سے چلو اور تمھیں معاف کر دے گا، اور اللہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔ تاکہ اہل کتاب یہ نہ سمجھیں کہ (مسلمان) اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے، اور یہ کہ

فضل تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے دے، اور اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے ۔ کہا لکھا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کچھ دینے والا ہے؟ پھر کیوں ان کی قبروں پر جا کر ان سے مانگتے ہو۔ وہ تو مردہ ہیں اور مردوں کو اپنے حساب کتاب سے فرصت نہیں ہوتی، وہ دنیا والوں کو کیا جواب دیں گے؟ شہید بے شک زندہ ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ وہ اپنی قبر پر آنے والوں کی مرادیں پوری کرتا پھرے۔ ہمارے عوام اندھی تقلید میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے احکامات کو بھول جاتے ہیں۔ باوجود اس کے ان کو علم ہے کہ یہ فوت شدہ ہیں۔ لوگ پھر بھی ان بزرگوں کے دربار پر جاتے ہیں اور ان سے مانگتے ہیں۔ وہاں مرادیں مانگتے ہیں کہ باباجی اگر یہ کام ہو گیا تو چادر چڑھاؤں گا۔ کالا بکرا ذبح کروں گا، وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ قرآن پاک میں اللہ فرماتے ہیں جس کا مفہوم ہے کہ اللہ کے نام کے علاوہ کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا تو وہ حرام ہے۔ اب پھر لوگ کہتے ہیں کہ نام تو اللہ کا ہی لیتے ہیں بس ذبح باباجی کی قبر پر کرتے ہیں کہ وہ قبول کر لیں۔ کوئی بتائے کہ ہم بتائیں کیا۔ جب نیت یہ ہو کہ قبول باباجی کرے، تو گویا نام بھی بابا کا ہی ہوا۔ مجھے اگر کوئی کہے کہ میں آپ کے نام پر دس ہزار روپے کسی ادارے کے کلرک کو دیتا ہوں کہ وہ میرا کام کر لے قبول کرنے والا کون ہوا، میں یا وہ کلرک؟ لوگو! خدا کا واسطہ سمجھو۔ اپنے دین کو، اپنے ایمان کو خراب مت کرو۔

تو میرے عزیز بھائیو اور بہنو! یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو شخص پیر بنا پھرتا ہے، پھرتا کیا ایک جگہ بیٹھا ہے۔ سب سے پہلے تو اسکا ظاہری حلیہ ہی دیکھ لیں۔ اگر شریعت کے مطابق نہیں ہے یعنی بال بڑے بڑے لیکن بکھرے سے اور میلے کچیلے، جسم میل اور دھول مٹی سے اٹا ہوا (صفائی نصف ایمان ہے۔ حدیث)۔ نماز روزہ سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ نماز کا وقت ہوا لیکن نماز کے لیے نہیں گیا۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ تو جواب ملتا ہے کہ ہم نے یہیں بیٹھے بیٹھے پڑھ لی۔ بلکہ یہاں کیا ہم خانہ کعبہ میں پڑھ کر آئے ہیں۔ ہمارا وضو یہاں ہوتا ہے اور نماز خانہ کعبہ میں ہوتی ہے۔ یعنی وہ شخص اپنے آپ کو انبیاء کرام اور صحابہ کرام سے بھی بڑھ کر بتاتا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کہاں کا دین ہے؟ اس کے بعد اس کی حرکت، اگر وہ خواتین سے ملنے میں خوشی محسوس کرتا ہے، جیسا کہ آج کل سوشل میڈیا پر کچھ ویڈیوز وائرل ہوئی ہیں جن میں نام نہاد پیر خواتین کو گلے لگاتے پھرتے ہیں (خواتین سے معذرت کے ساتھ)۔ بھرپور جھپیاں لگاتے ہیں۔ پھر ان کو ماتھے پر بوسہ دیتے ہیں۔ تو یہ کہاں کا اسلام ہے۔ کہاں کا دین ہے؟ کم از کم اسلام میں اس کی بالکل بال برابر بھی گنجائش نہیں۔ پھر ایک ویڈیو میں ایک جوان پیر ایک لڑکی کو سامنے بٹھائے اس کی قمیض کا اگلا دامن اونچا کیے اسکے نیفے کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ پھر تھوڑا سا نیفے میں ہاتھ ڈالتا ہے اور ایک شعبدہ اختیار کرتے ہوئے اپنے بیٹھنے کی دری کے نیچے سے سب کی آنکھ سے چھپاتے ہوئے

ایک گول گول کوئی سفید سی اٹھا کر اس کو نیفے کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر یوں ایک جھٹکے سے نکالتا ہے جیسے اس لڑکے کے پیٹ کے زیریں حصے سے نکالا ہو۔ پھر اس کو اس لڑکے کے گھر والوں اور دیگر حاضرین کو دکھاتا ہے کہ یہ چیز تھی جس کی وجہ سے لڑکی پر جن آیا ہوا تھا۔ اب جن بھاگ گیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ دین اسلام میں خواتین کو چھونے کا اختیار نہیں ہے، چہ جائیکہ اس کے بدن کے ساتھ کھیلنا۔

میرے بھائیو اور بہنو! آپ کے ہاں اولاد نہیں ہے تو بھی بابا کیا دے گا۔ اولاد اور اس کی رزق کا وعدہ اللہ نے کیا ہوا ہے۔ آپ اپنا حیلہ کریں۔ ساتھ میں خواتین سورہ مریم کی تلاوت صبح کی نماز کے بعد پابندی سے کیا کریں۔ مرد حضرات حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا " شرح دعاء :رَبِّ هَبْ لِی مِن لَّدُنکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ط۔اِنَّکَ سَمِیعُ الدُّعَاءِ۔ کو ہر نماز کے بعد اپنا ورد بنالے۔ اگر نصیب میں اولاد ہوئی تو ان شاء اللہ ضرور عطا ہو گی۔ اگر آپ کے گھر میں کوئی پریشان ہے، کوئی تکلیف ہے، کوئی بیمار ہے، کسی پر آپ کو شک ہے کہ جادو ٹونہ کیا ہوا ہے۔ تو اللہ پاک کے قرآن میں ہر چیز موجود ہے۔ نماز کی پابندی کریں۔ تلاوت کی پابندی کریں، چاہے روزانہ ایک رکوع ہی پڑھیں۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ جس گھر میں نماز اور تلاوت کی پابندی کی جاتی ہو، وہاں جادو ٹونہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ پھر جادو ٹونہ کا بہترین علاج

معوذتین یعنی سورۃ فلق اور سورۃ الناس ہیں۔انہیں پڑھ پڑھ کر متاثر پر دم کریں بھی اور پانی پر بھی دم کرکے پلائیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے اگر مریض ٹھیک نہ ہوا تو پھر کہیے گا۔ جو شخص بیمار ہے، دوائیوں سے ٹھیک نہیں ہو رہا، آب زم زم پر سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کریں اور پلائیں اس نیت سے کہ اللہ مریض کو روحانی و جسمانی شفا عطا فرمائے۔ ان بابوں ، اور نواب پیروں سے نجات نہ ملی تو کہیے گا۔ جو اللہ کے فرمان کے مطابق اللہ کے کلام کے بدلے پیسے لیتے ہیں وہ کیسے کسی کا علاج کریں گے۔آزمائش شرط ہے۔

خدا کی لاٹھی بے آواز ہے

گزشتہ دنوں ایک خبر نظر سے گزری کہ اٹلی کی اعلیٰ عدالت نے خوراک کی چوری کے ایک مقدمہ میں تاریخی فیصلہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ مدعا علیہ نے ضرورت کے تحت خوراک اٹھائی اس لیے یہ جرم کے زمرے میں نہیں آتا۔ عدالت نے فیصلہ صادر کیا ہے کہ بھوک سے بچنے کے لیے خوراک چوری کرنا جرم نہیں ہے۔ خبر کی مزید تفصیل کیا لکھوں۔ یہ خبر پڑھ کر پہلے تو خبر دینے والے پر رحم آیا جو ہماری اسلامی تاریخ سے نابلد ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قحط پڑا تو انھوں نے چوری کی حد والی سزا یعنی ہاتھ کاٹنے کی موقوف کرادی۔ انھوں نے کہا کہ اس حالت میں جو چوری کرے گا وہ ظاہر ہے مجبور ہو کر کرے گا۔ بھوکے مارے کرے گا۔ ہمارا رپورٹر اٹلی کی عدالت کے کیے گئے فیصلے کو تاریخی فیصلہ قرار دیتا ہے۔ اگر یہ فیصلہ تاریخی ہے تو پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ کیا تھا؟ ویسے تو چوروں کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔ اس کی پوری تحقیق ہوتی ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس پاکستان اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے نام پر بننے والا دنیا کا پہلا ملک، لیکن اسی اسلام کی تعلیمات سے بالکل ناواقف۔ یہاں حد کا نفاذ تو دور کی بات، اصلی چور کو ہر طرف سے چادر مل جاتی ہے۔ اصلی چور کو ہر طرف شاباش مل جاتی ہے۔ اس کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ اسمبلی کا بائیکاٹ کرکے ہو یا پھر اس

کے حق میں ہاتھ کھڑا کرکے۔ لیکن افسوس یہاں مسجد سے جوتا چرانے والے کو سزا مل جاتی ہے۔ اس کا منہ کالا کرکے محلے بھر میں گھمایا جاتا ہے، لیکن پانچ لاکھ ڈالر کی چوری کرنے یا منی لانڈرنگ کرنے والے کو باعزت بری کر دیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ اس کے خلاف ثبوت کوئی نہیں۔

کہا گیا کہ میٹرو بس سروس شروع کرنے سے عوام کا معیار زندگی بلند ہوا۔ یقیناً ہوا۔ اس سے انکار نہیں کہ اپنی بہترین کاروں میں سفر کرنے والے اب میٹرو میں سفر کرتے ہیں اور جس طرح ایک عام مزدور دیہاڑی دار دھکم پیل کرکے گاڑی میں سوار ہوتا ہے یا اپنا سٹاپ آنے پر وہاں سے نکلتا ہے، اسی طرح یہ بہترین کار میں سفر کرنے والا فرد بھی سفر کرتا ہے۔ لیکن کیا سفر کو آسان کرنے سے ایک بھوکے کو کھانا مل جاتا ہے؟ کسی مریض کو ہسپتال میں عین وقت پر ڈاکٹر مل جاتا ہے؟ صفائی کا صاف پانی اس کی قسمت میں لکھا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ میٹرو بننے پر البتہ ٹھیکیداروں کے گھروں میں صاف پانی کے فلٹروں کا تو اضافہ ہوا ہوگا۔ ان کو پرائیویٹ ڈاکٹر کو اپنی مرضی کے وقت پر دکھانے کے لیے سہولت تو مل گئی ہو گی۔ ان کو کسی فائیو سٹار ہوٹل کے روف ٹاپ پر کھانے کی آسانی تو میسر ہو گئی ہو گی۔ لیکن اورنج ٹرین، گرین لائن یا میٹرو بس ٹائپ کی سروسز شروع کرنے سے آج تک کسی غریب کو تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا میسر نہیں ہوا۔ کسی غریب کے گھر دو وقت چولہا نہیں جل سکا۔

اب رمضان پیکج کے نام سے غریبوں سے ایک اور مذاق کیا گیا۔ ایک ارب پچھتّر کروڑ روپے رمضان پیکن کے طور پر منظور کیے گئے۔ بیس کروڑ کی آبادی پر تقسیم کریں تو آٹھ روپے پچھتّر پیسے فی فرد تقسیم ہوتے ہیں۔ تمام بیس کروڑ پر اسلیے تقسیم کیے گئے کہ ضرورت کے وقت ہمارے امیر ترین افراد بھی غریب بن جاتے ہیں۔ اب کیا کوئی بھی ماہر معاشیات جن میں اسحاق ڈار سرفہرست ہیں، یہ بتا سکتے ہیں کہ ان آٹھ روپے پچھتّر پیسے میں ایک فرد پورے انتیس یا تیس روزے کیسے گزارے گا۔ ایک فرد۔ نہ کہ چار پانچ افراد پر مشتمل ایک خاندان پینتیس روپے میں یہ گزارہ کرے گا۔ افسوس کا مقام ہے۔ اگر یہ پیکج مہیا کرنے کی بجائے عوام کو رمضان میں کھلے عام سحر و افطار ہی کرادیتے، تو عوام دعائیں ہی دیتے۔ اگر سعودی عرب کی طرح ہر مسجد میں سحر و افطار کے وقت یہ اہتمام کرتے تو کیا مضائقہ تھا۔ لیکن اگر حکومت یہ کام کرنے لگ جائے تو پھر حکومت کے کام کون کرے گا؟ ہے نا بہت اہم سوال۔۔۔ سونے پہ سہاگہ ابھی رمضان آیا نہیں لیکن ہمارے مسلمان بھائیون نے مہنگائی کے جن آہستہ آہستہ بوتل سے نکالنا شروع کر دیا ہے۔ پھلوں اور سبزیوں کی قیمت سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس بار بھی امیر ہی عیاشی کریں گے اور غریب صرف انہیں دیکھ کر ترسیں گے۔ اگر حکومت ایک مہنگائی پر ہی قابو پانے میں ناکام رہتی ہے تو قومی معاملات کے امور پر قابو پانا تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔

اگر ایسے حالات میں کسی دکان سے کوئی غریب یا کوئی کوڑا کرکٹ اٹھانے والا کسی دکان سے کوئی کھانے کی چیز اُچک کر بھاگ جاتا ہے تو دکانداروں سے گزارش ہے کہ وہ کبھی کبھی اس غریب کو جانے دیا کریں یہ سوچ کر شاید اس طرح اللہ پاک اس کا کوئی گناہ معاف کر دیں۔ خود بھی کبھی کبھی زکوۃ کے طور پر کچھ کھانے پینے کا سامان دکان سے باہر رکھ دیا کریں تاکہ غریب اس کو بنا کسی جھجھک کے اٹھا کر کھا سکیں۔ یہ تو سر راہ ایک بات ہو گئی۔ بات ہو رہی تھی کہ ہم یورپین ممالک میں ہونے والے انصاف کو تو سراہتے ہیں لیکن اپنی تاریخ اٹھا کر نہیں دیکھتے کہ یہ سب ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ تاریخ بھی نہیں بلکہ ہمارے دین اسلام کا حصہ ہے۔ اسلام نے جو زکوۃ کا نظام وضع کیا ہے اگر پوری طرح لاگو ہو جائے تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس پاکستان میں کوئی بھی غریب رہ جائے۔ کوئی بھی کسی جھونپڑے میں رہے۔ ہر کسی کو دھوپ بارش سے بچنے کے لیے چھت میسر ہو گی، چاہے کچی ہو۔ ہر کسی کو دو وقت کا کھانا میسر ہو گا، چاہے دال ہو۔ ہر کسی کو علاج کی سہولت ملے گی۔ پھر کوئی کسی غریب کا منہ کالا کرکے اس کو محلے میں نہیں پھرائے گا۔

ویسے تو اس حمام میں سارے ننگے ہیں۔ اور خود ننگے ہونے کے باوجود دوسروں پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اپنے گریباں میں کوئی نہیں

جھانکتا۔ ایک حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ تم سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔ اس حدیث کے مفہوم کو اگر میں اس طرف لے کر جاؤں کہ پہلے اپنے آپ کو درست کرو، پھر دوسروں کو درست ہونے کی تلقین کرو، تو فائدہ ہوگا۔

رسول پاک ﷺ کے پاک ایک خاتون اپنے بچے کے ساتھ آئیں۔ عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ ، میرا بیٹا میٹھا بہت کھاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کل آنا۔ اگلے دن وہ خاتون دوبارہ اپنے بچے کے ساتھ گئیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے بچے سے صرف اتنا فرمایا کہ بیٹا زیادہ میٹھا مت کھایا کرو۔ جب وہ خاتون چلی گئیں تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ۔ یہ بات تو کل بھی فرما سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کل میں نے خود کھجوریں کھائی ہوئی تھیں تو بچے کو کیسے منع فرماتا۔

حضرات غور کریں۔ بظاہر کوئی بڑی بات نہیں۔ ہمارے آقا تھے۔ سب آپ ﷺ کی سنتے تھے، مانتے تھے، کیا انسان، کیا چوپائے۔ لیکن پھر بھی انسانیت کے لیے ایک نمونہ تو چھوڑنا تھا۔

خدارا جن کو اللہ نے اختیار دیا ہوا ہے، اس کو مثبت استعمال کریں۔ ایک دوسرے کی تنخواہیں بڑھانے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیں۔ اپنی تنخواہیں تو چار سو فیصد بڑھا دیں جبکہ ہر ہر سہولت بھی آپ کو میسر ہے۔ لیکن جس عوام کو ہر سہولت درکار ہے، ان کی تنخواہ میں کیا اضافہ ہوگا، یہی کوئی دس سے بیس فیصد۔ ان الفاظ کے ساتھ کہ خسارے کا بجٹ ہے۔ اگر آپ لوگ اپنی تنخواہیں

کم کر دو، یا بالکل نہ لو تو کیا حرج پڑتا ہے، باقی تو ساری سہولیات آپ کے پاس ہیں۔
آپ ذرا ان لوگوں کے بارے میں سوچیے جو فٹ پاتھ پر سوتے ہیں اور دن کو محنت مزدوری کر کے، جو کبھی ملتی ہے، کبھی نہیں، اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ آپ نے اگر اپنی عاقبت، آخرت سنوارنی ہے تو یہی لوگ آپ کی گواہی دیں گے۔ ان کی گواہی کو اپنے حق میں کرائیں۔ ورنہ خدا کی لاٹھی بہت بے آواز ہے۔

شفاخانے یا مافیا راج

جب چار روپے کا کیپسول آپ کو چار سو روپے کا ملے اور جو نہ لے سکیں وہ سو روپے کا کیپسول اسی فارمولے کا لیں جو کہ نقلی ہو تو بندے پہ کیا گزرتی ہے۔ چار سو روپے کے خریدار کا مریض اگر اللہ کی مرضی ہو تو بچ جاتا ہے، اور سو روپے کے خریدار کا مریض اللہ کی رضا سے اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ قصور کس کا؟ دکان دار کا؟ ڈاکٹر کا؟ یا پیسے کا؟ جہاں تک میرا تجربہ اور علم کہتا ہے قصور سب کا ہے اور سب سے بڑھ کر اس فیکٹری کا جس میں وہ دوائی بنائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فیکٹری نے وہ دوائی بیچنی ہے۔ اور اپنے مسابقتی ادارے کے مقابلے میں لیڈ حاصل کرنی ہے۔ اور اتنا کمانا ہے کہ اپنے ملازمین کو بھی دے سکے اور مالک اپنی تجوریاں بھی بھر سکے۔ اصل میں کھلی دوائی پاکستان میں آتی ہے۔ اس کو یہاں پر گولیوں کی صورت میں تبدیل کر کے اس کی پیکنگ بنائی جاتی ہے یا پھر انہیں کیپسول میں بند کیا جاتا ہے۔ بہت کم دوائیں ایسی ہوتی ہیں جو پاکستان میں بنتی ہیں۔ لیکن ہم ایک مثال کے طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ستر فیصد دوائی پاکستان میں بنتی ہے۔ اب ہوتا یہ ہے جو دوائی پیک ہو کر ایک صارف کے پاس پہنچتی ہے اس کی قیمت چار سو روپے ہوتی ہے۔ اب یہ چار سو روپے کس کس پر تقسیم ہوتے ہیں یہ بھی پڑھ لیں۔ اس میں مالک کا حصہ، اس میں میڈیکل کمپنی کے نمائندے کا حصہ (کمیشن)،

اس میں ڈاکٹر کا حصہ، اس میں دکاندار کا حصہ۔ مالک، نمائندہ اور دکاندار کی تو سمجھ آتی ہے، یہ ڈاکٹر کا حصہ کس لیے۔ کیا کوئی بھی ذی ہوش فرد یہ بتا سکتا ہے کہ ڈاکٹر کے حصہ کی کیا تک بنتی ہے؟ ڈاکٹر کا تو کام ہے کہ وہ مریض کو دوائی لکھ کر دے۔ اسکے پاس میڈیکل کمپنی کا نمائندہ صرف اپنا بروشر رکھ چھوڑے اور چلا آئے۔ ڈاکٹر اس کو پڑھے اور اگر مناسب سمجھے تو وہ دوائی لکھ دے، نہیں تو جس کمپنی کی چاہے لکھ دے۔

لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے۔ کمپنیوں کے نمائندوں کے لیے باقاعدہ دن یا دن میں کوئی وقت مخصوص کیا ہوتا ہے۔ بہت سارے نمائندے اکٹھے ہو کر یا ایک ایک ہو کر جاتے ہیں۔ اپنا بروشر پیش کرتے ہیں اور ساتھ میں کچھ آفر بھی۔ وہ آفر مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ جس میں دوائی کی مخصوص مقدار کے بیچنے کے متبادل مختلف آفرز ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر آلٹو گاڑی کی آفر، پلاٹ کی آفر، مکان کی آفر، یا پھر بیرونِ ملک ایک ٹرپ بشمول ویزہ اور کرایہ کے اخراجات۔ اگر کوئی ڈاکٹر اس بات سے انکار کرتا ہے کہ ہر گز ایسی آفر نہیں ملتیں تو وہ بتائیں کہ جب مارکیٹ میں میپرازول نامی دوائی اسی نام سے موجود ہے، جو سستی بھی ہے اور کارآمد بھی تو وہ یہ دوائی کیوں نہیں لکھتے۔ اسکے متبادل اسی فارمولے کی دوسری مہنگی دوائی کیوں لکھتے ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں میں کام کرنے والے بتائیں کہ ان کو جو دوائی سرکاری طور پر بتائی جاتی ہے کہ یہ

لکھیں، وہ پھر بھی مہنگی دوائی کیوں لکھتے ہیں۔ ہسپتالوں میں جب ہر قسم کا میڈیکل ٹیسٹ کرنے کی سہولت موجود ہوتی ہے تو وہ پھر بھی کسی مخصوص لیبارٹری کی طرف کیوں بھیجتے ہیں۔ اور اگر مریض کسی دوسری لیبارٹری سے ٹیسٹ کروا کرلے آئے تو اس کو قبول کیوں نہیں کیا جاتا ہے۔ کیا کوئی ڈاکٹر بتائے گا؟ کیسے بتائے، وہ تو سر سے پاؤں تک کمیشن مافیا کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے ہیں۔ ان کو گاڑی، بنگلہ، پلاٹ، تھائی لینڈ کی سیر جب مفت میں مل رہی ہو تو انہیں کیا لگی کہ مریض مرے یا جئے۔ انہیں اپنے پیسوں سے مطلب ہوتا ہے۔

ہسپتالوں میں دوائی کا نہ ملنا بھی ایک اور بڑی بیماری ہے۔ تقریباً ہر ہسپتال کو ایک بڑی مقدار میں دوائیاں مہیا کی جاتی ہیں، جن میں ہر قسم کی دوائیاں موجود ہوتی ہیں، لیکن پھر بھی دوائیوں کی کمی ہی ملتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ کو ڈکلوران کا انجکشن تو لگا دیا جاتا ہے، لیکن اگر اس سے آرام نہیں آتا اور ڈاکٹر تھوڑا سا ہائی انجکشن لکھ دیتا ہے تو وہ مریض کو باہر سے لانا پڑتا ہے۔ پرائیویٹ ہسپتالوں میں یہ صورت حال ہرگز نہیں۔ کیوں کہ انھوں نے تو مریض کو الٹی چھری سے ذبح کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں ہی ایک رشتہ دار کا ایک پرائیویٹ ہسپتال میں گردے کا آپریشن ہوا۔ صرف آپریشن کے لیے چار لاکھ پچانوے ہزار روپے ادا کرنے پڑے۔ کوئی بتائے کہ کیا انھوں نے سونے یا ہیروں سے بنے اوزار استعمال کیے ہیں

اور استعمال کے بعد پھینک دیے ہیں۔ یقیناً پھینک دیے ہوں گے لیکن سٹین لیس اسٹیل سے بنے اوزار، جن کی کل قیمت شاید پانچ ہزار روپے بھی نہ بنتی ہو۔ اب بتائے کوئی کہ بقیہ چار لاکھ نوے ہزار کس چیز کے لیے ہیں؟ کوئی بہترین جواب نہیں ہوگا۔ خیر بات ہو رہی تھی دوائیوں کی موجودگی کی۔ تو ہسپتالوں میں یہ صورت حال ہے۔ صوبہ پنجاب میں البتہ نسبتاً بہتر ہے۔ ایمرجنسی میں یا او پی ڈی میں وہ دوائی یا انجکشن جو ہسپتال میں ہی مریض نے استعمال کرنا ہے، وہ لازماً موجود ہوتا ہے۔ ہاں جو دوائی ڈاکٹر گھر کے استعمال کے لیے لکھ کر دیتے ہیں، ان میں سے تقریباً پچاس فیصد مریضوں کو دوائی مہیا کرنے والے دو لحاظ سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کو دوائی سمجھ ہی نہیں آتی کہ کیا لکھا ہے تو وہ نہیں ہے کہہ کر جان چھڑا دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ سمجھ تو آ گئی لیکن دیں کیوں؟ تو نہیں ہے کہہ کر انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس سے مہنگی دوائی انھوں نے دے دی، لیکن سستی دوائی کی موجودگی سے ہی انکار کر دیا۔ یہ پنجاب کے اکثر ہسپتالوں میں دیکھا گیا ہے۔

صوبہ پنجاب کی نسبت کے پی کے چھوٹے شہروں کے ہسپتالوں کا تو سب کچھ ہی نرالا ہے۔ ایک ایمرجنسی ہے تو دو ڈاکٹر موجود ہیں۔ مریض سے کیفیت پوچھی اور دوائی / انجکشن لکھ دیا۔ یہ نہیں کہ مرض کو جانیں، اس کی جڑ تک پہنچیں کہ ہوا کس وجہ سے ہے۔ یوں ، پانچ منٹ میں دس مریض بھگتائے جاتے ہیں۔ اس دوران

ان کے پاس میڈیکل کمپنی کے نمائندے بھی اپنے بروشرز کے ساتھ آتے ہیں۔ ان کو ملنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ نمائندہ صرف بروشر دکھا کر اور اپنی دوائی پر انگلی رکھ کر، کس مرض کے لیے ہے، بتا کر چلا جاتا ہے۔

ایمرجنسی میں ہر وقت کم سے کم دس بارہ مریض موجود ہوتے ہیں، ایک جاتا نہیں کہ دو مزید آ جاتے ہیں۔ دو ڈاکٹروں کے پاس ایک وقت میں دس سے زیادہ مریض کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جو مریض زیادہ تکلیف میں ہوتا ہے، وہ پیچھے کھڑا یا بیٹھا ہوتا ہے، جب کہ کم تکلیف والا مریض ڈاکٹر کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ کم سے کم چار سے چھ ڈاکٹر موجود ہوں۔ اور ان کو باقاعدہ کرسی میزیں دی ہوئی ہوں۔ نہ کہ سارے ڈاکٹر اس طرح بیٹھے ہیں کہ اگر مریض بیچ والے ڈاکٹر کے پاس بیٹھا ہے تو آگے والے ڈاکٹر کے پاس جانے کی گنجائش ہی نہیں۔ مریض کا ڈاکٹر کے پاس جانا، اس کا چیک اپ کرنا اور نکلنا بہت آسان ہونا چاہیے۔ نہ دوسرے مریض پریشان ہوں اور نہ ان کو چیک اپ کروانے میں کوئی تکلیف ہو۔ لیکن کے پی کی گورنمنٹ واقعی میں عمران خان کے پیچھے صرف نعرے مارنے تک رہ گئی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ تجربہ کار سٹاف ہونا چاہیے۔ وہی چھوٹے شہروں میں دیکھا گیا ہے کہ نا تجربہ کار سٹاف مریضوں پر تجربہ کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے خود ذاتی طور پر تجربہ ہوا ہے کہ نا تجربہ کار سٹاف نے انجکشن لگانا تھا۔ اس کو

رگ ہی نہ ملی۔ سرنج کی سوئی گوشت میں اتار دی۔ شکر ہے اس کو یہ معلوم تھا کہ جب تک رگ نہ ملے اور سرنج میں خون کو نہ کھینچ لو، تب تک انجکشن نہیں لگانا۔ اس نے رگ ڈھونڈنے سے پہلے بازو میں دو سوراخ کیے تھے۔ میں تو چلو برداشت کر گیا کہ تکلیف کچھ اور تھی۔ لیکن اگر کوئی مریض جو سخ درد کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہا ہو، اس پر اگر اس طرح کے تجربے کیے جائیں گے تو اس نے تو اپنا مرض بھول کر سٹاف کو دو ہتڑ لگا دینی ہیں۔ اور پھر میڈیکل سٹاف اور ڈاکٹر کہیں گے کہ مریض نے بد تمیزی کی ہے۔ ڈاکٹر حضرات سے، حکومت وقت سے گزارش ہے کہ کمیشن مافیا کو روکیں۔ ان کا سد باب کریں تا کہ مریض کو دوائی بھی سستی ملے اور ہر وقت بر وقت ملے۔ نا کہ ہمیشہ کی طرح مریض کے لواحقین مریض کے دوائی نہ ملنے کی وجہ سے، یا ڈاکٹر کی عدم دستیابی کی وجہ سے سڑکوں پر احتجاج کرتے پھریں۔

قادیانیوں، ملحدین اور لادین لوگوں کا دین اسلام پر حملہ

یہود و نصاریٰ و ہنود مسلمانوں میں ان کے اپنے ہی دین اسلام سے متعلق شکوک و شبہات پھیلانے میں تب سے دل و جان سے محنت کر رہے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے نبوت کا اعلان کیا تھا اور ریاست مدینہ کی اسلامی بنیاد ڈالی تھی۔ ان سب سازشوں کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی منافقوں کا سردار تھا۔ اس نے اسلام کے پردے میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف یا تو خود سازشیں کیں، یا ہر سازش کا حصہ رہا۔ بنیادی طور پر وہ یہودی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے اس کی ہونے والی سرداری اس سے چھن گئی تھی جس کی وجہ سے وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کی رسول اللہ ﷺ سے وفاداری دیکھ کر وہ یہ جان گیا تھا کہ اگر ہوشیاری سے کام نہ لیا گیا تو وہ بھی جان سے جائے گا اور اس کے ساتھ دینے والے بھی۔ تو اس نے چولا بدلا۔ اس نے بظاہر کلمہ پڑھا۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آیا۔ لیکن اللہ تو سب جانتا ہے۔ اللہ نے فرمایا:

"اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور قیامت پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں۔ وہ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں ہیں۔"۔ سورۃ البقرۃ۔ آیات ۹-۱۰

یہ اس وقت کی بات تھی۔ اور اِس وقت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۷۴ میں قادیانوں کو پارلیمنٹ ایکٹ کے ذریعے غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ جب کہ وہ اس وقت سے ہی غیر مسلم تھے، جب سے ان کے مرزا قادیانی نے نبوت کا جھوٹا دعوی کیا تھا۔ اور اس کے بعد سے اب تک قادیانی اس کوشش میں ہیں کہ کسی بھی طرح خود کو مسلم کہلوا کر دین اسلام کی جڑوں میں بیٹھ کر اس کو کاٹ ڈالیں۔ کیونکہ ان کے تو صرف ہاتھ پاؤں چلتے ہیں، دماغ تو ان کے پیچھے بیٹھے ان کے آقاؤں کا چلتا ہے۔ جن میں برطانیہ، اسرائیل سر فہرست ہیں۔ لیکن دین اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے کہ اس ذات نے ہمارے لیے یہ دین پسند کیا ہے۔ تو کسی کی کیا مجال کہ اس کو رتی برابر بھی نقصان پہنچا سکے۔ ہاں، اس وقت جو ظاہر نقصان پہنچ رہا ہے، وہ ہم مسلمانوں کی اپنی چپقلش سے پہنچ رہا ہے۔ ہم مسلمان آپس میں فرقہ فرقہ کھیل رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو جھوٹا اور صرف خود کو سچا کہہ رہے ہیں۔ ویسے قادیانی حضرات سے ایک سوال ہے کہ ان کے جھوٹے نبی نے تو اپنے پیروکاروں کے علاوہ دیگر سب کو کافر قرار دیا تھا۔ خاص طور پر مسلمانوں کو تو پھر وہ خود کو مسلمان کیوں کہلوانا پسند کرتے ہیں؟ ان کے کسی مربی نے کہا تھا کہ مسلمان نہیں، بلکہ مسلمانوں کا ایک فرقہ۔ بات تو وہیں آ جاتی ہے کہ فرقہ سہی۔ جب تمھارے جھوٹے نبی مرزا قادیانی نے دیگر سب مسلمانوں کو کافر قرار دیا تھا تو اِن کافروں کا ایک فرقہ کس لیے بننا چاہتے ہو؟ ایک

اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسا نبی تھا جو اپنے کو نہ ماننے والے مسلمانوں کو تو کافر قرار دیتا ہے لیکن اس کو تو عیسائی، یہودی اور ہندو بھی نہیں مانتے تھے. ان کو تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ بلکہ ان سے تو دوستی کے وہ رشتے استوار کر لیے کہ ان کے آپس میں بھی شاید نہ ہوں۔

پھر جب ان قادیانیوں نے دیکھا کہ ان کی دال نہیں گل رہی۔ تو انہوں نے اپنے آقاؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف نئی سازشیں کیں۔ انہوں نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ خود تو میدان میں نہیں آئے بلکہ ہم مسلمانوں میں ہمارے ہی روپ میں کچھ ایسے لوگوں کو داخل کر دیا جن کا کام میک اپ کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کو گمراہ کرنا ہے۔ وہ بظاہر ہیں تو مسلمان ہی۔ ان کے نام مسلمانوں کے، ان کے کام مسلمانوں کے۔ وہ ہر کام سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے اُن آقاؤں کی مدد سے بننے والے میڈیا بھرپور استعمال کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ خاص طور پر الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کو اس طرح استعمال میں لا رہے ہیں جیسے یہ بنے ہی صرف اور صرف ان کے لیے ہوں۔ اور یقینا ایسا ہی ہے۔ یہ طبقہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا اپنا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ اور ہم مسلمان اندھی تقلید والے، کہیں سے بھی تھوڑی اس طرح کی دلیل مل جائے جو دل پر لگ جائے، تو اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ ہم مسلمانوں میں ایک سب سے بڑی خرابی سب سے پہلے ان عیسائیوں، یہودیوں نے پروپیگنڈہ کر کرکے یہ پیدا کی

کہ وہ ہمارے رہنما جو ہمیں دین کی باتیں سکھاتے تھے، ہمارے اندر دین کو کوٹ کوٹ کر بھرتے تھے، ان سے ہمیں یہ کہہ کر متنفر کر دیا کہ یہ نعوذ باللہ، دہشت گرد ہیں، یا ان کے پشت پناہی ہیں۔جب کہ ہر گز ایسی بات نہیں۔ مسلمان نہ کبھی دہشت گرد تھا، نہ ہو گا۔ اور خاص طور پر یہ لوگ، جو ہمیں دین سکھاتے ہیں وہ تو ہو ہی نہیں سکتے۔ ارے وہ لوگ جب خود دین سیکھتے ہیں اور وہ لوگ جو بیکن ہاؤس، ایچی سن ، ہاورڈ، کیمبرج یا آکسفورڈ میں پڑھ کر آتے ہیں یا پاکستان سے ہی انجنیئر ، ڈاکٹر بنتے ہیں تو ان میں کتنا فرق آجاتا ہے۔ پہلے والے جب گھر میں آتے ہیں تو ہر گز اونچی آواز میں بات نہیں کرتے کہ مبادا ان کے والدین برا نہ مان جائیں، کہیں ان کی شان میں گستاخی نہ ہو جائے۔ اور دوسرے نمبر والے جب گھر آتے ہیں تو ان کے والدین اونچا نہیں بولتے کہ ان کی اولاد کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ کہیں وہ یہ نہ کہیں کہ ان کے والدین کو بولنا نہیں آتا۔جب شخص صرف اپنے والدین کی شان میں گستاخی سمجھتے ہوئے ان کے سامنے اونچا بولنے سے گریز کرے گا، وہ دہشت گرد کیسے ہو گا؟

وہ طبقہ جو یہودیوں، عیسائیوں اور قادیانوں نے مل کر تیار کیا اور مسلمانوں میں داخل کیا ان کا کام مسلمانوں کو دین سے متنفر کرنا تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ مسلمانوں میں میڈیا کے ذریعے ایسی باتیں پھیلاتے ہیں کہ جو مسلمانوں

کو لگیں واقعی وہ درست کہہ رہے ہیں۔ اس طبقے کا سربراہ یا سربراہان میں سے ایک جناب غامدی ٹھہرے۔ جن کی باتیں انٹرنیٹ پر ویڈیو کی صورت میں موجود ہیں۔ جو اپنے ہر دوسرے، تیسرے پروگرام میں اسلام کے کسی نہ کسی مسلے کو اسلام سے ہی خارج کر دیتے ہیں۔ جیسے نامحرم سے ہاتھ ملانا، تراویح کو اسلام سے ہی خارج کر دینا اور اوپر سے کہنا کہ اسلام تو بہت آسان دین ہے، یہ تو دین کے ٹھیکیداروں نے اس کو مشکل بنایا ہوا ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اسلام کے پہلے ٹھیکیدار کون تھے؟ یہ بدبخت اسلام کے ان ٹھیکیدار جنھوں نے ہمیں اس دین سے روشناس کروایا۔ ہمیں دین و دنیا میں راہ راست پر چلنا سکھایا، ان کو غلط کہتا ہے۔ یہاں خدارا، ٹھیکیدار کو منفی معنوں میں نہ لیجیے گا۔ اس طرح کی بہت سی باتیں وہ کرتے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ اسی میڈیا پر بیٹھے ہمارے نام نہاد علماء، جنہیں میں علماء سو ہی کہوں گا، ان کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ اخبارات میں بیان ضرور آ جاتا ہے کہ انھوں نے غلط کہا ہے، لیکن جو اثر میڈیا کے ذریعے وہ ڈال سکتے ہیں، آپ کیوں نہیں؟

غامدی صاحب کی ایک مثال دی ہے۔ اب ہو یہ رہا ہے کہ نسیم کوثر، کنول نور، محمد علی، تنویر احمد جیسے لوگ سامنے آئے ہیں۔ اور خاص طور پر سوشل میڈیا میں انھوں نے ایک گروپ بنا لیا ہے۔ ایک کوئی بات کرتا ہے جو اسلام کے اصولوں کے خلاف ہوتی ہے تو دوسرے ٹھاہ ٹھاہ کر کے اس کی تائید کرتے ہیں۔

ظاہر ہے جبب بہت سارے لوگ تائید کریں گے تو اسلام کے اصولوں سے نابلد لوگ، جو کہ کم علم ہیں، وہ یہی سمجھیں گے کہ جب بہت سے لوگ تائید کر رہے ہیں تو سچ ہی ہو گا۔ پھر وہ کم علم کسی عالم سے پوچھنے کی ہمت نہیں کرتا، کسی مولوی سے، مفتی سے نہیں پوچھتا کہ یہ تو دہشت گرد ہیں۔ تو یہ بات کرنے والے لوگ ہی درست ہوں گے۔ جب کہ یہ ہرگز درست نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے، اور ان کو ان کی یہ تجارت ہرگز فائدہ نہیں دے گی اور وہ ہرگز ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ القرآن۔

ہم بہت کرپٹ ہیں

کچھ سال پہلے محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کے پی کے اور دیگر مختلف محکمہ جات میں اینٹی کرپشن کے محکمہ کی طرف سے بینرز لگائے گئے کہ آپ کو کہیں پر کسی بھی محکمہ میں کوئی رشوت لیتا یا دیتا نظر آئے تو اینٹی کرپشن کے محکمہ کو اطلاع دی جائے۔ یہ بینرز نہ صرف محکمہ جات میں بلکہ سڑکوں کنارے مختلف مقامات پر بھی آویزاں کیے گئے۔ جس دن اداروں میں یہ بینرز آویزاں کیے گئے اسی دن دوپہر کا کھانا اینٹی کرپشن والوں نے ان اداروں میں بیٹھ کر کھایا۔ جب مختلف کسٹمرز نے یا کسی بھی کسی قسم کا تعلق رکھنے والوں نے ان اداروں میں کام کرنے والوں کو کہا کہ اب ہم ہر کام کروانے سے پہلے اینٹی کرپشن کے ان فون نمبرز پر اطلاع دے کر آیا کریں گے کہ ہم فلاں محکمہ میں جارہے ہیں جہاں روپے پیسے کے علاوہ دوسری بات ہی نہیں کی جاتی تو ان اداروں میں کام کرنے والے ان لوگوں پر ہنسنے لگے۔ پوچھنے پر بتایا کہ بھائی جی آپ بہت سادہ ہیں۔ اندر جا کر دیکھ لیں، اینٹی کرپشن والے اندر بیٹھے ہمارے صاحبان کے ساتھ روسٹ چرغے بھنبھوڑ رہے ہیں۔ اور جاتے ہوئے اپنی خالی جیب کو بھر کر جائیں گے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ اگر عوام سے کام کے بدلے میں رشوت لیتے ہیں تو وہ اپنے زور پر لیتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس میں سب سے زیادہ حصہ اینٹی کرپشن والوں کو جاتا ہے اور بعد میں

اور لوگوں کو۔

میں ٹھہرا سادہ آدمی۔ مجھے جس نے یہ بات بتائی میں ہر گز نہ مانا۔ اس نے کہا کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے۔ در حقیقت جس طرح مشہور ہے کہ پولیس کا سپاہی رشوت تب لیتا ہے جب اس کو اوپر سے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سپاہی کو اپنے انسپکٹر کو، اس نے ڈی ایس پی، ایس پی اور اوپر تک سب کو خوش رکھنا ہوتا ہے۔ بے شک ڈی آئی جی، آئی جی نہ لیتے ہوں، جو کہ اندھوں میں کانا راجا والی بات ہے، لیکن صوبائی وزراء، وزرائے مملکت اور دیگر وزیروں کے گھروں میں راشن پانی دینا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کریں تو پھر نہ اس سپاہی، انسپکٹر یا اوپر افسران کی نوکری رہے گی، نہ وہ خود اپنے بال بچوں کو کوئی آسانی مہیا کر سکیں گے۔ اسی طرح مختلف محکموں میں بھی یہی ہوتا ہے۔ بے شک ان اداروں کا سربراہ کچھ بھی نہ لے، لیکن اس سے نیچے جو ان کے پرائیویٹ سیکرٹری، ڈائریکٹران وغیرہ ہوتے ہیں، ان سے اسی کے محکمے کے نیچے کے افراد نے کام نکالنے کے واسطے اپنی فائل کے اندر قائدِ اعظم کی خوبصورت سی تصاویر لگانی بہت ضروری ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر دوسرے شخص کو قائدِ اعظم سے بہت پیار ہے۔ جس طرح بلوچستان کے ایک سیکرٹری کے گھر کی پانی کی ٹینکی سے اربوں روپے برآمد ہوئے۔ میڈیا پر چلا کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک سیکرٹری کو قائدِ اعظم سے از حد محبت بہت مہنگی پڑ گئی۔ تو

اسی طرح ان افسران کو بھی قائدِ اعظم سے بہت محبت ہوتی ہے۔ جب تک کام کے ساتھ ساتھ قائدِ اعظم کی تصویر نہ دیکھ لیں، ان کو نہ کھانا ہضم ہوتا ہے، نہ وہ اپنی کرسی پر ٹک کر بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ بھی کتنے افسوس کی بات ہے کہ جہاں آج ہر جانب کرسی کی لڑائی ہے، وہاں ان افسران کو اس وقت تک کرسی بھی راس نہیں آتی جب تک اس کو لال، سبز، نیلے پہیے نہ لگائے جائیں۔

میرے ایک جاننے والے نے مجھے قصہ سنایا کہ ان کے آفس میں کسی نے اپنی تبدیلی کرائی تھی جو کہ اس کا حق تھا، کیونکہ اس کی فیملی کہیں اور تھی اور اسکی پوسٹنگ کہیں اور تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ایک دوسرے کولیگ کو بھی یہی مسلہ تھا۔ انھوں نے آپس میں مل کر آپس میں تبادلے کی درخواست دے دی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ یہ دونوں راضی تھے، اوپر سے ایک وزیر نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا کہ ان کا حق بنتا ہے کہ اپنے اپنے علاقے کے قریبی سٹیشنوں پر ان کی پوسٹنگ ہو۔ اب ہوا یہ کہ فائل ہر طرح سے مکمل ہو کر جب ادارے کے سربراہ تک پہنچی تو دروازے میں اٹک گئی۔ دروازے کا نام پرائیویٹ اسسٹنٹ تھا۔ اس نے کہا کہ فائل تب اندر جائے گی جب اس کو پہیے لگیں گے۔ دونوں میں سے ایک نے کہا کہ وہ تو ہرگز پہیے نہ لگائے، چہ جائیکہ کہ اس میں تو فلاں وزیر کی بھی جائز سفارش شامل ہے۔ پی اے صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ وزیر صاحب سے کہہ دو کہ پی اے ایسا کہہ رہا ہے۔ دیکھ لیں گے اس

وزیر کو بھی۔ اور اب تو جب تک فائل کو سرخی پاؤڈر نہیں لگے گا، تب تک فائل اس کی دراز میں پڑی رہے گی اور اس کے اوپر وزن بڑھتا رہے گا۔ جتنی دیر کروگے، وزن بڑھتا جائے گا، پھر شاید دن ہفتوں، مہینوں میں تبدیل ہو جائیں۔ اگرچہ پی اے کا مطالبہ کچھ زیادہ نہیں تھا، لیکن پھر بھی جائز طریقے سے ہونے والے کام کو روکا جا رہا تھا۔ جب ہر طرف سے ان دونوں کولیگز کی شنوائی نہ ہوئی تو مجبوراً کوئی دو ہفتوں کے بعد اس پی اے کو مطلوبہ رقم دینی پڑی، تب اس نے وہ فائل سربراہ تک پہنچائی۔ یہ الگ بات کہ سربراہ نے بھی ہرگز نہ پوچھا کہ فائل پر آخری دستخط دو ہفتوں پہلے کا ہے، تو فائل اتنی لیٹ کیوں آئی۔ اگر سربراہ یہ بات پوچھ بھی لیتا تو بھی پی اے کے پاس گھڑے گھڑھائے جواب تیار ہوتے ہیں۔ کیونکہ پی اے ہمیشہ وہی لگتا ہے جو ایک تو گولی دینے کا ماہر ہو، دوسرا چرب زبان ہو اور اپنے باس کو ہر حالت میں قابو کرنے کا ہنر جانتا ہو۔

ہمارے اس دیس میں کرپشن کا یہ حال ہے کہ اکثر اداروں میں جس میں عوامی آمدو رفت بہت زیادہ ہوتی ہے، اس کو اپنا انتہائی معمولی سا کام بھی کرانے کے لیے بہت زیادہ کوفت اٹھانا پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اپنے ہی متعلق کچھ معلومات چاہیے ہوں، اپنی ہی فائل میں سے کسی لیٹر کی نقل چاہیے ہو، جو اس کو لکھا گیا ہے اور اتفاق سے اس وقت وہ ساتھ نہیں لا سکا، جب کام کے لیے

آیا ہے، تو اس نقل کی قیمت بھی اس کو چپڑاسی کو سو دو سو روپے ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ تو صرف ایک نقل کی مثال دی ہے۔ ورنہ کیا کچھ نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا مسلہ یہ ہے کہ ہم سب ہی کرپٹ ہیں۔ ہر لحاظ سے۔ دکاندار ناپ تول میں ڈنڈی مارتا ہے۔ استاد پڑھانے میں کام چوری کرتا ہے۔ اپنی پوری تیاری کرکے نہیں آتا۔ چپڑاسی کو ایک کام کے ساتھ دوسرے کا کہا جائے تو کہتا ہے کہ اس کی یہ ڈیوٹی ہی نہیں ہے۔ حالانکہ کسی بھی دفتر میں کسی بھی فرد کو نوکری پر رکھتے ہوئے جب اس کو تقرر نامہ جاری کیا جاتا ہے تو اس میں ایک شرط یا شق یہ ضرور لکھی ہوتی ہے کہ '' کوئی اور اضافی فرض، جو کہ اس کو سینئرز کی طرف سے تفویض کیا جائے گا، اس کی ادائیگی۔''۔ تو اصولی طور پر کسی بھی ادارے کا کوئی بھی فرد اس شرط کی رو سے کسی بھی سرکاری ڈیوٹی سے کی انجام دہی سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ ہر تقریباً ادارے میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ ہر کوئی اپنے ساتھ کسی نہ کسی بڑے آدمی کا پاوا لے کر آتا ہے۔ اور اس پاوے کو تمام عمر کیش کراتا رہتا ہے۔ یوں پہلے کام چوری اور اس کے بعد کرپشن میں نام پیدا کرتا ہے۔

کرپشن لازمی نہیں کے روپے پیسے کی ہو۔ رشوت ہو یا غبن ہو۔ ہر وہ کام جو اللہ کی مرضی سے کسی بھی انسان کے ذمے لگایا گیا ہے، اسکی بہترین طریقے سے اپنی پوری استطاعت کے ساتھ ادا نہ کرنا بھی کرپشن ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ دھوکہ

کرنا، جھوٹ بولنا، فریب کرنا وغیرہ اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر کوئی چاہے وہ کسی ادارے میں کام کرنے والے چپڑاسی، چوکیدار سے لے کر ادارے کے سربراہ تک کوئی فرد ہو، یا پھر دین فرائض کے انجام دہی سے وابستہ کوئی فرد ہو، یا پھر کسی بھی شعبے سے اس کا تعلق ہو۔ اگر دیے گئے کام کو اس کی روح کے مطابق ادا نہیں کرتا تو میری نظر میں وہ کرپٹ ہے۔ اگر وہ اس کام کو وقت پر نہیں کرتا، جانتے بوجھتے یا سہل پسندی کی وجہ سے، تو بھی وہ کرپٹ ہے۔ ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے دل و دماغ، وقت وپیسے کی کرپشن ہے۔ اس کرپشن سے ہمیں جان چھڑانی ہو گی۔ تب ہی ہم دنیا میں ترقی کر پائیں گے۔ چین کا کوئی بڑا آدمی کسی زمانے میں پاکستان آیا۔ واپس گیا تو پاکستان کی سیر کے حوالے سے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ معلوم نہیں پاکستان چل کس طرح رہا ہے۔ کہ لوگ اس کو اندر سے بھی کھا رہے ہیں اور باہر سے بھی۔

بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں

رسول اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص اسلام قبول کرنے آیا۔ عرض کیا کہ کیا اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بالکل۔ اس شخص نے اسلام قبول کر لیا۔ کچھ عرصے بعد پھر اس شخص کے دل میں کوئی ندامت اٹھی۔ بارگاہِ نبوی ﷺ میں پیش ہوا۔ عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ۔ کیا میرا یہ گناہ بھی معاف ہو جائے گا جو میں نے پورے ہوش و حواس میں ایامِ ضلالت میں انجام دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بالکل۔ پھر اس شخص نے واقعہ سنایا: میرے گھر میں بیٹی پیدا ہوئی۔ میں گھر پر نہیں تھا۔ بیٹی پیدا ہونے کے کچھ عرصہ کے بعد گھر آیا۔ میری بیوی نے بیٹی کو چھپا دیا۔ اور عرصہ پانچ یا چھ سال (راقم کے ذہن سے عرصہ نکل گیا ہے، لیکن اس کے قریب قریب ہی ہے) تک اس نے اس کو میرے سامنے تو کیا، اس کی آواز تک میرے کانوں میں نہ پڑنے دی۔ جب وہ پانچ، چھ سال کی ہوئی تو ایک دن بیوی نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا، لیکن ضبط کر گیا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ اسے سامنے لائے۔ بیٹی سامنے آئی تو میں نے اسے پیار کیا۔ ایک دو دن بعد بیٹی کو بازار سے خریداری کے بہانے ساتھ لے گیا۔ تب تک بیوی کو یقین ہو چلا تھا کہ میں اب اس کو کچھ نہیں کہوں گا۔ بازار جا کر میں نے گڑھا کھودنے کا سامان خریدا۔ پھر ایک ویرانے میں جا کر

بیٹی کو ایک طرف بٹھا کر گڑھا کھودنے لگا۔ جب اتنا ہو گیا کہ بیٹی اس میں سما جائے تو اور مٹی سے پر ہو کر اس کا نام ونشان مٹ جائے تو میں نے بیٹی کو اس گڑھے میں کھڑا کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس پر مٹی ڈالنے لگا۔ پہلے تو بیٹی اس کو مذاق سمجھی، لیکن جب اس کے گھٹنوں سے اوپر مٹی ہوئی تو وہ رونے لگ گئی۔ لیکن میرا دل پتھر ہو چکا تھا۔ اس کی آہ وبکار نے مجھ پر کچھ اثر نہ کیا۔ میں مٹی ڈالتا گیا، اسکی چیخیں بڑھتی گئیں۔ اس نے اپنی میٹھی زبان میں یہ تک مجھ سے پوچھا کہ بابا اس کا قصور کیا ہے۔ اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ لیکن میں خاموش مٹی ڈالتا رہا۔ یہاں تک کہ گڑھا بھر گیا۔ میں نے اپنی بیٹی کو زندہ دفنا دیا۔ یہ سنا کر وہ صحابی خود بھی رونے لگے اور اہل محفل کو بھی رلا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ سنا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اور جب زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ پہ ماری گئی تھی۔۔'' (سورۃ'' التکویر، آیات ۸۔۹)

عرب میں رسم تھی کہ باپ اپنی بیٹی کو نہایت سنگدلی اور بے رحمی سے زندہ زمین میں گاڑ دیتا تھا بعض تو تنگدستی اور شادی بیاہ کے اخراجات کے خوف سے یہ کام کرتے تھے اور بعض کو یہ عار تھی کہ ہم اپنی بیٹی کسی کو دیں گے وہ ہمارا داماد کہلائے گا۔ قرآن نے آگاہ کیا کہ ان مظلوم بچیوں کی نسبت بھی

سوال ہوگا کہ کس گناہ پر اس کو قتل کیا تھا۔ یہ مت سمجھنا کہ ہماری اولاد ہے، اس میں ہم جو چاہیں تصرف کریں بلکہ اولاد ہونے کی وجہ سے جرم اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ مانا کہ پہلے زمانے میں بیٹی کو زندہ درگور کیا جاتا تھا۔ آج کل کے زمانے میں زندہ تو نہیں گاڑھا جاتا، لیکن جو سلوک اس بیٹی کے ساتھ ہوتا ہے وہ اس سزا سے بدرجہا درجہ بدتر ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گھر میں بیٹی نہیں بلکہ کسی مسلمان کے گھر میں کوئی سور یا خنزیر نما جانور پیدا ہو گیا ہے، جس سے سارے نفرت کرنے لگے ہیں۔ کیوں؟ کیا واقعی وہی زمانہ لوٹ آیا ہے جب بیٹی کو اسی لیے زندہ گاڑھا جاتا تھا کہ اس کی ذات پر خرچہ نہ کیا جائے۔ اس کو کہیں وراثت میں حصہ نہ مل جائے۔ شاید یہی بات ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ جس نے اپنی دو بیٹیوں کی یا دو بہنوں کی اس طرح پرورش کی کہ ان کو اچھی تعلیم و تربیت سے نوازا۔ ان کی شادی کی تو وہ قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے انگشتِ شہادت اور ساتھ والی انگلی (رسول پاک ﷺ نے اپنی انگلیوں کو اس طرح کرکے بتایا)۔ کیا ہمارا اسلام صرف مسجد اور مسجد سے گھر واپس آنے تک رہ گیا ہے۔ کیا ہمارا اسلام صرف پیٹ کا روزہ رکھنا رہ گیا ہے۔ جب حج کیا جاتا ہے تو جیسے ہی کسی کا حج مکمل ہوتا ہے تو وہ گویا اس طرح گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے جیسے کوئی ابھی دنیا میں آیا ہوا نومولود بچہ ہو۔ لیکن اکثر یہ دیکھا

گیا ہے کہ اس طرح کے گھروں میں تو خاص طور پر بیٹیوں کو بیٹی سمجھنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اکثر لوگ معلوم نہیں کس زعم میں بیٹی کو بیٹا کہہ کر بلاتے ہیں۔ شاید ان کے لاشعور میں یہ ہوتا ہے کہ کاش اس کی بجائے کوئی بیٹا ہوتا۔ تو کیا ہمیں ہمارا دین یہ سبق سکھاتا ہے کہ بیٹی کو گناہ سمجھا جائے۔

کیا بیٹی اللہ کی مخلوق نہیں۔ کیا آپ کی حیثیت رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر ہے (نعوذ باللہ، میرے منہ میں خاک) کہ اللہ پاک نے ان کو چار خوبصورت رحمتیں عطا فرمائیں، جن کو دیکھ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ اپنی آنکھیں مبارک ٹھنڈی کیا کرتے تھے۔ جو ان کے پیارے گھر کی رونق تھیں۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہو چکی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر کے قریب رہنے کا فرمایا۔ ظاہر ہے دل میں یہی بات تھی کہ جب ان کا دل چاہے گا اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کو، اللہ کی رحمت کو دیکھ آیا کریں گے۔ کیا شان تھی اس بیٹی کی کہ جب ان کے ابا جان ﷺ کہیں سفر پر جاتے تھے تو سب سے آخر میں بیٹی سے مل کر جاتے اور جب سفر سے واپس لوٹتے تو سب سے پہلے اپنی بیٹی کے گھر جاتے۔ اگر بیٹی کی شان ایسی نہ ہوتی تو ہمارے لیے تو ”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ بے شک تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔“ تو ہم نے آپ ﷺ کی پیروی کرنی ہے نہ کہ اپنے نفس کی۔

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جو نفس دنیا میں بھیجا جاتا ہے اس کا سارا رزق اسکے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ جب اللہ نے فرمادیا تو پھر ہم بیٹی کو بوجھ کیوں سمجھتے ہیں۔ یقینا وہ اپنا رزق اللہ کے حکم سے اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ اس دنیا میں بھوکی سوئے۔ اب اس کا رزق کیسے ملے گا، یہ اس کے والدین کو سوچنا ہوگا کہ اللہ نے کیا ذریعہ بنایا ہوگا جو ان تک اس کا رزق پہنچے۔ ایک شخص کے مالک نے کسی بات سے خوش ہو کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔ چند دن گزرے تھے کہ مالک کسی بات پر ناراض ہو گیا۔ تو اس کی تنخواہ کم کر دی۔ اس شخص نے کوئی گلہ بھی نہ کیا۔ اگلے دن مالک نے بلا کر اس سے پوچھا کہ جب تنخواہ بڑھائی تو بھی تم نے کچھ نہ کہا، اب جب تنخواہ کم کی تو بھی کچھ نہ بولے۔ اس شخص نے کہا کہ مالک۔ جب آپ نے تنخواہ بڑھائی تھی تو اس دن اللہ نے اولاد سے نوازا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اللہ نے اس صورت میں اس کے رزق عطا کیا ہے۔ اور جب آپ نے تنخواہ کم کی تو اس دن میری والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ تو یہ بھی سمجھ آ گئی کہ اس کا رزق اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔

بیٹی کو بیٹی سمجھیں۔ وہ کبھی بوجھ نہیں نہیں ہوتی۔ وہ تو گھر کے آنگن میں ایک پھول ہوتی ہے۔ جس کو دیکھ کر، جس کو سن کر آپ کو سکون ملتا ہے۔ یہ بیٹی ہی ہوتی ہے جب آپ کی مشکلات میں شاید آپ کا بیٹا آپ ساتھ نہ دے، لیکن بیٹی

آپ کی مشکلات کو اپنا سمجھ کر اس کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہے۔ اس کی اچھی اور بہترین تعلیم و تربیت آپ کا فرض ہے۔ کیونکہ بیٹے نے تو نوکری کرنی ہے، ایک گھر سنبھالنا ہے لیکن بیٹی نے ایک نسل کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔ جو بیٹی یا بہن کو بوجھ سمجھتے ہیں چاہے وہ والدین ہیں، بھائی ہیں وہ اللہ کے سخت گناہ گار ہیں۔ وہ کیا سمجھتے ہیں کہ اللہ کے دربار میں ان کو جواب نہیں دینا پڑے گا۔ ہر گز نہیں۔ جیسا کہ اوپر سورۃ التکویر کی آیات بیان کی ہیں، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ صرف بیٹی کو گاڑھنے کی صورت میں ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے والے سے بھی اسی طرح سخت پوچھ گچھ ہو گی۔ تو خبر دار رہو کہ یہ بہت شدید پوچھ ہو گی۔ اللہ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

بچوں کے اغوا میں ہم سب کا ہاتھ ہے۔

اسلام پورہ کے علاقے میں ایک خاتون کو لوگوں نے صرف اس لیے مارا کہ اس نے وہاں موجود ایک بارہ سالہ لڑکی کی طرف دیکھا تھا،،لڑکی نے لوگوں کو بتایا کہ یہ میری طرف دیکھ رہی ہے ،اسکے بعد کیا ہونا تھا،اس ذہنی معذور عورت پر اغوا کار کا الزام لگ گیا اور اس کو مردوں نے بھی اس قدر مارا کہ شائد ہی کوئی مرد کسی دوسرے مرد کو اس طرح مارے،،لوگوں کو پتہ نہیں کیا ہوتا جارہا ہے،،،اغوا کے واقعات ہو ضرور رہے ہیں مگر عام لوگوں کو بھی اغوا کار بنا کر انکی تذلیل کی جارہی ہے،پہلے مردوں پر مردوں کا زور چل رہا تھا مگر آج ایک عورت پر بھی مردوں کا زور چل گیا،،اس سے پہلے 50 سال کے ایک غبارے فروخت کرنے والے کو بھی لوگوں نے اغوا کار بنایا اور اسکو مارنا شروع کردیا،،،اس عورت کا صرف اتنا قصور ہے کہ اس نے ایک بچی کی طرف دیکھا مگر لوگوں نے اسکو وہ سزا نہیں دی جو اسکو دینی چاہیے تھی،،،لوگوں کو چاہیے تھا کہ وہ اس عورت کی آنکھیں نکال لیتے جن آنکھوں سے اس نے بچی کی طرف دیکھا، کم از کم مردوں کی مار سے تو بچ جاتی۔۔صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس واقعہ کے پیچھے پاکستان میں اچانک بچوں کے اغوا کے بڑھتے ہوئے واقعات ہیں۔ اس کے پیچھے کیا سازش ہے یا کس کا ہاتھ ہے، فی الحال کچھ بھی منظر عام پر نہیں آرہا۔ یہاں تک کہ طبقہ امراء و

حکام کی جانب سے کوئی تسلی و تشفی کا بیان تک بھی سامنے نہیں آیا۔

یہ اغوا کے واقعات صرف چھوٹے بچوں کے ساتھ ہی نہیں ہو رہے بلکہ اس میں چودہ، پندرہ سال کے اوپر کے بچے بھی اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ حالات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ اب والدین بچوں کو سکول بھیجنے کو تیار نہیں۔ بازار بھیجتے ہوئے بھی ان کو ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں کہ شہر کے کس کونے میں کون کیا ہے؟ بہت سے اجنبی افراد ہمارے ارد گرد گھوم رہے ہوتے ہیں لیکن نفسا نفسی کا زمانہ ہو گیا ہے۔ ہمیں صرف اپنا احساس رہتا ہے کہ ہمیں کچھ نہ ہو، سب کچھ ہمارے لیے خیر ہو، باقی سب کی اللہ جانے۔ جب ہم یہ سوچ رکھیں گے، تو ظاہر ہے ہمیں دوسروں کا کیا علم ہو گا۔ اگر کوئی اجنبی کسی کو کچھ کہہ بھی جائے گا تو ہم ایک ترچھی نظر ڈال کر ہونہہ کہہ کر کٹ مار لیں گے۔

ہمارے محلے میں کوئی بھی گاڑی والا چکر لگاتا ہے۔ ایک نہیں دو تین۔ یہ اندازہ کرتا ہے کہ کون سا بچہ کدھر ہے اور اسکے ساتھ کون ہے۔ کس حد تک داؤ لگ سکتا ہے کہ جھٹ سے اسکے چہرے پر ایک سپرے کیا اور بیہوش ہونے سے پہلے گاڑی میں ڈالا، پھر یہ جا اور وہ جا۔ یا پھر کسی بچے کو آکیلا دیکھا یا دو کی صورت میں۔ ان کو ٹافی بسکٹ کا لالچ دیا، اپنی جیب سے نکال کر دیا، بچے بے ہوش، بندہ ان سمیت غائب۔ کوئی پوچھے گا بھی نہیں کہ بھئی تم کون ہو، اس بچے کو کہاں سے لا رہے ہو، کہاں لے جا رہے ہو۔ کیوں کہ جان نہ پہچان میں تیرا مہمان والا حساب ہے۔

وہ کہے گا کہ اس بچے کا ماما ہوں۔ ہم کہیں گے اچھا ٹھیک ہے۔ بات ختم۔
بچے دھڑا دھڑا اغوا ہو رہے ہیں۔ لاہور سے اب تک کی رپورٹ کے مطابق چودہ سو کے لگ بھگ بچے جن کی عمریں پانچ سے پندرہ سال کے برابر ہیں اغوا ہو چکے ہیں اور یہ تعداد گزشتہ تین ماہ میں اغوا ہونے کی ہے۔ پشاور سے اغوا ہونے والے بچوں کی تعداد آٹھ سو کے لگ بھگ ہے۔ مانسہرہ سے سات سو کے قریب اغوا ہوئے ہیں۔ فیصل آباد، ملتان، راولپنڈی سے بھی فی شہر ڈیڑھ دو سو بچے اغوا ہوئے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا پاکستان کے خلاف ایک سازش نہیں ہے۔ یقینا ہے۔ کیونکہ اس طرح پاکستان میں ایک افراتفری پیدا ہوتی ہے۔ حکومت پر عوام کا اعتماد اٹھ جاتا ہے (جو کہ اکثریت کو پہلے ہی نہیں ہے)۔ عوام کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے پیچھے کیا ہے؟ عوام میں افراتفری کیوں پھیلائی جارہی ہے اور کون اس کا ذمہ دار ہے؟ عوام کی توجہ کن مسائل سے ہٹائی جارہی ہے؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات بہت سے اذہان میں گونجتے ہیں۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ ملتان کے کسی پیر کالونی سے ایک ہی دن میں تین بچے اغوا ہو چکے ہیں۔ اللہ معافی۔۔
درحقیقت ہم میں وہ حق ہمسائیگی کا جو درد تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ہمسائے میں، محلے میں کیا ہو رہا ہے، کون رہ رہا ہے، کس گھر میں کس قسم کے

حالات ہے کہ اگر ان کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے، تو ان کی جائے، یہ احساسات عنقا ہو چکے ہیں۔ پہلے آپ کے گھر سے دور دسویں گھر میں کون بیمار ہوتا تھا، آپ کو علم ہوتا تھا اور آپ دیگر اہلِ محلّہ کے ساتھ نہ صرف اس کی تیمارداری کرتے تھے، بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کے علاج معالجے میں مدد بھی فراہم کرتے تھے۔ آپ کے محلے میں کوئی نیا گھر آباد ہوتا تھا تو شاید تین چار دن تک ان کو کھانا پکانے کی اجازت ہی نہ ملتی تھی۔ ان چار دنوں میں خواتین آپس میں یوں گل مل جاتی تھیں جیسے ان میں برسوں کی جان پہچان ہو۔ ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت ہو جاتی تھی۔ کتنے مرد ہیں، بچے ہیں؟ کیا کچھ کرتے ہیں کہاں ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ساری معلومات ایک ہمسائے کو ملتے ہی دس گھروں تک پہنچ جاتی تھیں۔ یہ نہیں کہ اس میں کوئی جاسوسی پہلو یا تجسس کی بات تھی۔ بس یہ درحقیقت ایک قسم کی معلومات ہوتی تھیں۔ اور ہر گھر کی اس طرح معلومات دوسروں کے گھروں میں پہنچ جاتی تھیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اس محلے میں جو اجنبی اگر کسی کے گھر میں دروازے کو کھٹکھٹا کر مالک مکان کی اجازت سے اندر جاتا تھا تو سمجھا جاتا تھا کہ ان کے گھر کا ہی کوئی فرد ہے، کوئی رشتہ دار ہے۔ اور اگر کوئی اجنبی محلے میں چلتا نظر آتا تھا جو کسی نے کسی بھی گھر سے نکلتے یا داخل ہوتے نہیں دیکھا ہوتا تھا تو اس کی باقاعدہ تین چار بندے مل کر تفتیش کرتے تھے۔ جب تک مکمل تسلی نہ ہو جاتی تھی تب تک اس کی جان نہیں چھوٹتی تھی۔ آج کل کی صورتحال اس کے بالکل بالعکس

ہے۔ محلے میں ایک چھوڑ، دس بارہ اجنبی آجائیں، کسی کو پرواہ ہی نہیں۔ یہی سوچ کر ہوگا محلے کے کسی گھر کا، ہم نظر پھیر کر چل پڑتے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ بچے اغوا ہونے لگے ہیں۔ چوریاں ڈکیتیاں بڑھ گئی ہیں۔ایک دوسرے سے دوریاں ہو گئی ہیں۔اور یہ دوریاں ہونے کی ایک سب سے بڑی وجہ ہمارا ہمہ وقت وقت کی کمی کا گلہ کرنا ہے۔ اس میں بھی وقت کا کوئی قصورت نہیں ہے۔ ہم خود ہی اپنے مسائل میں اس طرح الجھ گئے ہیں کہ دوسروں کی طرف توجہ دینے کا وقت ہی نہیں مل رہا۔ بلکہ مسائل میں الجھا دیا گیا ہے۔ مہنگائی کا مسلہ، بچوں کی تعلیم کا مسلہ، روزگار کا مسلہ، صحت و صفائی کا مسلہ وغیرہ۔ مسائل ہزاروں، وسائل محدود۔ ایسے میں اگر بندہ دوسروں کی طرف بھی توجہ دے، یا دوسرے لفظوں میں دوسروں کے پھڈے میں بھی ٹانگ اڑائے تو نقصان کس کا۔۔ اپنی ٹانگ کا۔ درحقیقت سب کچھ ممکن ہے، بہت آسانی سے۔ ہم اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو مضبوطی سے اپنی زندگی کا، اپنی روزمرہ کے معاملات کا حصہ بنالیں۔ اگر ہم بیشتر معاملات میں قناعت پسندی و اعتدال پسندی سے کام لیں تو وقت کی بہت بچت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم انفرادیت کو اجتماعیت پر ترجیح دیں۔ انفرادی مطلب ذاتی مفاد کو دوسروں کے مفاد سے ہمیشہ پیچھے رکھیں، سوائے نیکی کے کاموں کے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے گلے محلے گاؤں شہر کے مسائل حل نہ ہوں۔ بات اگر ہے تو صرف اتنی سی کہ ہم اپنے

ارد

گرد کے بدلتے ماحول پر نظر رکھیں۔ کسی اجنبی شخص یا گاڑی کو اپنے علاقے میں دیکھیں تو اس کو نظروں ہی نظروں میں کھانے کا پروگرام بنائیں۔ تب تک اس کی جان نہ چھوڑیں جب تک یا تو وہ شرمندہ ہو کر وہ علاقہ چھوڑے، یا پھر وہ اپنی باقاعدہ جان پہچان کرائے۔ اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

بچوں کا اغوا۔ ایک سازش

پروپیگنڈا کرنے کے لیے افواہ کا ہونا ضروری ہے۔ اور ہر افواہ کے پیچھے کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور موجود ہوتی ہے۔اب جس رفتار سے پاکستان کے مختلف شہروں سے بچے اغوا ہو رہے ہیں اور اغوا ہونے والے عوام کے ہاتھوں گرفتار ہو رہے ہیں اس میں کتنی سچائی ہے، کتنا جھوٹ۔ یہ رب جانتا ہے۔ سوشل میڈیا میں فیس بک ایک ایسا ہتھیار بن چکا ہے کہ دنیاکے ہر علاقے سے اس پر ممبر موجود ہیں۔ اور ہر کوئی کم از کم اپنے علاقے کی خبر رکھتا ہے اور اگر کوئی خبر عوام تک پہچانی ہو تو شیئر بھی کر دیتا ہے۔جب دنیا کی خبریں عوام تک پہنچ سکتی ہیں تو پاکستان کی خبریں پاکستان کے عوام تک کیوں نہیں پہنچ سکتیں۔ اسی چیز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عوام تک یہ خبریں پہلے پہنچنے لگیں کہ پاکستان کے مختلف شہروں سے بچے اغوا ہو رہے ہیں اور بڑی تعداد میں ہو رہے ہیں۔ میڈیا میں یہ خبر نہیں آئی۔ لیکن پاکستان کے ہر اس شخص تک یہ خبر پہنچ گئی جو سوشل میڈیا کا استعمال کرتا ہے۔ ان میں میڈیا کے نمائندے بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ بھی کیا کریں اپنے اپنے چینل کی پالیسی سے مجبور ہیں کہ وہ خبر تو دکھائی جائے گی، جس سے عوام میں سراسیمگی پھیلے اور جو حکومت وقت چاہے۔ لیکن جہاں کتی چوروں سے ملی ہوئی ہو، وہ خبر ہرگز

میڈیا کی زینت نہیں بنی چاہیے۔
پورے ملک میں بچوں کے اغوا کریوں پھیلے ہوئے ہیں جیسے اچانک فصلوں پر ٹڈی دل کا لشکر حملہ کر دیتا ہے۔ اور روزانہ ہی بچے اغوا ہو رہے ہیں جب کہ حکومت کے نمائندے کہتے ہیں کہ کوئی بڑی بات نہیں ۔ بچے تو اغوا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ درست کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ آپ کے بچے نہیں ہیں۔ غریبوں کے ہیں، عوام کے ہیں۔ جنھیں کوئی جانتا نہیں۔ جب دباؤ بہت بڑھ گیا تو پھر ایک بیان آیا ہے کہ کوئی اغوا نہیں ہو رہے بلکہ یہ تو صرف ایک پروپیگنڈہ ہے۔ صرف عوام میں افراتفری پھیلائی جا رہی ہے۔ کیا میڈیا اتنا ہی سویا ہوا ہے۔ کیا عوامی نمائندے (نام کے) بالکل ہی بے خبر ہیں۔ آپ کے اپنے حلقے میں سے اغوا کی وارداتیں ہو رہی ہیں اور آپ کو علم ہی نہیں۔ ہو بھی کیسے؟ آپ اپنے حلقے میں سلیکشن الیکشن جیتنے کے بعد کبھی واپس گئے ہوں تو علم ہو نا۔ ہاں، اگر کبھی بھولے سے اپنے حلقے کے کسی گلی محلّہ میں کوئی احسان کر دیا ہے (جو نہ بھی کرتے تو بھی عوام وہ کام کروا ہی لیتی) ، اس کو کو جتانے کے لیے افتتاح کرنے پہنچ جاتے ہیں۔
کل ایک ویڈیو نظر سے گزری جو کہ کسی محلے کے کسی گلی میں کیمرہ سے لی گئی تھی۔ اس میں تین بچیاں سکول کا یونیفارم پہنے گھر کو آرہی ہیں۔ ان کے پاس

ایک سوزوکی بولان آکر رکتی ہے۔ دو افراد نکلتے ہیں، ایک بچی کو اچانک سے اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیتے ہیں۔ جب تک باقی دو بچیوں کو کچھ سمجھ آتی ہے گاڑی پوری رفتار سے نکل جاتی ہے۔ بچیاں اس گاڑی کے پیچھے بھاگتی ہیں لیکن گاڑی کی رفتار سے کیا مقابلہ۔ بچی اغوا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی ویڈیوز موجود ہوں گی۔ اربابانِ اختیار تک ضرور پہنچی ہوں گی۔ ان کے اسسٹنٹ تک گئی ہوں گی۔ لیکن صاحب کے حکم کے مطابق اس طرح کی فضول اور لغو اور بے بنیاد خبریں ان تک ہر گز نہ پہنچائی جائیں کے مصداق اسسٹنٹ نے اپنی آنکھوں سے آنے والے آنسو اپنے جگر پر ہی گرائے ہوں گے اور کڑوے گھونٹ پیے ہوں گے۔ پیتے رہو بھائی اور کڑتے رہو، جب تک خود تمھارے گھر کے اندر سے اس قسم کی آہ و فغاں کی آوازیں نہ سنائی دیں۔

بچوں کے اغوا کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ میرا تجزیہ ہے کہ اس میں بھی بین الاقوامی مجرم ایجنسیاں شامل ہیں۔ کیونکہ اتنے وسیع پیمانے پر ایک دم سے یہ آفت اس طرح سے نہیں آجاتی۔ کچھ تو ہے کہ جس کی پردہ داری ہے۔ ان ایجنسیوں کا ساتھ دینے والے بہت لوگ ہیں جو وطن کی مٹی کو مٹھی مٹھی کرکے بیچ ڈالتے ہیں۔ جب ان کو ان کا بیان سنایا جائے تو کہتے ہیں کہ پورے سیاق و سباق سے سنیں، جو آپ سمجھے ہیں وہ ہرگز یہ نہیں ہے۔ بچوں کو کن وجوہات کی بنا پر اغوا کیا جا رہا ہے، بہت سی ہو سکتی ہیں۔ عرب ممالک میں بچوں کو غلام بنایا

جاتا ہے۔ چونکہ اپنی قوم کے بچے تو ان کو عزیز ہیں اسلیے دوسرے ممالک سے بچوں کو ان تک پہنچایا جاتا ہے۔ متحدہ عرب امارات میں اونٹ دوڑ میں بچوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اونٹوں پر معصوم بچوں کو باندھ دیا جاتا ہے۔
جب اونٹ دوڑتا ہے تو بچے خوف سے چلاتے ہیں۔ ان کی چیخیں سن کر اونٹ بدک کر اور تیز دوڑتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب دوڑ ختم ہوتی ہے تو اس وقت تک شاید کچھ بچوں کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔ اسکے بعد کچھ ممالک میں بچوں کے اعضا فروخت کیے جاتے ہیں۔ پھر وہی بات کہ اپنی قوم ہر کسی کو عزیز ہے سوائے پاکستان کے صاحبانِ اختیار کے۔ کیونکہ اگر ان کو پاکستان عزیز ہوتا اور پاکستانیت سے پیار ہوتا تو اقوام متحدہ کے اس خط کو دل سے لگا کر رکھتے جو اس نے حکومت کو لکھا کہ پاکستان سے تازہ جسمانی اعضاء کی سمگلنگ بہت زیادہ وہ رہی ہے، اسے کنٹرول کریں۔ تو اس خط پر اس پر اس طرح کا ایکشن لیتے جیسے چھوٹو گینگ کے لیے فوج کو بلا لیا گیا تھا۔
سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ہماری تیز طرار پولیس کو معلوم نہ ہو کہ علاقے کا کونسا مجرم کس قسم کا جرم کرتا ہے اور جرم کرنے کے بعد کہاں جاتا ہے۔ لیکن ان بے چاروں کی بھی مجبوری ہے۔ وہ بھی اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے میں

لگے ہیں۔ اگر مجبوری کا نام شکریہ نہ رکھیں تو پھر ان کی نوکری جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جیسے ہی وہ ایکشن لیتے ہیں، فوراً سے پہلے ان کے دفتر کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے کہ بھائی جی ہاتھ ہولا رکھو اگر جان، گھر اور گھر والے عزیز ہیں۔ اور وہ جان اور جان دار کو عزیز رکھ لیتے ہیں کہ جن کے لیے کماتے ہیں، وہ ہی نہ رہے تو فائدہ۔

اس کے بعد بیگار کیمپ بھی تو چلانے ہیں۔ بڑی بڑی چٹانیں توڑنے کے لیے اگر وہ مشینیں منگوائیں تو خرچہ بہت ہو جاتا ہے اور اس میں بچت نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے بچوں کو اور جوانوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ ان سے بیگار کیمپ میں یہ کام لیا جاتا ہے۔ بعض شہروں میں بڑے بڑے گروہ بنے ہوتے ہیں۔ جن کو بھیک منگوانے کے لیے ہر چار چھ ماہ بعد نئی کھیپ چاہیے ہوتی ہے۔ تو پھر اغوا کار ایکشن میں آ جاتے ہیں اور بچوں کا اغوا شروع ہو جاتا ہے۔ بچوں کو مختلف لحاظ سے معذور کر کے ان سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔ خاص طور پر ان بچوں کو جو تھوڑا ضدی ہوتے ہیں اور ان کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتے ہیں۔ جو بچے بات مان جاتے ہیں ان کو بس بھیک مانگنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔

اسی طرح بچوں اور نوجوانوں کو یعنی پانچ سے پندرہ تا اٹھارہ سال کی عمر کے افراد کو بھی اغوا کیا جاتا ہے۔

ان سب کے پیچھے یا تو مختلف ممالک کے بڑے بڑے مجرم ادارے ہیں اور یا پھر پاک وطن کے غلیظ اور دوغلے لوگ۔ جو عوام کے سامنے صدقات، خیرات اور عطیات اور نیکی کے کاموں کا پرچار کرتے ہیں لیکن کالی رات میں اپنا مکروہ کاروبار چلاتے ہیں۔ کیونکہ کچھ ملکوں میں اغلام بازی کی وبا بھی پھیلی ہوئی ہے۔ قوم حضرت لوط علیہ السلام اسی لیے ہلاک ہوئی تھی۔ اور آج بہت سے ملکوں میں یہ کھیل پھر سے کھیلا جا رہا ہے۔ بلکہ چند ممالک میں تو با قاعدہ سے ہم جنس پرستی کا قانون بن گیا ہے۔ فطری قانون کے خلاف چلنے والے کب تک عیاشی کریں گے۔ جلد ہی ان کو احساس ہو گا کہ بہت برا کر رہے ہیں۔

لیکن شاید تب تک پانی سر سے گزر چکا ہو گا۔ بچوں کو اغوا سے بچانا ہے تو ہمیں حکومت پر یا پولیس پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود احتیاطی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔ بچوں کو کسی بھی حالت میں تنہا نہ چھوڑا جائے۔ کہیں بھی جائیں تو بچے کا ہاتھ خود پکڑیں، نہ کہ بچے کو اپنا ہاتھ پکڑائیں۔ انہیں سکھایا جائے کہ کسی بھی انجان بندے کے اشارے پر اس کے ساتھ جانا ٹھیک نہیں نہ ہی کھانے پینے کی کسی چیز کے لالچ میں ان کے ہاتھ لگنا ہے۔ گھر سے اکیلے بچے کو باہر نہ جانے دیں۔ دکان تک بھیجیں تو دکاندار سے کہا جائے کہ بچے کو آتا جاتا دیکھتا رہے۔ کوئی اجنبی محلے میں نظر آئے تو اس پر نگاہ رکھیں۔شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات۔۔۔

آرمی چیف اور پاک چائنہ اقتصادی راہداری

پاک چین اقتصادی راہداری کے منصوبے پر پوری دنیا نے اپنی نظریں گاڑی ہوئی ہیں۔ خاص طور پر وہ ممالک جن کے مفاد کے تانے بانے جنوبی ایشیا سے ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اتنا مختصر منصوبہ تو ہے نہیں کہ ہفتوں ، مہینوں میں ختم ہو جائے۔ کم از کم اس پر تین چار سال تو صرف ہوں گے۔ یہ منصوبہ اگر مکمل ہو جاتا ہے تو ان شاء اللہ پاکستان کی معاشی لحاظ سے کافی ترقی کر سکتا ہے۔ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ بنا کسی تعطل کے جاری رہے۔ اور اس تسلسل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جو مظبوط ہاتھ اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں وہ ہمیشہ ہی مظبوط ہوں اور ڈٹے رہیں۔ آندھی آئے یا طوفان، سیلاب آئے یا سونامی، اندر باہر کی سازشوں سے اس کو اللہ کے بعد بچانے والی دنیاوی قوتیں متحد ہو کر طاقتور رہیں گی تو یہ منصوبہ بخیر و عافیت سے اختتام کو پہنچے گا۔ اس کی حفاظت کے لیے مظبوطی سے ڈٹے رہنا بھی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ کیونکہ پاکستان کے باطنی وظاہری دشمن اندر باہر سے وار پہ وار کیے جا رہے ہیں۔ کبھی پراکسی جنگ لڑی جارہی ہے اور کبھی سازشوں کا جال بچھایا جا رہا ہے کہ پاکستان کسی بھی لحاظ سے کمزور ہو اور ہوتا چلا جائے۔ لیکن وہ نہیں جانتے یا انجان بن جاتے ہیں کہ اس پاکستان کی حفاظت اب تک اللہ نے کی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی وہی پاک ذات

اس کی حفاظت فرمائے گی۔

اس اقتصادی راہداری نے جاکر سیدھا گوادر کی بندرگاہ سے ملنا ہے اور یہ گوادر بھی ہے جو دشمنوں کی آنکھ میں کھٹک رہا ہے۔ان کے گلے میں کانٹے دار ہڈی کی مانند اٹک گیا ہے۔ ایران کی چاہ بہار کی بندرگاہ پر ان شاء اللہ اس گوادر کی بندرگاہ کے کامیاب افتتاح کے دن سے ہی الو بولنے لگیں گے۔ اسی وجہ سے ایران پریشان ہے اور الوؤں سے کیسے بچا جائے۔ حالانکہ امریکہ کا چمچہ ہونے کی وجہ سے ایران کو پریشانی تو ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ وہ سارے الو خرید لے گا۔ اس کے بعد آتا ہے انڈیا۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے ، معدودے چندکے، اسی دن اڑ گئے تھے جس دن اس گوادر کو بندرگاہ کے طور پر چنا گیا تھا۔ اور جو چند وفادار طوطے چمٹے رہ گئے تھے وہ بھی اقتصادی راہداری اور گوادر کے آپس میں ملاپ کا سنتے ہی اڑن چھو ہو گئے تھے۔ اب دوطرفہ چوگان کھیلنی ہے۔ دشمنوں کے گول سے بھی خود کو بچانا ہے اور وقتی طور پر خالص دفاعی پوزیشن سے ان کو پریشانی میں بھی مبتلا رکھنا ہے کہ وہ نہ کچھ سوچ سکیں نہ کچھ سمجھ سکیں اور پھر صرف توجہ اپنے ملک کی طرف ہی دیں نہ کہ ہمارے پاک وطن کے بارے میں برے خیالات برے ذہن میں لاتے رہیں۔

اب پاک فوج کے کمانڈر جناب جنرل راحیل شرف کے ریٹائرمنٹ کے دن قریب ہیں۔

غالباً نومبر میں انھوں نے چارج چھوڑنا ہے۔ انھوں نے پاک فوج کا معیار بلند کیا۔ عوام میں جو پاک فوج کے خلاف نفرت پھیلی ہوئی تھی ، اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نفرت کو ختم کیا۔ عوام میں یہ شعور پیدا ہوا کہ اللہ کے بعد اگر کوئی پاکستان سے کی حفاظت کر سکتا ہے تو یہ پاک فوج ہی ہے۔ عوام یہ بھی جانتی ہے کہ مشکل گھڑی میں ، مشکل حالات میں اللہ نے اگر پاکستانی قوم کی مدد کے لیے کسی کو بھیجا ہے تو یہ پاک فوج ہی ہے۔ اب اگر جنرل صاحب چلے جاتے ہیں تو کیا معلوم ان کا جانشین کس ذہن کا مالک ہو۔ کس کام کو ترجیح دے اور کس کو ملتوی کر دے یا دوسرے نمبر پر رکھے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ گوادر کی بندرگاہ اور اقتصادی راہداری کے منصوبے کو بخیرو عافیت پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جنرل راحیل شریف کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ ان کو ہر اونچ نیچ کا علم ہے۔ بے شک انکے ماتحت جرنیل بھی جانتے ہیں لیکن دماغی جنگ اگر ایک دماغ باقیوں کی مشاورت سے لڑے اور وہ لڑے جس پر گزر چکی ہو تو وہ زیادہ تجربہ دکھائے گا۔

چین کو بھی پاکستان کے حالات کا علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پاکستان میں بہت سے امریکہ پٹھو بستے ہیں۔ ان کے شدید دباؤ میں آ کر کوئی بھی حکومت کسی بھی وقت اپنا فیصلہ واپس لے سکتی ہے۔ کروڑوں اربوں روپے کا نقصان سہہ لے گی لیکن امریکہ بہادر کو ناراض نہیں کرے گی، جو ہزاروں کلومیٹر دور سے آنکھیں

دکھاتا ہے اور ہم آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں اور پھر ہپ ہپ ہرے کے نعرے لگاتے ہیں کہ سرکار بہادر نے ہم سے ٹیلیفون پر بات کرکے ہمیں عزت بخشی ہے۔ خیر چین کے کہنے پر ہی ایک پورا بریگیڈ تیار کیا گیا جو اس وقت پاک چین سُت سرحد سے لے کر گوادر کے گہرے نیلے پانیوں تک اقتصادی راہداری کی حفاظت کا فریضہ اللہ کے فضل و کرم سے انجام دے رہا ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ نئے کمانڈر کے آنے کے بعد حکومت وقت کے دباؤ میں آکر اس بریگیڈ کے فرائض میں تبدیلی کر دی جائے۔ ظاہر ہے اس تبدیلی کی وجہ سے پاکستان کی ترقی کرتی ہوئی معیشت کا سارا منصوبہ ناکام ہو سکتا ہے جو کہ دشمنانِ پاکستان چاہیے ہی یہی ہیں۔ اس لیے چین نے موجودہ حکومت کو مشورہ دیا (اخباری ذرائع) کہ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ جنرل راحیل شریف کی مدت ملازمت میں توسیع کی جائے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ گذشتہ سال ستمبر میں جو بل قومی اسمبلی میں پیش ہوا تھا جس میں آرمی چیف کے عہدے کی مدت تین سال کی بجائے پانچ سال کرنے کا کہا گیا تھا، وہ بھی چین ہی کے مرہون منت تھا۔

موجودہ حکومت نے اچھے دوست کے بہترین مشورے کو مانتے ہوئے اپنے وزراء اور مشیروں سے مشاورت شروع کر دی۔ بے شک کچھ خلاف بھی ہوں گے لیکن کرنل ٹھاکر صاحب اگر قوم کے جذبات کے قاتل فاروق ستار کو گرفتار کرکے لے جا سکتے ہیں تو کچھ بھی ممکن ہے۔ جنرل صاحب ویسے تو فرما چکے تھے کہ انھوں نے اپنے عہدے کی

مدت توسیع نہیں کروائی، نہ انہیں پسند ہے۔ لیکن جذبۂ الوطنی تو ان کے خاندان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اوپر سے عوام کے دل کی آواز بھی تھی کہ نہ صرف اقتصادی راہداری اور گوادر کی حفاظت کے لیے ان کی موجودگی ضروری ہے بلکہ عوام کو گِدھوں سے، دہشت گردوں سے اور دہشت گردی سے نجات دلانے کے لیے بھی نیشنل ایکشن پلان پر عمل کروانا بھی ضروری ہے۔ اور اس کے لیے بھی جنرل صاحب کی موجودگی ضروری ہے۔ لہٰذا جنرل صاحب کی طرف سے ہلکا سا ہامی بھرنے کا اشارہ ملا۔ اب باوثوق ذرائع کے مطابق جی ایچ کیو میں جنرل راحیل شریف کے عہدے کی مدت ملازمت میں توسیع پر کام شروع ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ ان شاء اللہ وطن عزیز کے لیے بہت بہتر ثابت ہو گا۔ بہت سے گِدھوں سے، آستین کے سانپوں سے ملکِ پاک کو نجات ملے گی۔ یہ تو نہیں کہتا کہ بوٹوں کی چاپ سنائی دے رہی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جنرل صاحب کے اس فیصلے سے ملک کی بہتری کے لیے جاری بہت سے منصوبوں کو استحکام و دوام ملے گا۔ چونکہ ان کا تسلسل برقرار رہے گا۔ موجودہ حکومت ایک اچھا کام ضرور کر رہی ہے کہ خارجہ پالیسی میں آرمڈ فورسز کی مشاورت بھی شامل ہوتی ہے۔ چونکہ وطنِ عزیز کو ہر وقت بیرونی و اندرونی دشمنوں کا سامنا ہے۔ کچھ اپنے زخم دیتے ہیں اور کچھ بھوشن یادیو جیسے دشمن ملک کے جاسوس جو آستین کے سانپ جیسے دوست ملک کی سرحد عبور کرکے ان ہی کے پاسپورٹ پر آتے ہیں۔ ان حرام خوروں سے پیارے پاکستان اور اسکی قوم کو محفوظ رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ پاکستانی

افواج مضبوط ہوں۔ پاکستان کے مستقبل کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ ویسے بھی نون لیگ کی حکومت کے دوران ستمبر، اکتوبر اور نومبر کے مہینے ہمیشہ ہی بہت اہم ثابت ہوئے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

بھائی صاحب نے انتہائی ذہنی دباؤ میں آ کر، میرے منہ میں خاک، پاکستان مردہ باد کے نعرے لگوائے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ وہ پی کر بہک رہے تھے لیکن اس بھائی کی صرف آواز ہی سن کر یہاں کے لوگ بن پیے ہی کیوں بہک رہے تھے۔ کیوں ؟ کیا ان کو ان کے بھائی کی آواز ہپناٹائز کر دیتی ہے؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ شاید یہی بات ان کے آئین بولے تو منشور میں لکھی ہوئی ہو گی۔ جو کہ بقول شخصے عنقریب تبدیل ہونے والا ہے۔ تبدیل ہو یا نہ ہو، ہونا کچھ نہیں۔ کیونکہ بے شک نئی پارٹی بن گئی ہے، لیکن پیر کی پریس کانفرنس یہ کہہ کر منسوخ کر دینا کہ اتھارٹی کا متفقہ فیصلہ ہے یا کمیٹی کی رائے کہ ابھی کوئی پریس کانفرنس نہ کی جائے۔اب یہ اتھارٹی کون ہے، اگر فاروق ستار نئی پارٹی کے صدر ہیں۔ ہونا کیا ہے، الطاف حسین کے چھوڑ کر پارٹی ممبرز نئی پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔ فائدہ؟ اتھارٹی تو الطاف حسین کے پاس ہی رہے گی۔ فاروق ستار کس دھڑلے سے بولے کہ وہ الطاف حسین صاحب سے، اس کے الفاظ سے لاتعلقی کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن کوئی یہ بتائے کہ جب وہ ، میرے منہ میں خاک، پاکستان مردہ باد کے نعرے لگوا رہا تھا تو وہ کیا تھا۔ اور تم لگا رہے تھے تو وہ کیا تھا۔

کھڈے کی مٹی کھڈی میں ہی جاتی ہے۔ بھلے کوئی دوسرا کھڈا ہو۔ اب بھی اسی طرح ہے۔ ایک پارٹی سے نکل کر دوسری نام نہاد پارٹی میں آ گئے۔ پہلے ایک گروپ علیحدہ بنا تھا۔ پاک سرزمین پارٹی۔ کمال صاحب چیئرمین بنے اور اپنی سابقہ پارٹی میں سے بندے اکٹھے کر رہے ہیں۔ پاکستان کے لیے تو کوئی نہیں کر رہا ہے۔ سب اپنے مفاد میں ہیں۔ کیونکہ ان کو علم ہو گیا ہے بلکہ شبہ مل گئی ہے کہ صرف اور صرف الطاف حسین کو نوے فیصد کی توقع کے مطابق سائیڈ لائن کر دیا جائیگا۔ تو ان کے خیال میں اس طرح متحدہ تو نہیں چل سکے گی۔ اس کا علاج یہ کیا گیا کہ پہلے ایک پارٹی بنائی گئی۔ آدھے مسٹنڈے اس پارٹی میں گھس گئے اور آدھے جو صوفی ستار نے بنائی اس میں چلے گئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

پارٹی تو بعد میں بنی، تو اپنے قائد کے بیان کو گول مول کرکے بیان کرتے رہے۔ دوسری نقلی مولانا نقلی ڈاکٹر عامر لیاقت بھی اسی کی بولی بولتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ بات سنبھل نہیں رہی ہے، دال نہیں گل رہی ہے تو پہلے نے پارٹی بدل لی اور خود کی پارٹی بنا لی اور دوسرے نے کہہ دیا کہ کب تک وہ الطاف حسین کا دفاع کرتا رہے گا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اب بھی دفاع کرتا رہے، جب پہلے وطن سے اتنی غداری کر چکے ہو تو مزید سے کیا فرق پڑتا ہے۔

مولانا ڈاکٹر عامر لیاقت نے تو پارٹی سے ہی لاتعلقی کا اعلان کر دیا ہے۔ کہتا ہے کب تک صفائی دے گا۔ مولانا منافق کو کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے پارٹی کی صفائی دیتا تھا، ساتھ میں ایمان بھی صاف کرتا تھا۔ اب صرف ایمان ہی صاف کرے گا۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ ایسا ہو گا۔ کیونکہ پارٹی کا زور ہوتا ہے۔ جب پارٹی ہی ختم ہو جائے، یا پارٹی سے نکل جائے یا نکال دیا جائے تو پھر زور ختم ہو جاتا ہے۔ اسلیے شاید اب میڈیا ہیں بھی اس کی وہ قدر و قیمت نہ رہے گی جس کی وہ تمنا رکھتا تھا۔ کراچی کی لوکل پارٹی سٹریٹ کرائمز کے حوالے سے بہت بدنام تھی اب جو چند بڑے مجرم جیسے عزیر وغیرہ پکڑے گئے ہیں، ہر ایک ایک ہی نام لے رہا ہے کہ الطاف حسین کے کہنے پر یہ کام کرتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ امجد صابری قوال کا قاتل بھی یہی کہہ رہا ہے کہ اس نے لندن سے آنے والے حکم پر عمل کیا تھا۔ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔ پھر سونے پہ سہاگہ، حکومت جانتے بوجھتے کہ میئر کراچی کے نام پر سو قتل کا الزام ہے۔ ثابت ہوئے بھی ہوں گے، لیکن پیسہ اور طاقت دونوں جب بولتے ہیں تو خوب بولتے ہیں۔ اور ساتھ میں مفاد بھی۔ تو کچھ ایسا ہی ہے۔

اب میئر صاحب کے بقول وہ جیل کے اندر سے کراچی کا انتظام چلائیں گے۔ کیا پاکستان میں واقعی کوئی قانون نہیں ہے۔ ایسے شخص کو تو الیکشن کمیشن والوں کو چاہیے تھا کہ پہلی گیند پر ہی آؤٹ کر دیتے۔ یہ بھی ظلم ہے پاکستان کے

عوام کے ساتھ۔ اوپر سے اس کو میئر منتخب کر دیا گیا ہے۔ اب اس نے ہر تھانے سے اپنی فائلیں غائب کرا دینی ہیں۔ پھر کہاں کے مقدمے اور کہاں کی سزا۔ سب ایک تھیلی کی چٹے بٹے ہیں۔ وہ نعرے کہ اس کو گلیوں میں گھسیٹیں گے۔ اس کو پھانسی پر لٹکائیں گے۔ اس کا کڑا احتساب کرکے اس کو قرار واقعی سزا دیں گے۔ کہاں گئے یہ کھوکھلے نعرے۔ بس نعروں پر ہی پاکستان کی سیاست چل رہی ہے۔ اور اس وطن کی سادہ قوم ان نعروں کے پیچھے پاگل ہوئی پھرتی ہے۔

ایک طرف دھرنا خان ۱۴ اگست کے دن بھی سیاہ پٹیاں باندھے پھرتا ہے، نہ کوئی یومِ آزادی کی تقریب منعقد کرواتا ہے اور نہ ہی پاکستان کی ترقی و ترویج کی بات کرتا ہے۔ جو بات بھی کرتا ہے اس سے یوٹرن لے کر بات بدل لیتا ہے۔ کہتا تھا کہ موٹر وے سے قومیں ترقی نہیں کرتیں (میں بھی حق میں نہیں ہوں لیکن یہ الگ بات ہے) اور اب سوات کہتا ہے کہ یہ موٹر وے جو کے پی کے مختلف شہروں کو آپس میں ملائے گی، سوات کی اور ان شہروں کی تقدیر بدل دے گی۔ کیا صرف شہروں کو آپس میں ملانے سے ان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ نہ ان کو کوئی صاف پانی کی، نہ صحت و صفائی کی سہولت ۔نہ ہسپتالوں میں ڈاکٹر موجود، نہ دوائی کی سہولت۔ تو کیا سڑکوں سے تقدیر بدلتی ہے؟ ہاں بدلتی ہے لیکن ان کی جو سڑکیں تعمیر کرنے میں حصہ ڈالتے ہیں۔

خیر بات کہاں کی کہاں سے نکل گئی۔ بات ہو رہی تھی پارٹی بدلنے کی، نئی پارٹی بنانے کی۔ تو اب جو بھی متحدہ پاکستان پارٹی میں شامل ہوگا، وہ یقینا الطاف حسین سے ہی بظاہر ٹوٹ کر آئے گا۔ لیکن مجھے صد فیصد یقین ہے کہ ہوگا کچھ بھی نہیں۔ بس سانپ نے کینچلی ہی بدلی ہے باقی ہے تو سانپ ہی۔ کیا سانپ کو مارنا قانون کے خلاف ہے؟ وہ بھی وہ سانپ جو سر سے دُم تک زہریلا ہے۔ اتنا زہریلا کہ صرف پھونک بھی مارتا ہے تو جہاں تک اسکی ہوا جاتی ہے، ہر چیز جل جاتی ہے۔ میڈیا بھرا پڑا ہے، اخبارات بھرے پڑے ہیں۔ اور کیا ثبوت چاہییں ان سانپوں کے ہوا سے اور کاٹنے کی وجہ سے پاکستان کو نقصان کے۔ کیا اب بھی کوئی ایکشن نہیں لیا جائے گا۔ آئین پاکستان کے تحت ایک فرد کو تقریر کی تو آزادی ہے۔ لیکن اس بات کی آزادی ہر گز نہیں کہ وہ اسلام اور پاکستان کے خلاف جو چاہے بکواس کرتا رہے۔

آئین کے آرٹیکل ۱۹ کے مطابق: "اسلام کی عظمت یا پاکستان یا اس کے کسی حصہ کی سالمیت، سلامتی یا دفاع، غیر ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات، امن عامہ، تہذیب یا اخلاق کے مفاد کے پیش نظر یا توہین عدالت، کسی جرم (کے ارتکاب) یا اس کی ترغیب سے متعلق قانون کے ذریعے عائد کردہ مناسب پابندیوں کے تابع ہر شہری کو تقریر اور اور اظہار خیال کی آزادی کا حق ہوگا، اور پریس کی آزادی ہوگی۔" متحدہ نے ایک بار نہیں، کئی بار آئین کی خلاف ورزی کی ہے۔ تو کیا

اس کیلئے صرف اتنی ہی سزا ہے کہ اس کے دفاتر گرا دیے جائیں۔ وہ شخص لندن سے اٹھ کر امریکہ جاتا ہے اور وہاں للکار کر پاکستان کے مخالف ممالک کو مخاطب کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ پاکستان بنانے کی غلطی ہو گئی، آ ئو اس کو درست کرو۔

اسرائیل سے ، امریکہ سے ، بھارت، ایران سے مدد مانگتا ہے۔ لعنت نہیں ہونی چاہیے ایسے شخص پر۔ اوپر سے کمال یہ کہ لندن کہتا ہے کہ ہم اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے سکتے۔ کیوں لیں۔ اس نے پاکستان کے خلاف بات کی ہے، لندن یا انگلینڈ کے خلاف نہیں۔ خدارا، ہمیں اس لعنت سے اور اس طرح کی دیگر لعنت سے نجات دلائیں ۔ حکومت وقت سے ہاتھ باندھ کر یعنی دست بستہ گزارش ہے کہ ان سانپوں کو دودھ پلانے کی بجائے ان کے پھن کاٹے جائیں تاکہ اسلام کے خلاف اور پیارے وطن کے خلاف پھر کوئی بھی اپنی ناپاک زبان سے بکواس نہ کر سکے۔۔۔۔

نفاذ اردو بحثیت قومی زبان

گذشتہ سال ۸ ستمبر ۲۰۱۵ کو سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا تھا کہ اردو زبان کو بحثیت قومی زبان کے پاکستان میں تین ماہ کے اندر اندر نافذ کیا جائے۔ یہ فیصلہ بھی دیا گیا تھا کہ اسکے نفاذ کے ساتھ ہی سب دفاتر میں اور کسی بھی ادارے میں سب خط وکتابت اردو زبان میں ہو گی۔یقینا تعلیمی نظام بھی خود کار طریقے سے اردو میں ہو جاتا۔ عوام الناس کو بھی فائدہ ہوتا اور خواص کو بھی۔ ان خواص کو جو ڈگری تو ڈگری ہوتی ہے اصلی ہو یا جعلی کے مصداق کسی بھی عوامی عہدے پر عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر جاتے ہیں۔ انگریزی بولنا نہیں آتی، لیکن ٹائی کوٹ پینٹ پہن کر منہ ٹیڑھا کرکے بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا پھر ہمارے میڈیا میں فلمی اور ڈرامہ اداکاروں و اداکاراؤں کو فائدہ ہو گا۔ یا پھر کرکٹرز کو کہ بے چاروں سے سوال کچھ ہوتا ہے اور جواب کچھ اور۔ لیکن کیا کیا جائے، ہمارے دفاتر میں بیٹھے ان افراد کا جو گریڈ ۱۸ یا اس سے اوپر کی حیثیت میں براجمان ہیں۔ کہ وہ اردو کو لاگو نہیں ہونے دیتے کیونکہ پھر وہ جو کچھ لکھیں گے ، ایک پانچویں پاس چپڑاسی بھی پڑھ لیا کرے گا۔ وہ کسی عام بندے کو اردو میں خط لکھیں گے تو جو گول مول الفاظ انگلش میں استعمال کرتے تھے، وہ نہیں ہو سکیں گے۔ واضح الفاظ کی وجہ سے عوام الناس کو بھی علم ہو گا کہ ان کے ساتھ کیا

کیا کھیل کھیلے جا رہے تھے۔

اب ایک سال بیت گیا۔ حکومت کے نمائندوں نے ایک سال تک تو اس کو لٹکا لیا۔ اگرچہ اردو زبان کا نفاذ ۱۴۔ اگست ۱۹۸۸ کو ہو جانا چاہیے تھا، لیکن پہلے جنرل ضیاء صاحب کو اسلام کے نفاذ سے ہی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ پھر جونیجو حکومت ۱۹۸۵ میں آئی تو اس کو جنرل صاحب سے محاذ آرائی سے فراغت نہیں تھی۔ جونیجو صاحب کہتے تھے کہ بحثیت آرمی چیف وہ انہیں سلیوٹ کریں۔ وہ کہتے تھے کہ بحثیت صدر پاکستان وہ اس قانون سے ماورا ہیں۔اسی بحث و مباحثے میں اور گفت و شنید میں سن ۸۸ میں جونیجو حکومت برطرف کر دی گئی۔ اردو کا نفاذ نہ ہو سکا۔ ۱۴۔ اگست کو اردو نافذ کرنے کی آخری تاریخ تھی، لیکن جب اردو نافذ نہ ہوئی تو اس کا انتقام سخت نکلا۔ ۱۷۔ اگست ۱۹۸۸ کو جہاز کریش ہو گیا۔ اردو کیسے نافذ ہوتی۔ پھر تو جمہوریت کا دور ہی چل پڑا۔ لنگڑی لولی جمہوریت کبھی میں ، کبھی تو کی باری باری میں کرسی لیتے رہے۔یہ باری باری کی گولہ باری بھی انگلش میں ہی ہوتی رہی۔

خیر ایک سال بیت گیا لیکن اردو کا نفاذ نہ ہو سکا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جونہی عدلیہ نے اردو کے نفاذ کا فیصلہ دیا، حکومت نے ایک عدد حکم نامہ جاری کیا کہ تین ماہ کے اندر اندر ہر ادارہ اپنے سب قاعدے ، ضوابط اور قوانین

اردو میں ترجمہ کر دیں۔ اگر کسی ادارے کی انٹرنیٹ ویب سائیٹ ہے تو اس کو بھی اردو میں ترجمہ کر دیں۔ بے شک انگریزی ساتھ ہو کہ بیرونی ممالک سے بھی لوگ ویب سائیٹ تک رسائی حاصل کرتے ہیں تو ان کو بھی آسانی ہو۔ وہ تین ماہ تو اداروں نے کام کیا۔ کم از کم اسلام آباد کے زیادہ تر اداروں نے اپنے اپنے قواعد و ضوابط اردو میں ترجمہ کر دیے۔ کسی حد تک ویب سائٹس کو بھی اردو میں کر دیا گیا۔ لیکن ہوا کیا۔ تین ماہ بعد نہ تو حکومت نے مڑ کر خبر لی، نہ ہی کسی اور کو یہ خیال آیا کہ پوچھا جائے ہوا کیا ہے؟ پاکستان تحریک نفاذ اردو نے اس ایک سال میں کئی بار حکومت کو باور کرایا کہ اگر عدالت عظمیٰ کا حکم نہ مانا گیا تو کہیں توہین عدالت کے زمرے میں نہ آ جائے۔ لیکن جس کے کان پر جوں تک نہ رینگے اسے ان باتوں سے کیا سروکار۔

اردو کا نفاذ کوئی مشکل نہیں ہے۔ بس ایک حکم کی بات ہے۔ وزیر اعظم کے دفتر سے ایک حکم نکلنا ہے کہ پاکستان میں اردو کا نفاذ ہو گیا ہے۔ آج سے ساری دفتری کارروائی اردو میں کی جائے گی۔ کوئی کیفیت لکھی جائے گی یا کوئی مراسلت، سب کچھ اردو میں ہو گا۔ بے شک وہ ادارے جو بیرونی ممالک کے ساتھ خط و کتابت کرتے ہیں، ان کے ساتھ انگریزی میں مراسلت جاری رکھیں۔ لیکن اندرونِ دفتر اور اندرونِ ملک ساری مراسلت و کیفیت نویسی اردو میں ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا؟ چند دن، چند ہفتے پریشانی کے ہوں گے۔ تکلیف کے ہوں

گے۔ لیکن خود بخود زبان اور ہاتھ دفتری اردو میں سیدھے ہو جائیں گے۔ حالانکہ لکھی بھی وہی اردو جاتی ہے جو عام بول چال میں مروج ہے۔ فرق ہے تو صرف ان اصطلاحات کا جو دفتری ماحول کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لیکن اس کا بھی نہایت عمدہ حل موجود ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نامی ادارے نے برسوں پہلے انگریزی سے اردو کی ایک لغت اس انداز میں تیار کی تھی کہ جس میں دفتری زبان سے متعلق تقریباً ہر ہر لفظ موجود ہے۔ وہ لغت ۳، ۴ کی تعداد میں ہر آفس میں پہنچا دی جائیں اور اس سے مدد لی جائے۔ چند دنوں میں ہر فرد کافی حد تک ماہر ہو جائے گا۔ وہ افسران جو کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں انہیں صرف پانچ دن کی اردو ان پیج میں تربیت دی جائے تو پانچ دن بعد نہ صرف وہ اردو میں کمپیوٹر پر روانی سے لکھ سکیں گے بلکہ دفتری اردو میں بھی رواں ہوں گے۔

لیکن عوام کو آسانی کیوں مہیا کی جائے؟ انہیں کیوں بتایا جائے کہ ان کے مسئلے کا حل یہ ہے۔ انہیں آسان زبان میں کیوں بتایا جائے کہ وہ اپنے مسئلے کے حل کے لیے کیا راستے اختیار کریں۔ جب تک انہیں دفتر کے چکر پر چکر نہ لگوائے جائیں، دفتر والوں کو آرام نہیں آتا۔ اس کی نسبت اگر اردو میں ان کو ایک ہی خط لکھ دیا جائے اور ان کو بتا دیا جائے کہ یہ مسئلہ آپ کے مسئلے میں پیش آ رہا ہے، تو مکتوب الیہ آسانی سے سمجھ جائے گا اور اس کے بعد جو بھی راہ اختیار کرے گا وہ بہت سوچ سمجھ کر چنے گا۔ چین کی قوم کی ترقی کی ایک

بنیادی وجہ ان کی اپنی قومی زبان کو ترجیح دینا ہے۔ باہر سے کوئی بھی لکھی ہوئی تحریر آتی ہے تو چین نے باقاعدہ ایک ادارہ بنایا ہوا ہے جو اس کو چینی زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔ پھر اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے عوام کو فائدہ نہیں دے سکتے۔

اردو کے نفاذ کے دشمن کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت میں فرق پڑ جائے گا۔ ہم زمانے سے بہت پیچھے چلے جائیں گے۔ ہر گز نہیں۔ میں تو یہ کہوں گا ہم پہلے سے بہت آگے اور بہت تیزی سے ان شاء اللہ ترقی کے مدارج طے کریں گے۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں کوئی بھی تحقیق ہوتی ہے۔ اگر وہ پاکستان تک آجاتی ہے تو چین کی طرح کا کوئی ادارہ بنایا جائے، جو اس کو اردو میں ترجمہ کرے، اصطلاحات کو اردو کے سانچے میں ڈھالے۔ جب وہ چیزیں اردو میں طلباء کے سامنے آئیں گی تو کوئی وجہ نہیں کہ جہاں انگریزی کی وجہ سے ایک طالب علم کو رٹہ لگانا پڑتا ہے، اردو کی وجہ سے وہ اس کو دو تین دفعہ پڑھ کر ہی یاد کر لے گا۔ ان کے امتحانات آسان ہو جائیں گے۔ مقابلے کے امتحانات کو آپ اردو میں کریں اور پھر دیکھیں اردو کا کرشمہ۔ اللہ کے فضل و کرم سے اس طرح کے ذہین افراد سامنے آئیں گے کہ پاکستان کو ترقی کے ہر میدان میں آسمان کی بلندیوں تک پہنچا کر دم لیں گے۔ پاکستان میں بہترین ذہن کے افراد موجود ہیں۔ کم پڑھے لکھے ہیں۔ اکثریت انگریزی کی وجہ سے پیچھے ہے۔ اگر اردو میں وہ پڑھ

لکھتے۔ انگریزی کو صرف ایک اختیاری مضمون کے طور پر رکھیں یا بے شک لازمی قرار دے دیں کہ انگریزی سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ تو وہ لوگ یوں اپنی ذہانت کا مظاہر کریں کہ دنیا انگشتِ بدنداں رہ جائے۔

یہ عرضی ہے حکومت وقت سے، اربابانِ اختیار سے کہ قوم کی تقدیر سے نہ کھیلیں۔ انہیں اپنی تقدیر خود بنانے دیں۔ اگر پاکستان کو واقعی میں دنیا میں مثبت کاموں میں اول پوزیشن حاصل کرنی ہے تو اردو کو رائج کریں۔ بے شک اور بھی بہت سے کام ہیں جن کی وجہ سے پاکستان ترقی کر سکتا ہے لیکن اگر یہ سارے کام کسی اور زبان کی بجائے اردو میں انجام دیے جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟

****

پھر کشمیر سلگ رہا ہے۔۔۔

عالمی ادارے کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق زید رعد الحسین صاحب کشمیر میں ہونے والے مظالم پر مذمت کا اظہار کیا ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ ان کا یہ اظہارِ مذمت شاید کشمیر کے کسی زخم پر مرہم کا کام کر جائے۔ کیا زید صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی زبان کا گھاؤ ہے جو کسی طفل تسلی سے بھر جاتا ہے۔ کسی چھری چاقو کا لگا زخم ہے جو پائیوڈین لگانے سے لہو رک جاتا ہے۔افسوس ہے اس بات پر کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کشمیر میں صرف ظلم ہی نہیں ہو رہا بلکہ نسلوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔ ان کی آزادی سلب کی ہوئی ہے۔ دنیا کا سب سے ظالم اور مکروہ ترین ملک بھارت جو ایک طرف تو امن اور شانتی کی صدا دیتا ہے تو دوسری طرف ظلم و بربریت کی وہ داستانیں رقم کر رہا ہے کہ چنگیز، ہلاکو یا ہٹلر اس کے آگے پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ جناب زید صاحب اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر ہیں۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی صرف مذمت کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ کیا ان کی نظر سے وہ قراردادیں نہیں گزری ہوں گی جو اقوام متحدہ میں خود اسی غاصب ملک نے پیش کی تھیں، جب پاکستان نے ۱۹۴۸ میں اس کی دُم پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ وہ قراردادیں جن میں صریحاً ذکر ہے کہ کشمیر کا مسلہ استصوابِ رائے سے حل کیا جائے گا۔ آج ستر سال ہونے کو آئے ہیں لیکن صرف مذمت ہی ہو رہی ہے اور اسی کو کافی سمجھا جا

رہا ہے۔

ظلم کی انتہا دیکھیں کہ گذشتہ ستر دنوں سے کشمیر میں کرفیو نافذ ہے۔ کشمیری بھائی نہ گھروں سے باہر نکل سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابھی گزری عیدالاضحیٰ کے موقع پر بھی کشمیری عوام اپنے گھروں میں ہی محصور رہے۔ جمعۃ المبارک کا دن گزرا لیکن وہ نہ تو جامع مسجد سری نگر اور دیگر مساجد میں بھی نماز جمعہ ادا نہ کر سکے۔ اسرائیل بھی بہت ظلم کرتا ہے فلسطین میں، لیکن اتنا اب تک نہیں سنا گیا کہ اس امریکہ کے لے پالک نے بھی فلسطینی عوام کو اس حد تک اتنے دنوں سے روکے رکھا ہو کہ وہ اپنے روز مرہ کے کام بھی انجام نہ دے سکیں۔ لیکن یہاں کوٹلہ چانکیہ کے لومڑی کی طرح مکار چیلوں نے کشمیری بھائیوں کا جینا دو بھر کر رکھا ہے۔ لیکن سلام ہے ان ماؤں کو جنھوں نے ان مجاہدوں کو پیدا کیا۔ یہ مجاہدین پھر بھی اپنے حق کے لیے، آزادی کے حق کے لیے کرفیو کی اور پابندیوں کی پرواہ کیے بغیر دنیا کو دکھانے کے لیے احتجاجی جلسے کرنے نکل آتے ہیں۔ پوری دنیا میں آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کی جاتی ہے۔ بھارت کی اپنی مثال سامنے ہے۔ دس سے زیادہ تحریکیں چل رہی ہیں جن میں سب سے زیادہ طاقتور خالصہ تحریک ہے۔ ان سب تحریکوں میں مسلح جدوجہد کا تناسب ساٹھ فیصد سے زیادہ ہے۔ لیکن ہمارے کشمیری بھائی درحقیقت پوری دنیا میں امن سے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے

ہیں۔ پاکستان ان کی اخلاقی اور سفارتی مدد کرتا ہے۔ جو کہ اسکا حق ہے، فرض ہے۔ کیونکہ پاکستان کی آزادی کے دن سے ''کشمیر بنے کا پاکستان'' کا نعرہ گونج رہا ہے۔اور ان شاء اللہ، یہ نعرہ سچ ہو کر رہے گا۔

کل جماعتی حریت کانفرنس کے چیئرمین جناب سید علی گیلانی، جناب میر واعظ عمر فاروق، جناب یاسین ملک صاحب نے اس تحریک آزادی کو اپنے خون سے ، اپنے جوش سے پورے جوبن پر اٹھا رکھا ہے۔ سید علی گیلانی صاحب اگرچہ بزرگ ہیں لیکن ان کا جذبہ اسی طرح جوان ہے بلکہ آتش جوان ہے جس طرح کسی بھی بیس پچیس سال کے جوان کا خون جوش مارتا ہے۔انھوں نے کئی عشروں سے تحریک کو اپنے خون سے سینچا ہے۔انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلی ہیں لیکن ان کی زبان سے سوائے کشمیر کی آزدی کی مانگ کے اور کوئی لفظ نہیں نکلا۔۱۹۸۸ میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس وقت سے مسلح جدو جہد کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا لیکن اگر صرف مسلح جدو جہد ہی ہو تو کامیابی ناممکن ہوتی ہے۔ کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے سیاسی جد و جہد بہت ضروری ہے۔ اور اس کو سفارتی ، اخلاقی مدد کی از حد ضرورت ہے۔ دنیا کے وہ تمام ممالک جو انسانی آزادی پر یقین رکھتے ہیں جن میں امریکہ ، برطانیہ، بھارت، فرانس، جرمنی، روس اور چند دیگر ممالک ہرگز شامل نہیں ہیں ، ان کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ کشمیر کی جدو جہد کو ہر مرحلے پر ، ہر پلیٹ فارم پر سراہیں اور اس کا

ساتھ دیں۔ اس کی آزادی کے لیے قرارداد پیش کریں۔ اس کے حق میں ووٹ دیں۔
گزشتہ ماہ جب انڈیا کا وزیر خارجہ یہاں سارک کانفرنس میں شرکت کرنے آیا تھا تو اپنی تقریر میں بزعم خویش کشمیر کی جد و جہد کو دہشت گردی کا نام دے گیا۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ دہشت گردی کون کر رہا ہے؟ کیا وہ بچہ جس نے ایک بند دکان کے سامنے کھڑے تین فوجیوں پر غلیل تانی تھی، یا وہ بھارتی فوجی کتے جو ایک فرد کو گھر سے نکالنے کے لیے سینکڑوں کی تعداد میں اس گھر میں گھس جاتے ہیں۔ چادر اور چار دیوارے کا خیال نہیں رکھتے۔ سیاسی جدو جہد کو دہشت گردی کا نام دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کیا بھارت یہ بھول گیا ہے کہ اس کے اپنے ملک میں بھی دس سے زیادہ آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ کیا وہ بھی دہشت گرد ہیں؟ کیا ان کا حق نہیں کہ وہ بھی اپنی آزادی کے لیے آواز اٹھا سکیں۔ لیکن بھارت کا تو ایک ہی سبق ہے، کوٹلہ چانکیہ کا آئین اور اس پر عمل۔ نہ جیو، اور نہ جینے دو۔
آزادی کی آواز کو دبایا نہیں جاسکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے ایک شخص کو کوڑے مارے تھے، شاید اس زعم میں کہ اس کے والد گورنر ہیں، کوئی اس کو کچھ نہیں کہے گا۔ تو اس وقت حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے فرمایا تھا کہ اے

عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، جب کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا۔ آزادی کی آواز جب اٹھتی ہے تو پھر اس کو دبانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ فطرت کی آواز ہوتی ہے۔ فطرت جب اپنے پورے جوبن پر ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت فطرت کو اپنے قابو میں نہیں کر سکتی۔ کیونکہ فطرت اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ اور اللہ کی پیدا کردہ ایک ایسی چیز جو آزادی جیسی نعمت ہے، کو دبانا، کسی کو اس کا فائدہ نہ اٹھانے دینا انصاف سے بالاتر ہے۔ لیکن بقول ساحر لدھیانوی:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا۔
خاکِ صحرا پہ جمے یا کفِ قاتل پہ جمے
فرقِ انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغِ بیداد پہ یا لاشہء بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا۔

کب تک بھارت خود ہی اپنی قراردادوں سے چھپتا پھرے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ کشمیر کو اس کی آزادی دے دی جائے۔ استصواب رائے کا حق اس کو دیا جائے۔ پوری دنیا کو چاہیے کہ اگر وہ آزادی سے پیار کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں امن رہے، سلامتی رہے تو وہ کشمیر کی سیاسی جدوجہد کو جانیں، اس کو

مانیں اور اس کو دنیا کے ہر پلیٹ فارم پر چاہے وہ اقوامِ متحدہ ہو یا اسلامی ممالک کی تنظیم یا کوئی بھی پلیٹ فارم ہو، پیش کریں۔ اس کے حق میں آواز اٹھائیں۔ کشمیر کی جدو جہد ہر گز دہشتگردی نہیں ہے۔ ہاں جو چار پانچ لاکھ کشمیریوں کو دبانے کے لیے دس لاکھ فوجی وہاں کتوں کی طرح گلی محلوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے بھونکتے رہتے ہیں اور کاٹتے رہتے ہیں ان سے بڑا دہشتگرد شاید پوری دنیا میں کوئی نہیں۔ اور ان کو کنٹرول کرنے والا بھارت ان کا مائی باپ ہے۔ اور ان کی پشت پناہی کرنے والے امریکہ، برطانیہ جیسے ممالک کشمیر اور دوسرے خطوں میں عوامی آزادی کو دبانے کی سازشیوں کے سرغنہ ہیں۔ لیکن یاد رکھوا ے دنیا والو۔ تم منصف تو بنتے ہو، لیکن صرف اس معاملے کے جہاں تمھارا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ اور جہاں مفاد نہیں ہوتا وہاں کہہ دیتے ہو کہ ان کا اندرونی معاملہ ہے۔ ہر گز نہیں۔ آزادی کسی کا اندرونی معاملہ نہیں ہوتا۔ اگر مشرقی تیمور میں مسلمانوں نے جدو جہد کی ہوتی عیسائی نہ ہوتے، تو آج وہ بھی کشمیر کی طرح سلگ رہا ہوتا۔ کشمیر میں تو چنار جل رہے ہیں، لیکن دنیا والو، تمھارے دل جلیں گے، جب تمھارے ملک میں آزادی کی جدو جہد شروع ہو گی۔ ان شاء اللہ۔

بھارت کو عزت راس نہیں

اڑی سیکٹر میں اپنے ۱۷ فوجی جہنم واصل اور ۲۰ سے زیادہ زخمی کرواکر بھی چین نہیں آرہا۔ کیسے آئے، یہ تو بہانے تھے۔ ایک تواقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شرکت نہ کرنے کا دوسرا پاکستان کو آنکھیں دکھانے کا۔ بتایا جاتا ہے کہ اڑی سیکٹر جس جگہ پر ہے اس کے ارد گرد اتنی سخت سیکورٹی ہے کہ وہاں محاورتا نہیں حقیقتاً پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اس کے ارد گرد لیزر ٹیکنالوجی مدد سے ایک دائرہ بنایا ہوا ہے۔ جس کا تعلق الارم سسٹم سے ہے۔ گویا جو بھی اس دائرے کے اندر آئے گا، نہ نظر آنے والی شعاعوں سے ٹکرائے گا اور خفیہ الارم بج اٹھیں گے۔ اب اتنے بڑے فوجی سیکٹر میں گھوڑے گدھے بیچ کر تو کوئی نہیں سوتا کہ کسی کو علم بھی ہو اور ایک دو نہیں اکٹھے چار افراد اندر داخل ہوں اور آرام سے سترہ افراد کو داروغۂ جہنم کا راستہ دکھادیں، بیس سے زیادہ افراد کو زخمی کردیں اور کسی کو علم نہ ہو۔ مزید یہ کہ اس سے پہلے باہر کی طرف اے کلاس خاردار تاریں لگائی گئی ہیں اور اتنی گھنی ہیں کہ آسانی سے پانچ دس منٹ میں ان کو نہیں کاٹا جاسکتا ہے۔ اور ظاہر ہے جب اس طرح کی تاریں لگائی جاتی ہیں تو ان میں کرنٹ بھی چھوڑا جاتا ہے۔ ان میں بھی باقاعدہ الارم سسٹم لگا ہوتا ہے۔ جو اس سے ٹکرائے گا، یا کاٹنے کی کوشش کرے گا کہیں نہ کہیں تو الارم بجے گا۔ لیکن

یہ سمجھ نہیں آئی کہ نہ تو لیزر ٹیکنالوجی سے الارم بجا، نہ ہی خاردار تاروں کی وجہ سے کوئی الارم بجا۔ اچنبھے کی بات ہے۔

مودی صاحب کا موڈ ہوا خراب، تو انھوں نے کچھ نیا کرنے کا سوچا۔ لیکن کوٹلہ چانکیہ کے چیلے کب نیا کر پاتے ہیں۔ وہی اپنے بندے تیار کروائے، انہیں یہ سبق سکھایا کہ بس تھوڑا سا ہلہ گلہ کرنا ہے اور وہاں سے بھاگ آنا ہے۔ اب وہ کب جانتے تھے کہ ان چیلوں کے ہاتھوں میں کھیل کر زندگی کی بازی ہی ہار جانی ہے۔ یہ تو کنفرم ہے کہ وہ مرنے والے چار افراد مسلمان تھے۔ کیونکہ ہندوؤں کو کبھی اس طرح کے معاملات میں آگے نہیں لایا جاتا۔ بلکہ کشمیر میں جو ایک دو نام نہاد آزادی کی تنظیمیں بنی ہوئی ہیں انہی کو آگے لایا جاتا ہے۔ یہ وہی تنظیمیں ہیں جن کی وجہ سے اکثر مجاہدین کی مخبری ہو جاتی ہے اور وہ اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں۔ تو ہندوستان کے ہندوؤں کا منصوبہ ہمیشہ ہی ایک جیسا ہوتا ہے۔ جیسے پارلیمنٹ ہاؤس پر حملے کے وقت ہوا تھا۔ جب ہندوستان والوں نے ان کی حملہ کرتی تصویریں امریکہ کے ساتھ شیئر کی تھیں تو ان کے ساتھ ایک بندہ پہچانا گیا تھا جو کہ ان کی بدنام زمانہ ایجنسی را کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا۔ جو مسلمانوں کے بھیس میں مسلمانوں کو منصوبہ سکھا رہا تھا کہ پارلیمنٹ ہاؤس پر حملہ کرنے سے کشمیر کی آزادی کی جنگ میں اور تیزی آئے گی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب حملہ آور مارے گئے تھے تو اس وقت اس ڈی ڈی کی

لاش کیوں موجود نہیں تھی؟ اب بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔ ابھی تک کسی بھی مقام پر ان چار مرنے والے افراد کی لاشوں کو ظاہر نہیں کیا گیا (اگر کیا گیا ہے تو معذرت کہ ابھی مجھ تک معلومات نہیں پہنچیں)۔ آخر کیا وجہ ہے؟ نہ ان کے بارے میں کوئی تفصیل بتائی جا رہی ہے نہ ہی ان کی تصاویر شیئر کی جا رہی ہیں۔ لیکن وہی ڈھاک کے تین پات کی طرح وہی ازل کا راگ الاپا جا رہا ہے کہ حملہ آور پاکستان سے آئے تھے۔ ان کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح یہ اعلان حملہ ہونے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر ان کے میڈیا پر شروع ہو گیا تھا۔

مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ ہم کمزوری کیوں دکھاتے ہیں؟ مسلمان قوم کو اللہ پاک نے ہر دم تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔ اپنے گھوڑے اور تلواریں ہر دم تازہ دم اور تیار۔ کہ اعلان ہوا نہیں اور تلواریں میان سے باہر آئیں نہیں۔ لیکن ہم ان کے الزامات کو خاموشی سے سن رہے ہوتے ہیں۔ کوئی جواب نہیں دیتے۔ اور اگر جواب دیتے بھی ہیں تو گھنٹوں گزرنے کے بعد۔ جس طرح ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا، لیکن الزامات کے تیروں کی برسات ایک دم سے کر دیتے ہیں اسی طرح ہمارا میڈیا بھی اگر چاہے تو بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اسی وقت میں اہم پروگرام شروع کر کے ان کے الزامات کو دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوا میں اڑا سکتا ہے۔ آخر کیوں؟ ہم کیوں خاموش رہتے ہیں؟ شاید اس لیے کہ ہمارا

الیکٹرانک میڈیا بکا ہوا ہے۔ یا پھر اس کے مالکان بکے ہوئے ہیں؟ کچھ تو ہے، دال میں کچھ ہی کالا نہیں بلکہ ساری دال ہی کالی ہے۔ افسوس صد افسوس، اللہ پاک سے ڈرنے کی بجائے امریکہ اور اس کے پٹھوؤں سے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ ان کی اوپر کی آمدنی نہ بند کر دیں۔

اب ہمارے پرائم منسٹر صاحب امریکہ گئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا ۔ یہاں سے تہیا کرکے گئے تھے کہ انڈیا کو منہ توڑ جواب دیں گے۔ پوری دنیا کے سامنے کشمیر کا مسلہ رکھیں گے۔ اور انھوں نے عمدہ طریقے سے اپنا مدعا بیان کیا۔ سلامتی کونسل سے درخواست کی کہ کشمیر کا مسلہ حل کرایا جائے۔ کیا ساری دنیا کو نہیں علم کہ کیا ہو رہا ہے؟ وہاں بجائے مسلہ سامنے رکھنے کے سیدھی طرح بانگ دہل کہتے کہ وہ یہاں مسلہ کشمیر حل کرانے آئے ہیں۔ آج ساری دنیا اکٹھی ہے۔ آج ہی یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ کشمیر کو انڈیا اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت کب آزاد کرے گا؟ انڈیا پر دباؤ ڈلوایا جائے۔ ساری دنیا کی اقوام اکٹھی ہوں گی جن کی اکثریت ظلم و ستم سے گزر کر آئی ہے۔ انہیں آزادی کے مفہوم کا علم ہے۔ اسلیے اکثریت پاکستان کا ساتھ دے گی۔ بے شک روس اور امریکہ ویٹو ضرور کریں گے کیونکہ امریکہ تو وہ منحوس ملک ہے جو عالمی یوم امن پر بھی دنیا میں امن نہیں دیکھنا چاہتا کہ اس طرح اس کی دکان بند ہوتی ہے۔ دو ملکوں کو لڑا کر دونوں کو اپنا اسلحہ بیچتا ہے۔ بے شک ویٹو

ہو، لیکن جب دنیا کے نوے فیصد ممالک اکٹھے ہو جائیں تو وہ روس اور امریکہ پر بھی دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ اڑسٹھ سالہ اس پرانے مسئلے کو فوراً حل کیا جائے۔

پاکستان کے اندر کچھ نام نہاد ہندوستان کے چمچے منہ پھاڑ کر کہتے پھر رہے ہیں کہ کشمیر میں پاکستان کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ یہ تم اپنے دماغ سے سوچ رہے ہو یا تمھارے پیچھے بھی انڈیا کا ہی دماغ کام کر رہا ہے۔ وہ جو کچھ دنیا کو بتانا چاہتا ہے تم وہی کچھ کہہ رہے ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان صرف اخلاقی اور سیاسی مدد کر رہا ہے۔ بے شک کشمیر نے ان شاء اللہ پاکستان کا ہی حصہ بننا ہے۔ لیکن پھر بھی کشمیر کے جنگی معاملات میں ہر گز مداخلت نہیں کر رہا۔ تم چاہتے ہو کہ کشمیر کا مسئلہ امن سے، بات چیت سے حل ہو۔ تم بتاؤ کہ اگر امن سے، بات چیت سے حل ہونا ہوتا تو ۱۹۹۰ تک جو پاک بھارت مذاکرات کشمیر کے مسئلہ پر ہوتے رہے، اس کا کوئی حل کیوں نہیں نکلا۔ جب یاسر عرفات نے اسلحہ چھوڑ کر فلسطین کے حل کے لیے بات چیت کا راستہ اختیار کیا لیکن آج تک فلسطین کا مسئلہ حل نہ ہوا۔ کیوں؟ دنیا کیوں اس کشمیر کے مسئلہ کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ اور جب کشمیر کے غیور عوام نے دیکھا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکل رہا ہے تو انہیں انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑیں۔ انہیں اسلحہ اٹھانا پڑا۔ بھارتی فوجیوں کا اسلحہ

ہی چھین کر ان ہی کے خلاف استعمال کیا۔ تب سے آج چھبیس سال ہو گئے ہیں ہزاروں کشمیری شہید کر دیے گئے، اور ہو رہے ہیں۔ پچھتّر دنوں سے کرفیو نافذ ہے، امن کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور تم لوگ کہتے ہو کہ بات چیت سے حل نکالیں۔ ارے بد بختو، جب بھارت خود نہیں چاہتا کہ گفت و شنید سے یہ حل نکلے تو تم تیسری جگہ کیوں اپنی ٹانگ اڑاتے ہو۔ ان شاء اللہ کشمیر نے تو آزاد ہونا ہے، لیکن اس وقت تمھارا کیا ہو گا، جب ان کو علم ہو گا کہ یہ رہے دانشوران جو کشمیر کا یہ حل اس وقت چاہتے تھے جب بھارت خود اپنے آپ کو چکی میں پسوا رہا تھا۔

ہندوستان والو سن لو، تم لاکھ اپنی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر جمع کر لو۔ تم اپنے اوپر جنگی جنون طاری کر لو۔ تم اس پاکستان کو للکار رہے ہو جس کے باسی آج بھی اسی نبی صلی اللہ علیہ کے امتی ہیں جنھوں نے اپنے ۳۱۳ جانثاران کے ساتھ اپنے سے تین گنا زیادہ طاقتور فوج کو شکست دی تھی۔ جب کہ ان کے پاس اسلحہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ پاکستانی قوم حضرت خالد بن ولیدؓ کے سپاہی ہیں، حضرت عبیدہ بن الجراحؓ کے سپاہی ہیں۔ طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، محمد بن قاسم کے پیروکار ہیں۔ ان سے پنگا مت لینا۔ آج کے پاکستان کے پاس اللہ کے حکم کے مطابق سب کچھ تیار ہے۔ اللہ کا نام بھی دلوں میں ہے اور اسلحہ بھی۔ جو اللہ کا نام لے کر ایک بار اٹھ گئے تو پھر غزوۂ ہند کو ہونے سے کوئی نہیں

روک پائے گا۔ اور حدیث کے مفہوم کے مطابق بھارت کو فتح کر کے ہی دم لیا جائے گا۔
اب بھی وقت ہے واپس اپنی بیرکوں میں لوٹ جاؤ، تمھارے بزدل سپہ سالار تمھیں
قربانی کا بکرا بنا رہے ہیں۔ جو کہ ہم پر حرام ہے۔ اور حرام چیزوں کو تو ہم ویسے بھی بہت
شوقین ہیں، اور جب وہ دشمن ہوں تو پھر تو۔۔